رفاقتیں کیسی



تھوڑی دیر پہلے مطلع بالکل صاف تھا۔ سورج چنار کے اُونچے اُونچے درختوں کی اوٹ سے کسی نٹ کھٹ حسینہ کی طرح جھانک لیتا تھا۔ دم توڑتی سہ پہر کے چہرے پر تابانی آجاتی تھی۔ اور وادی کے نشیبی علاقے میں پھیلتا جھٹپٹا منور ہوجاتا تھا۔ پہاڑی سلسلوں پر پھیلی آنکھ مچولی کھیلتی دھوپ کبھی دامن پھیلالیتی تھی کبھی سمیٹ لیتی تھی۔ بارش کے آثار بالکل نہیں تھے۔ لیکن اب دور پھیلی ڈھلانوں پر استادہ درختوں کے کسی کسی سرے سے دھوئیں سا آہ نارسا کی طرح اٹھ رہا تھا۔ اور افق کے سرے کہیں کہیں سے گدلائے ہوئے لگ رہے تھے۔

اور یوں موسم خوشگوار اور حسین ہوگیا تھا۔

میدانی علاقوں سے تفریح کے لئے آئے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر بازار کا رُخ کر رہے تھے۔ بے فکرے لوگ بھی تھے۔ اور اپنے اصلی چہروں کو تصنع کے نقاب میں چھپائے ہوئے لوگ بھی۔ رنگ برنگے لباس۔ فیشن۔ میک اپ۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لوگ ہوٹلوں کوٹھیوں بنگلوں اور فلیٹوں سے نکل کر کسی فیشن پریڈ میں شرکت کے لئے جارہے ہیں۔ بچے، بوڑھے، جوان عورتیں مرد سبھی جیسے جلوس کی تابانی بڑھانے کی تمنا لئے ہوئے تھے۔ تصنع اور بناوٹ کے لبادے پھیلے ہوئے تھے۔ ہر کوئی وہ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا، جو وہ نہیں تھا۔ برتری جتلانے کا احساس اور دوسرے سے سبقت لے جانے کی تمنا ہر چہرے پر تھی۔ یہ تمنا ہر حرکت ہر نظر اور ہر ادا سے اظہار کی راہ پا رہی تھی۔

دکانیں خوب سجی تھیں۔ خریداری کی ریل پیل شروع تھی۔ کچھ لوگ واقعی چیزیں خریدنے آئے تھے۔ کچھ یونہی وقت گذاری کے لئے دکانوں میں گھس آئے تھے۔ چیزیں دیکھ رہے الٹ پلٹ رہے تھے۔ بھاؤ پوچھ رہے تھے۔ اور پھر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے نہ خرید سکنے کی حس کو چھپا رہے تھے۔

ہوٹلوں میں بھی خوب رونق تھی۔ پہاڑ کی دلفریب اور بھیگی بھیگی فضا میں موسیقی کا دلنواز ترنم گھل رہا تھا۔ باوردی بیرے چاق و چوبند تھے سیٹیں پر ہو رہی تھیں۔ چائے۔ آئس کریم۔ کافی کوکو آنے والوں کی فرمائش پر ہر چیز مہیا کی جا رہی تھی۔

سرگوشیوں کے انداز میں باتیں ہو رہی تھیں۔ یہ خوشگوار آوازیں موسیقی کے گداز میں گھل کر فضا کو مسحور کن بنا رہی تھیں۔

جوں جوں سورج کی روشنی ماند پڑ رہی تھی۔ اور درختوں کی آخری پھنگوں میں پھنسا ہوا دھواں پھیل رہا تھا۔ بازار کی رونق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دکانوں اور ہوٹلوں میں مرکری ٹیوبیں جلنے لگیں تھیں۔ لہراتے آنچل۔ رنگین لباس اور سجے سجائے چہروں سے مال کی سج دھج میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ضیا دوپہر کا کھانا کھاتے ہی بستر میں گھس گیا تھا۔ طبیعت پژمردہ تھی۔ سونے کی کوشش کی تھی۔ لیکن نیند نہ آتی تھی۔ کسی کتاب کسی رسالے اور کسی اخبار کو چھونے تک کو جی نہ چاہا تھا۔ عجیب سی بے کلی محسوس ہو رہی تھی۔

اسکی وجہ سوائے تنہائی کے اور کچھ نہ تھی۔

اس جان لیوا تنہائی کو گلے لگائے یہ پانچواں دن تھا۔ اسے اپنے آپ پر بے انتہا غصہ آ رہا تھا۔ جو مروت میں مارا گیا۔ اور اس پرانی طرز کے ٹین کی چھتوں اور لکڑی کے شیشوں والے برآمدوں سے گھرے بڑے سے گھر میں اکیلا رہنے کی حامی بھر لی تھی۔

رمضو بابا بھی بے شک یہیں تھا۔ لیکن وہ خود تنہائی ہی کا ایک مغلوب کر دینے والا حصہ تھا

اس کا ہونا یا نہ ہونا ضیا کے لئے برابر ہی تھا۔

مشین نما رمضو بابا بولتا چالتا بہت کم تھا۔ ہاں ہر کام وقت پر بڑی مستعدی سے کر دیتا تھا۔ احساس فرض کے معاملے میں شدت پسند تھا۔ صبح باقاعدگی سے بیڈ ٹی بناتا۔ اور ضیا کا موڈ اٹھنے کا ہوتا یا نہیں۔ وہ چائے ضرور لاتا۔ محبت سے اُسے جگاتا اور بیدار ہونے پر پاس بیٹھ کر چائے پلاتا شیو کے لئے پانی گرم دیتا۔ نہانے کے لئے غسلخانے میں بالٹی بھر کر گرم پانی رکھ دیتا۔ ناشتے کے ساتھ اخبار دینا نہ بھولتا۔ دوپہر کا کھانا اہتمام سے پکاتا۔ شام چائے اور رات کا کھانا ضیا نہ بنانے کو کہہ دیتا۔ تو وہ بھی وہ ضرور بناتا۔

شام کی چائے اور رات کا کھانا ضیا اکثر باہر ہی کھاتا۔ لیکن رمضو بابا کی اپنی ہی منطق تھی۔ کچھ نہ کچھ ضرور بنا کر رکھا ہوتا۔

ضیا کہتا بھی تو وہ سر جھکا کر جواب دیتا" صاحب جی کہہ گئے تھے۔ کہ آپ کا ہر طرح سے خیال رکھوں،، ضیا کبھی تو ہنس دیتا اور کبھی جھنجھلا جاتا۔

دو تین دن تو ضیا نے رمضو بابا سے باتیں کرنے کی کوشش کی۔ بنگلے پر چھائی ہیبت ناک سی خاموشی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس خاموش مشین سے اب وہ اکتا گیا تھا۔

پہاڑی سلسلوں میں بھی خوب گھوما پھرا تھا۔ ہوٹلوں میں بھی شام کے اداس لمحوں کو دھکیلا تھا۔ مال پر بھی گھنٹوں چہل قدمی کی تھی۔ دکانوں میں بھی گھسا رہا تھا۔ کچھ انٹ شنٹ غیر ضروری چیزیں بھی مجبوراً خرید لی تھیں۔ خاموش قدرتی مناظر کو عکس بند بھی کر کے وقت کو دھکا دیا تھا۔ لیکن

اب وہ ان پانچ دنوں میں بے طرح اکتا چکا تھا۔ اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ اسے سعید سے معذرت کر دینا چاہیے تھی۔ اُسے بھی واپس چلے جانا چاہیے تھا۔ کوئی اسے یہاں رہنے پر جبراً تو نہیں کہہ سکتا تھا۔

تو وہ کیوں واپس نہ چلا گیا ؟

ضیا نے بستر میں لیٹے لیٹے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

جواباً اسکے لب متبسم ہو گئے۔ آنکھوں میں خوبصورت سی روشنی لہر بن کر پھیل گئی اور اس نے کروٹ کے بل ہوتے ہوئے سامنے میز پہ پڑی تصویر پر نظریں جما دیں۔

کئی لمحے وہ پلک جھپکے بنا اس تصویر کو دیکھتا رہا۔

پھر بستر میں اٹھ بیٹھا۔ سرہانے رکھی سگریٹ کی ڈبیہ اٹھائی سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔ اور لائٹر تکیے تلے تلاش کرنے لگا۔

لائیٹر کھسک کر بستر میں آ گیا تھا۔ ضیا نے تکیے تلے ہاتھ مارا۔ پھر تکیہ اٹھا کر دیکھا۔ لائیٹر نہ ملا۔ تو تکیہ میز پہ پھینک دیا۔ کمبل پرے ہٹایا۔ لائیٹر مل گیا۔ تو اطمینان سے سگریٹ سلگا لیا۔

لمبے لمبے کش لیتے ہوئے وہ پھر تصویر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دھوئیں کے مرغولوں میں تصویر آڑے ترچھے زاویوں پہ پھیل رہی تھی۔

اور وہ متبسم لبوں نیم وا آنکھوں سے ہر زاویے کا جائزہ لے رہا تھا۔

یہ تصویر آصفہ کی تھی۔

سعید کی چھوٹی بہن آصفہ کی۔

کئی لمحے گذر گئے۔ کتنی ہی گھڑیاں بیت گئیں۔

ضیا پلنگ پر بیٹھا سگریٹ مزے مزے سے پیتا تصویر کو دیکھتے ہوئے خوشگوار سی سوچوں میں الجھا رہا۔

سگریٹ کے آخری سرے پہ ایک لمبا سا کش لے کر اس نے سگریٹ ایش ٹرے کی بجائے دور دیوار کے ساتھ پھینک دیا۔ جہاں قالین ختم ہوتا ہے۔ اُسے سلگ سلگ کر بجھتے ہوئے سگریٹوں کے آخری ٹکڑے بہت بھلے لگتے تھے۔ اس لئے اس نے ایش ٹرے میں کچل مسل کر کبھی سگریٹ نہیں بجھایا تھا۔ نہ ہی پاؤں تلے روند کر جلنے والی آگ کو ختم کیا تھا۔

جو چیز خود ہی سلگ سلگ کر ختم ہو جائے اس پہ ظلم کرنے کی کیا ضرورت،، وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

اس کی اس عادت سے اس کی امی خاصی نالاں تھیں۔ آگ لگنے کا خدشہ ہمیشہ رہتا تھا۔ وہ ایک بار اس کی یہ عادت رنگ بھی لائی تھی۔ ایک دفعہ دری کا کونا آگ پکڑ گیا تھا۔ اور دوسری دفعہ جنتے کے پوتے کا پاؤں جل گیا تھا۔

لیکن سرزنش کے باوجود اس نے اپنی یہ عادت ترک نہ کی تھی۔

نیا سگریٹ سلگانے کی ضرورت محسوس تو کر رہا تھا لیکن اس وقت اس نے سلگایا نہیں شاید اس نشے سے بھی کہیں زیادہ تند کوئی اور نشہ تھا۔ جو اس کے حواس پہ مسلط ہو رہا تھا۔

وہ آہستگی سے اٹھا۔ اور برابر والے پلنگ کے اُوپر سے ہو کر اس میز تک جا پہنچا جہاں تصویر پڑی تھی۔

اس نے تصویر ہاتھوں میں پکڑ لی۔ اور کھڑکی کی طرف آ گیا۔

باہر حدِ نگاہ تک اونچائیوں اور گہرائیوں میں سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ شاداں بشاشہ کھڑے سرسبز درخت تھے۔ ڈوبتے سورج کا لال لال گولا بھی نظر آ رہا تھا۔ خون آشام سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان کے کناروں پر پھیلنے والی سیاہی خون ملی مٹی کی طرح گدلی گدلی نظر آ رہی تھی۔ اونچے اونچے درختوں کی سمت پرندوں کی اڑان تھی۔

اور

ہوائیں قدرے تند ہو گئی تھیں۔

باہر کا ایک ناقدانہ جائزہ لینے کے بعد اس نے اپنی نظریں تصویر پہ جما دیں۔

اور پھر بڑبڑایا ،،محض تمہاری وجہ سے میں یہاں رک گیا۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ قید تنہائی اس قدر گراں گزرے گی۔ تو یقیناً کبھی نہ رکتا۔ اب تو حالت اس گورکن کی سی ہے۔ جو ویرانی کو گلے لگا کر موت کے پر ہول سناٹوں میں اپنی خوشیاں کھو جاتا ہے۔ ہر مردے کے ساتھ دفن ہوتا ہے اور پھر دوسرے کے لئے جی اٹھتا ہے۔ ہوں، اس نے تصویر کھڑکی ہی میں رکھ دی اور دونوں کہنیوں پہ تھوڑی رکھ کر کھڑکی میں کچھ جھکتے ہوئے دور خلاؤں میں گھورنے لگا۔

ہفتہ بھر پہلے وہ سعید کی پر زور دعوت پہ پہاڑ پر آیا تھا۔ سعید اس کا بہت ہی پر خلوص اور انتہائی پیارا دوست تھا۔ اس دوستی کو مالی لحاظ سے تو کوئی نسبت نہ تھی، سعید ایک امیر و کبیر خاندان کا فرد تھا۔ بہت بڑی جائیداد کے علاوہ لاکھوں کا بزنس بھی تھا۔ اور اب پپا کے ساتھ وہ بھی اس بزنس کا پارٹنر تھا۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام تھا۔ لیکن ضیا متوسط طبقے کے ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جو ماضی کی خوش کن یادوں پر نہیں جیتا اور نہ ہی مستقبل کے فریب کا سہارا لیتا ہے۔ جو حال کے لمحوں میں جیتا ہے۔ اور ہر لمحے کو اپنی کوشش اور جدوجہد سے گرفت میں لیتا ہے۔

پھر بھی دوستی کا یہ بندھن بڑا گہرا اور مضبوط تھا۔ یہ بندھن دور کہیں ماضی کے بھولے بسرے ایام سے نکلا تھا۔ سعید کو اچھی طرح یاد تھا نہ ضیا کو۔ کہ کب وہ پہلی بار ملے تھے۔ سعید ہمیشہ سے کراچی میں رہتا چلا آیا تھا۔ اور ضیا لاہور۔ سعید اپنے کسی عزیز کے پاس برسوں پہلے لاہور آیا تھا شاید جب سے دوستی کے تاروں نے جکڑ لیا تھا۔ پھر وہ کئی بار لاہور آیا۔ اور یہ ناطہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ اب تو بندھن ٹھوس چٹانوں کی طرح تھا۔

مضبوط

اور

مستحکم

معاشرتی حد بندیوں سے بیگانہ۔

سعید اور ضیا کے خاندانوں میں بھی اسی بندھن کی وجہ سے کچھ کچھ راہ و رسم ہو چکی تھی۔ سعید جب بھی لاہور آتا۔ ضیا کا گھر اس کا اپنا گھر ہوتا۔ سعید کے مما پپا بڑے بھیا۔ فوزیہ باجی۔ دولہا بھائی اور آصفہ سبھی ضیا کے گھر آ چکے تھے۔ اتنی بے تکلفی سے آئے۔ کہ اپنوں کا گمان ہوا۔

ضیا کبھی کراچی تو نہ جا سکا۔ ہاں جب یہ مسرور سا کنبہ چند ایام اپنے پہاڑی مکانوں میں گزارنے کے لئے آتا۔ تو ضیا کو بڑے اصرار سے بلایا جاتا۔ دعوت تو ضیا کی امی اور اس کی بہن شانی

کو بھی محبت سے دی جاتی۔ لیکن اب تک صرف ضیا ہی اس دعوت پہ آیا تھا۔ اس کی امی ایک وضع دار خاتون تھیں۔ معاشرتی حد بندیاں مسائل نہ سہی اپنی جگہ وجود تو رکھتی تھیں۔ اسی لئے ایک حد مقرر کر رکھی تھی۔ اس سے آگے وہ کبھی نہ بڑھتیں۔

اس دفعہ شانی نے اصرار کیا تھا۔ بلکہ ضد بھی کی تھی لیکن انہوں نے بڑی ملائمت سے بیٹی کو اونچ نیچ سمجھائی تھی۔ زندگی نے ہر گام پر انہیں ایک تجربہ دیا تھا، ایک سبق سکھایا تھا، وہ بہت محتاط تھیں اپنے مالی حالات اور معاشرتی درجے سے آگاہی مانع تھی۔

ضیا نے بھی دو ایک بار شانی کو ساتھ لے جانے کے لئے کہا تھا۔ تو وہ مسکرا کر بولی تھیں۔ میں تو تمہارے بھی اب وہاں جانے کے حق میں نہیں ہوں۔

ضیا بڑا ذہین نوجوان تھا۔ ماں کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ لیکن پھر بھی بہلا پھسلا کر چلا آیا تھا۔ اسے اپنے آپ سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ نہ ہی کسی وار کے زد میں آنے کا ڈر تین سال پہلے بھی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ پندرہ دن سوات اور کالام کا چکر لگا کے آیا تھا۔ اب کوئی خاص بات تو نہ تھی۔ وہی لوگ تھے۔ اور وہی اس کا اپنا آپ!

لیکن

وہ سوچتے ہوئے مسکرانے لگا۔ اس کی جہاندیدہ نظریں واقعی بہت کچھ دیکھ سکتی ہیں۔ آنے والے لمحوں کا حال جان سکتی ہیں۔

لوگ وہی تھے۔ ضیا خود بھی وہی تھا۔ لیکن اب بہت بڑا تغیر آ چکا تھا۔

تین سال پہلے بھی آصفہ بچی تو نہ تھی۔ پندرہ سولہ سالہ لڑکی تھی۔ وہ خود بھی ایم اے پریولیس میں تھا۔ لیکن سارا سارا دن قریب رہنے لڈو اور کیرم کھیلے۔ اکٹھے نشیب و فراز کے فاصلے ماپنے حتیٰ کہ کھیلنے کھانے پینے کی چیزوں میں چھینا جھپٹی کرنے پر بھی کبھی کوئی لطیف احساس بیدار نہ ہوا تھا۔ وہ آصفہ کو ہمیشہ منی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اور اس کا انداز بھی بزرگوں کا سا ہوتا تھا۔

لیکن

اُب

آصفہ کو دیکھتے ہی کتنے حسین سے نرم نرم لطیف لطیف احساسات بیدار ہوگئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں گھلنے والے سارے رنگ نشہ بن کر اس کی اپنی آنکھوں میں اتر آئے تھے، وہ اب اس سے بے تکلف نہیں ہوئی تھی۔ بہت محتاط ہوگئی تھی۔ جھکنے لگی تھی۔ بات بات پہ کانوں تک سرخ ہونے لگی تھی۔ یہی ادائیں ضیاء کے دل پر نقش ہونے لگیں تھیں۔ اسے یہ سب کچھ اچھا لگنے لگا تھا۔ آصفہ کی قربت میں سرور آنے لگا تھا۔ اس سے تنہائی میں باتیں کرنے کی امنگ بیدار ہوگئی ہوگئی تھی۔ اسے خوابوں میں سجانے میں لطف آنے لگا تھا۔ بادامی سی لڑکی اسے بے طرح اچھی لگنے لگی تھی۔

تو کیا؟

کیا؟

وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔؟

یہ سوال ایک ابال کی طرح اس کے ذہن میں تھا۔

"نہیں نہیں"۔ اس نے سر کو دو تین بار نفی کے انداز میں جھٹکا۔ "یہ محبت نہیں اسے محبت نہیں کہتے۔ یہ یکجائی کا نتیجہ ہے۔ یہ ہم دونوں کے جواں ہونے کا ثبوت ہے اور بس۔ ویسے بھی۔ ویسے بھی۔ میں یہ محبت نہیں کرسکتا۔

اس نے خود ہی کہا۔ اور اپنی حماقت پر خود ہی مسکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں امی کا پیکر تھا۔

امی۔ جو سارہ کو اس سے ایک مدت سے منسوب کئے ہوئے تھیں۔

وہ گھبرا کر کھڑکی سے ہٹا۔

تصویر اپنی جگہ پر رکھی۔

اور باہر جانے کا ارادہ کرلیا۔

وہ الماری کے قریب آیا۔ ہینگروں میں لٹکے کپڑوں میں سے پتلون شرٹ اور سویٹر کا انتخاب کیا کپڑے پلنگ پر پھیلا کر وہ غسلخانے میں گھس گیا۔

تیار ہوتے ہوئے اس نے کل واپس چلے جانے کا پکا ارادہ کرلیا۔" پیشتر اس کے کہ انسان ڈوب ہی جائے۔ ہاتھ پاؤں مار کر کنارے تک پہنچنا سب سے بڑی عقلمندی ہے"۔ بڑے سے لمبوترے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے سوچا۔

سعید اور اس کے خاندان والے اب دو ایک دن میں واپس آنے ہی والے تھے۔ پھر گھر کی حفاظت کے لئے رمضو بابا بھی تو موجود تھا۔

تیار ہو کر وہ باورچی خانے کی طرف آیا۔ رمضو بابا رات کے کھانے کے لئے لہسن پیاز چھیل رہا تھا۔

"رمضو بابا"

"جی صاحب"

"میں باہر جا رہا ہوں"

"اچھا صاحب"

"رات کا کھانا نہیں بنانا"

اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دے کر بلند آواز سے رمضو بابا کے کان کے قریب ہو کر کہا۔

"میٹھا بنا دوں گا صاحب۔ اور گوشت تو چڑھا بھی دیا ہے" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"خواہ مخواہ ضائع کروگے"

"سعید صاحب کا حکم ہے سرکار"

"کیا؟"

"آپ کے لئے اچھا اچھا کھانا بنایا کروں"

"چاہے میں کھاؤں یا نہ" "جی صاحب"

"اوہ خدایا۔ ہاں تو سنو رمضو بابا۔ میں کل واپس جا رہا ہوں"

"کہاں صاحب"

"اپنے گھر"

"کیوں"

"بس اکیلے رہتے رہتے عاجز آگیا ہوں"

"دو دن بعد سب آجائیں گے صاحب"

"لیکن اب یہ دو دن میری برداشت سے باہر ہیں۔"

"نہیں صاحب جی۔ آپ نہیں جا سکتے۔ سارے گھر کی ذمہ داری وہ آپ کے اُوپر ڈال گئے ہیں، مجھ سے نہ سنبھالا جائے گا صاحب۔ کوئی چیز اِدھر اُدھر ہوگئی۔ تو اپنے میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ بھر کر دے سکوں۔ وہ آجائیں تو چلے جایئے گا۔"

"ضیا نے بہت سمجھایا۔ لیکن رمضو نہیں مانا۔

قہر درویش بر جان درویش۔ ضیا الجھتا ہوا بنگلے کے پچھلی طرف سے اُوپر جانے والی پگڈنڈی پر ہولیا۔

سعید کے خالو کا حیدرآباد میں ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ سب کو اچانک جانا پڑا تھا۔ خالو بچ گئے تھے۔ فون آگیا تھا۔ لیکن جانے آنے میں پورے سات دن تو لگنا ہی تھے۔

ضیا، الجھتا ہوا اُوپر جانے لگا۔

"امی۔ امی۔"

"کیا ہے شافی۔"

"امی خط آیا ہے"

"کس کا"

"حیرانی کی بات ہے امی۔ پریشانی کی بات ہے۔ یقین ہی نہیں آرہا"

"اے ہے کیا ہوا۔ کس کا خط ہے بتائے گی بھی۔ دانت نکال رہی ہے اور۔"

"ناصر ہمارے ماموں ہی کا نام ہے نا امی"

"ہاں۔ کیا تجھے پتہ نہیں"

"کراچی میں رہتے ہیں نا"

"ہاں ہاں کیا بات ہے۔ ادھر لا خط۔"

"امی بڑے ماموں ناصر کا کراچی سے خط آیا ہے، ہے نہ حیرانی پریشانی کی بات۔"

"لا ادھر"

"بڑا مزیدار خط ہے امی"

"دکھا تو"

"ہائے امی یقین ہی نہیں آرہا۔ کہ ماموں کا خط ہے۔ اتنا پیارا۔ اتنا اچھا۔"

"باتیں بنائے جائے گی۔ خط دے مجھے۔"

"بیٹھی رہیے امی۔ دیتی ہوں۔"

رابعہ بیگم کے تخت سے اٹھنے سے پہلے ہی شانی ان کے قریب آبیٹھی خط انھیں تھماتے ہوئے ان کی گردن میں باہنیں ڈال کر بولی "ماموں کو کیسے خیال آگیا ہمارا۔"

رابعہ بیگم نے جواب دیئے بغیر اس کی باہنیں گلے سے نکالیں اور بے صبری سے خط پڑھنے لگیں۔ شانی ٹانگیں اوپر کھینچ کر امی کے برابر ہو بیٹھی اور لگن میں پڑے چاول چننے لگی۔

رابعہ بیگم خط پڑھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔

"ماموں کو کیا خیال آگیا امی" شانی نے پوچھا۔

"آخر تو بھائی ہے نا" وہ اترائیں۔

"بھائی تو مدتوں پہلے بھی تھے"

"چل چپ رہ تو۔ خاندانوں میں ایسی باتیں ہو ہی جاتی ہیں۔"

"لیکن یہ آپوں آپ ان کی محبت جاگ کیونکر اٹھی۔"

"آپوں آپ۔" رابعہ بیگم کچھ سوچتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"ہوں"

"کچھ نہیں"

"بتائیں نا امی"

"تجھے کیا بتاؤں۔ اس کا دل چاہا خط لکھ دیا۔"

"بلا بھی بھیجا۔"

"ہاں"

"جائیں گی آپ"

"کیوں نہ جاؤں گی،"

"ہائے اللہ۔ ایک ہی خط آیا۔ اور آپ چل بھی دیں گی۔"

"تو اور دس خط آنے پر جاؤں۔ میری اس کی بات ہے۔ تمہیں کیا۔"

"آپ تو کہا کرتی تھیں۔ اب عمر بھر اس کی شکل نہ دیکھوں گی۔ مر بھی گئی تو میرا منہ اسے نہ دکھانا۔"

شانی منہ بنا بنا کر امی ہی کے انداز میں کہنے لگی۔

رابعہ بیگم نے محبت سے بیٹی کے گال کو ہاتھ سے چھوا اور مسکراتے ہوئے بولیں "بہنیں موم ہوتی ہیں شانو۔ تجھے بھی تو ضیا سے اتنی ہی محبت ہے۔"

"ہائے اللہ مجھے تو اپنے چاند بھیا سے جتنی محبت ہے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔" شانو نے فرطِ جذبات سے ہاتھ سختی سے الجھا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"میرا بھی ناصر چاند بھیا ہی ہے۔" رابعہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ "اب تو اسے دیکھے برسوں ہوگئے"

شانی انگلیوں پہ گننے لگی، اور پھر بولی۔ "پورے نو سال ہوگئے۔ جب ماموں یہاں آئے تھے۔"

"تجھے کیا یاد ہوگا" رابعہ بیگم ماضی میں کھو کر بولیں۔

"لیں۔ یاد کیوں نہیں۔ میں دس سال کی تھی۔ مجھے تو شاہدہ ممانی بھی اچھی طرح یاد ہیں۔" شانو بولی" سارہ کا بھی پورا پورا حلیہ ذہن میں ہے۔

"اب تو ماشاءاللہ وہ بھی جوان ہوگی۔" رابعہ بیگم نے بڑے پیار سے کہا۔

"امی" شانو نے چند لمحے غور سے ماں کا چہرہ دیکھنے کے بعد زیر لب مسکرائے ہوئے کہا

"ہوں" رابعہ بیگم خط احتیاط سے تہہ کر کے لفافے میں رکھتے ہوئے بولیں

"اب نئے سرے سے کہیں۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا؟" رابعہ بیگم سب کچھ سمجھتے ہوئے بولیں۔

"کچھ نہیں۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"میں جان گئی تو کیا کہنے والی تھی۔ رابعہ بیگم بولیں۔ اور پھر شانو کے کچھ نہ کہنے پر بولیں۔

ساره کا رشتہ اللہ بخشے میری اماں نے کیا تھا۔ ناصر کو یہ رشتہ نبھانا ہی ہوگا۔"

" پھر وہی بات امی۔ بھائی جان کو پھر غصہ آئے گا۔"

" بڑا رہ گیا۔ غصہ کیوں آئے گا۔ میری تو دلی خواہش ہے۔ اور پھر اپنوں سے بڑھ کر کون اچھا۔"

اسی رشتے کی وجہ سے آپ بہن بھائی چھوٹ گئے تھے۔ اب پھر نئے سرے سے دبی بات چھیڑنے کی کیا ضرورت ہے امی۔ اور میری پوچھیں تو۔ بھائی جان کا رشتہ۔"

شانی مسکراتے ہوئے چپ ہوگئی۔

" تیری کسی سہیلی سے کر دوں" رابعہ بیگم نے اس کی بات پوری کی۔

" ضروری نہیں سہیلی سے ہی۔"

" تو پھر"

" سعید بھائی جان کی بہن آصفہ سے بھی تو ہو سکتا ہے۔ امی۔ کتنی پیاری سی لڑکی ہے آصفہ۔

" شانی۔"

" کیوں! امی۔"

" پھر یہ بات منہ سے نہ نکالنا۔"

" کیوں"

" وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ اُب خلوص سے ملتے ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہم اتنی بڑی بات منہ سے نکال بیٹھیں۔"

" ماموں بھی تو اب بہت امیر کبیر ہیں" شانی بولی "رحمان چچا بتا رہے تھے نا کہ جب سے نئی شادی کی ہے۔ بہت بڑے آدمی بن گئے ہیں۔"

" اللہ دینے والا ہے۔ نئی بیوی کا کیا ہے۔ وہ تو سنا ہے۔ کسی غریب سے خاندان کی ہے

" اس کی قسمت تیز ہوگی نا۔ وحید بھائی بھی یہی بات کہتے تھے۔ جب وہ کراچی سے آئے تھے۔ ماموں تو اب بہت بڑے سیٹھ ہیں امی۔"

" خوشی کی بات ہی ہے نا۔"

تو پھر ان کی بیٹی کا نام اب کیوں لیتی ہیں۔ ایسی صورت میں جب کہ سختی سے انکار بھی ہو چکا ہے۔"

" وہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ ان دونوں بچے چھوٹے تھے۔ اب ماشاء اللہ جوان ہو گئے ہیں۔"

" ہوں"

" اور ضیا جیسا ذہین اور نیک بچہ ناصر کو اور کہاں سے ملے گا۔"

" لائق بھی اور چاند جیسا بھی۔"

" تو کیا یہ سب غلط ہے۔"

" میں کب کہہ رہی ہوں۔ میرا تو دل چاہتا ہے۔ اپنے چاند بھیا کے لئے ایسی دلہن لاؤں جو چندے آفتاب چندے مہتاب ہو۔ پڑھی لکھی ہو۔ فیشن ایبل ہو۔ اور۔ اور۔"

" بس بس" رابعہ بیگم مسکرائیں "یہ ساری باتیں تجھے سارہ کے علاوہ کہیں نہ ملیں گی۔"

" اگر ماموں نے سارہ آپ کو دے دی جب نا۔"

" دیکھو جی۔ جو اللہ کو منظور ہوا۔" رابعہ بیگم نے نگاہ آسمان کی طرف کی "کراچی جا کر ہی پتہ چلے گا۔"

" تو پھر آپ ضرور جائیں گی۔"

" کیوں نہیں۔ اب تو ضرور ہی جاؤں گی۔"

" کب"

" ضیا پہاڑ سے واپس آجائے تو۔"

"میں خط لکھوں جلدی سے آجائیں۔"

"تو گویا دل تیرا ابھی چاہتا ہے۔ کہ میں کراچی جاؤں۔ ہیں نا۔"

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بھائی جان کے رشتے کی بات ہے نا امی۔ میرا بس چلے تو ابھی رشتہ طے اور ابھی شادی شروع۔"

"رشتہ طے ہو جائے تو شادی بھی ہو ہی جائے گی۔" رابعہ بیگم بولیں "پہلے اس کی نوکری کا بندوبست تو ہو لے۔"

ہو ہی جائے گا۔ ویٹنگ لسٹ پہ تو ہیں۔ اچھی پوزیشن لے کر مقابلے کا امتحان پاس کیا ہے مذاق تھوڑا ہی ہے۔"

"ہاں ہاں۔ اللہ خیر کرے۔" رابعہ بیگم نے چاولوں والا تھال اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور پھر صحن پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولیں "آج فضل بی بی نے ابھی تک صفائی ہی نہیں کی۔ دوپہر ہونے کو آئی۔"

مجھے چھٹیاں ہیں نا۔ ایسی چالاکی کر ہی جاتی ہے مردار۔ سمجھتی ہے میں ہی کر لوں گی۔"

"ہرج بھی نہیں۔ اٹھو ذرا صحن میں پانی ہی ڈال دو۔ بڑی تپش محسوس ہو رہی ہے۔"

پہاڑ پہ چل دیتیں تو اچھا ہی تھا نا۔ یہاں کس قدر گرمی ہے۔ اُف اللہ رات کو کتنا حبس تھا۔ اور وہاں لوگ کمروں میں لحاف تان کر سو رہے ہوں گے۔"

بارشیں شروع ہو گئیں۔ تو یہاں بھی موسم کچھ بدل ہی جائے گا۔" رابعہ بیگم نے چاول چنتے ہوئے کہا۔

شانی کچھ دیر امی کے پاس بیٹھی رہی۔ پھر کر ماموں کے خط پہ ہی تبصرہ کرتی رہی۔ سارہ سے اُسے کچھ عناد تھا نا آصفہ سے واسطہ۔ اُسے تو چاند بھیا کی دلہن چاہیے تھی۔

دلہن۔ جو اس کے تصوراتی خاکے پر پوری پوری اترتی ہو۔

ایکدم حسین

بے حد ذہین

حد درجہ سگھڑ

اور

انتہائی فیشن ایبل۔

اٹھارہ انیس سالہ شانی اکلوتی اور چھوٹی ہونے کی وجہ سے خاصی لاڈلی تھی۔ ضیا اس سے کئی برس بڑا تھا۔ اکثر اسے بچوں کی طرح لاڈ کرتا۔ امی موقعہ بے موقع ٹوکتی تو رہتیں، لیکن لاڈ پیار میں کمی ان کی طرف سے بھی نہ تھی۔ اسی لئے شانی ابھی تک اپنے کو بچہ ہی سمجھتی تھی۔ اکثر سوچے سمجھے نابابات کر دیتی۔ بچوں کی طرح ضد کرنے لگتی۔ پیار سے من جاتی اور ذرا ڈانٹ ڈپٹ ہوتی تو اڑیل گھوڑے کی طرح بدک بدک جاتی۔

ضیا کی دلہن کا تصوراتی خاکہ جو اس نے بنا رکھا تھا۔ اس پر کئی لڑکیوں کو جانچ پرکھ چکی تھی اپنی کئی سہیلیاں سہیلیوں کی سہیلیاں۔ سہیلیوں کی بہنیں اور کزن بہت سی لڑکیاں دیکھی تھیں۔ لیکن جانچ تول کے پیمانے پر کوئی بھی پوری نہ اترتی تھی۔ کوئی حسین تھی تو دولت مند نہیں، کوئی سمارٹ تھی تو ذہین نہیں۔ کوئی پیاری سی تھی تو فیشن ایبل نہیں۔

وہ اپنے اس تصوراتی خاکے کو اکثر ضیا کے سامنے بھی پھیلا دیتی۔ اور پھر نام لے لے کر لڑکیاں گنواتی۔ ان کی خوبیاں ان کی خامیاں بغیر لگی لپٹی کے کہے جاتی۔ اور پھر ہنس کر سب کے نام پہ لائن پھیر دیتی۔

ضیا اس کی باتوں سے بہت محظوظ ہوتا۔ کبھی کبھی اسے چھیڑنے کو کہتا "شکل دیکھی ہے اپنے بھیا کی۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ لنگور کا لنگور بھائی ہے۔ کماتا واتا ایک دھیلا نہیں۔ اور خواب دیکھے جاتے ہیں۔ نایاب چیزوں کے۔"

شانی ان باتوں سے خفا ہو جاتی۔

ضیا کو اس کی خفگی مہنگی ہی پڑتی۔ صلح ہو جانے کی صورت میں وہ بھیا سے تاوان لیا کرتی تھی۔ جو چھوٹا موٹا تحفہ ہوتا۔ کبھی کتاب۔ کبھی قمیض کا پیس۔ کبھی چپل اور کبھی کبھی صرف

ٹافیوں کا پیکٹ۔

تاوان ضیا بھی لیا کرتا تھا۔ جب قصور وار شانی ہوتی۔ تو صلح کے لئے اُسے ہاتھ آگے کرنا پڑتا۔ بھیا تاوان ضرور وصول کرتا۔ جو قمیض دھو کر استری کرنے۔ جرابیں رفو کرنے اور کمرے کی صفائی پر منتج ہوتا تھا۔

برسوں پہلے اماں جی کے پُرانے حویلی نماں گھر میں بھرا پرا کنبہ رہا کرتا تھا۔ اماں جی کے دیور دیورانی اُوپر والی منزل میں رہائش پذیر تھے۔ ایک بھائی بھاوج ڈیوڑھی کے ساتھ والے تین کمروں میں رہتے تھے۔ اور خود اماں بی اپنے پانچ بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ نچلے حصے میں رہا کرتی تھیں۔

دیور اپنا کماتے تھے۔ بھائی کا ذریعہ آمدنی بھی الگ تھا۔ لیکن پورے گھرانے پر حکم حکمرانی اماں بی کی چلتی تھی۔ دیور یا بھائی کی مجال نہ تھی کہ ان کے سامنے آنکھ اٹھا کر بھی بات کر سکیں کوئی معاملہ ایسا نہ تھا۔ جس میں اماں بی کی مرضی اور صلاح کا دخل نہ ہوتا۔

اور تو اور کنبے برادری میں بھی اماں کی بہت مانی جاتی ہے۔ رشتے ناطے تو اماں بی سے پوچھ کر کرنا تو ہر ایک اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اور کچھ قدرت کے کرشمے ہی تھے کہ یوں جو بھی رشتے طے ہوئے خوب ہی پھلے پھولے۔ اب تو شگن کے طور پر ہر رشتے کا اماں بی سے ضرور پوچھا جاتا۔

وقت اچھا تھا۔ حالات اچھے تھے فضا بھی اچھی ہی ہونا تھی۔ اخلاقی قدریں اچھی تھیں اسی لئے وقت بہت اچھی گزر رہا تھا۔ دیور دیورانی کے بچے بیاہے گئے۔ اماں بی کے ہاں بہوئیں آگئیں۔ بیٹی بھائی کے ہاں بیاہ دی۔ خاندان پھیل گیا۔ لیکن پھیل کر بھی اس حویلی کے در و دیوار میں اتنی وسعت تھی کہ وہیں سمٹا رہا۔

اماں بی کی حیثیت مرکزی رہی اور حویلی چھوٹی سی جاگیر۔ جس پر اماں کی حکمرانی مرتے دم تک

قائم رہی۔

گھر میں سب مل جل کر رہتے تھے۔ گہما گہمی اور رونقیں آباد تھیں۔ ساس بہو نند بھاوج یا دیورانی جیٹھانی کے جھگڑے اس حویلی کے در و بام نے کبھی دیکھے نہ سنے۔ اگر کبھی ایسی نوبت آئی بھی تو اماں بی کی دور اندیشی نے معاملہ بھانپ کر وہیں سمیٹ لیا۔ ایک دوسرے کے لئے قربانی کا جذبہ بھی اہل خانہ کی سرشت میں تھا۔ اس لئے کبھی کبھار ایک طرف سے زیادتی بھی ہو جاتی۔ تو دوسرا درگذر کر دیتا۔ یوں ایک بھرے پُرے کنبے کی گذر بسر بڑے سکون سے ہو رہی تھی۔

اماں بی کا بڑا بیٹا ناصر ان کے دیور کی لڑکی شاہدہ سے بیاہا گیا اور بیٹی رابعہ بیگم ماموں کی بہو بنی۔ ناصر رابعہ سے کئی برس بڑا تھا۔ دونوں کے درمیان میں تین بھائی اور بھی تھے۔ لیکن ناصر کی بیٹی سارہ رابعہ کے بیٹے ضیا سے سات آٹھ سال چھوٹی تھی ناصر اور شاہدہ کے ہاں شادی کے کوئی دس سال بعد بڑی منتوں اور مرادوں سے سارہ پیدا ہوئی تھی۔ اس کے بعد پھر کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ یوں سارہ جہاں ناصر اور شاہدہ کی متاع حیات تو تھی ہی۔ لیکن دادی اور سب گھر والوں کی آنکھوں کا تارا بھی تھی۔

اماں بی نے سارہ کے پیدا ہوتے ہی اس کے رشتے کا اعلان بھی کر دیا۔ "میں زندہ رہی تو خود یہ شادی سر انجام دوں گی۔ مر گئی تو میری وصیت ہے کہ ضیا اور سارہ کو ازدواجی بندھن میں باندھا جائے۔"

بات پہلے پہلے مذاق تک ہی محدود رہی۔ رابعہ بیگم بچی کو جب بھی گود میں لیتیں "میری بہورانی میری بہو بیگم" جیسے الفاظ کہہ کر پیار کرتیں۔ شاہدہ بھی ضیا کو چھیڑتی۔

لیکن

جب بچے قدرے ہوشمند ہو گئے۔ تو شاہدہ کو یہ مذاق بُرا لگنے لگا۔ وہ کہتی اللہ جانے کیا حالات ہوں۔ بچوں کے سامنے اب ایسی باتیں نہیں ہونا چاہییں۔ جب جوان ہوں گے دیکھیں گے لیکن یہ بات دبے دبے الفاظ ہی میں کہہ پائی تھی۔ اماں بی کے ہوتے ہوئے ان کی بات

رد کرنے کا حوصلہ و جرأت کسے تھی۔

رابعہ بیگم مذاق مذاق میں سنجیدہ ہو گئیں تھیں۔ ایک تو بچی اپنا خون تھی دوسرے اماں بی کے ہاتھوں جوڑا ہوا رشتہ۔ یہ بات ہی خوشگوار ازدواجی زندگی کی علامت تھی۔ سارہ کو ضیا کی دلہن بنانے کا بڑا پختہ عزم کر بیٹھیں۔

وقت کا دھارا بہتا رہا۔

حالات بدلتے رہے۔

خیالات بدلتے گئے۔

اماں بی جو حویلی میں ایک مرکزی کردار تھیں لقمۂ اجل ہو گئیں، گو وہ عمر کے اس حصے کو پہنچ چکی تھیں۔ جہاں دنیا داری کے جھنجھٹوں کے لئے وجود بیکار ہو جاتا ہے۔ پھر بھی سب کو محبوب تھیں۔ سب کا بندھن تھیں رابطہ تھیں۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہی ایک نقطہ تھیں۔ جسے مرکزی حیثیت مان کر خطوط اُوپر نیچے دائیں بائیں کھینچے جا سکتے تھے۔ یہ نقطہ مٹ گیا۔ تو خطوط بکھر گئے۔ ان کی ترتیب بدل گئی۔ پہلے ہر کوئی اماں بی تک پھیلا ہوا تھا۔ اب اپنی ذات میں سمٹنے لگا۔ اپنے مفاد کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ اجتماع کی جگہ انفرادیت آنے لگی۔ ایک خاندان کی بجائے اب حویلی میں مختلف خاندان نظر آنے لگے۔

اور ظاہر ہے مختلف خاندانوں کو سمیٹنے کے لئے حویلی کا حلقہ تنگ ہی تھا، کوئی بہتر مستقبل کی تلاش میں اس حویلی چھوڑ شہر سے ہی نکل گیا۔ کسی نے الگ گھر لے لیا۔ کسی نے بنگلہ خریدا۔ کوئی کوٹھی میں جا بسا۔

تسبیح میں پروئے دانے تاگہ ٹوٹ جانے سے بکھر گئے۔ شاہدہ کی خواہش بھی تھی۔ کہ گھٹن کے اس ماحول سے فرار پائے، اکثر ناصر سے کہتی رہتی سارہ کا ضیا سے کھیلنا تو اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

رابعہ بیگم کا عزم اب تک نہیں ڈگمگایا تھا۔ اکثر وہ اس رشتے کی استواری کی دعا کرتیں شاہدہ

کو بھی احساس دلاتی رہتیں۔ ناصر تو صرف ہنس کر ٹال دیتا۔ لیکن شاہدہ اب نفی کا اقرار کرنے لگی تھی

ضیا اور سارہ بچے تھے۔ کھیل اور لڑائی لازم و ملزوم تھے۔ لاکھ منع کرو انہوں نے کھیلنا ہوتا تو اکٹھے ہو ہی جاتے۔ لڑنا ہوتا۔ تو انجام و عواقب کی پرواہ کئے بغیر لڑ پڑتے۔

زیادتی دونوں میں سے کسی کی بھی ہوتی شاہدہ مورد الزام ضیا ہی کو ٹھہراتی۔ بعض اوقات تو اس کا رویہ اتنا نازیبا ہوتا کہ رابعہ بیگم چھوڑ دوسرے دیکھنے والے بھی حیران رہ جاتے۔

رابعہ درگذر کرنے کی عادی تھیں، ہنس کر بات تلخ ہونے سے بچا لیتیں۔ سنجیدگی کو مذاق میں بدل دیتیں۔ لیکن وہ محسوس کر رہی تھیں کہ شاہدہ کو بڑی خار چڑھتی تھی۔ مذاق میں بھی بگڑنے لگتی تھی۔

وہ جب بھی ضیا کی شکایت کرتی۔

رابعہ ہنس کر کہتی۔" تمہارا ہی داماد ہے۔ جیسا بھی ہے اسی سے نباہ کرنے کی عادت ڈالو بھابی۔ ویسے میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہوگا۔ چراغ لے کر ڈھونڈو گی بھی تو ایسا ہرگز نہیں ملے گا بیٹی کے لئے۔ پہلے تو شاہدہ صرف منہ بنا کر رہ جاتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ دوٹوک جواب دینے لگی تھی۔

" مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ خبردار جو آئندہ میری بیٹی کا کسی نے یوں نام لیا"۔ کھینچا تانی شروع ہو چکی تھی۔ شاہدہ دامن کھینچ رہی تھی۔ دراصل اس کا ارادہ اپنے بھانجے سے یہ ناطہ طے کرنے کا تھا۔ ساس کی موجودگی میں تو کھل کر کہہ نہ سکتی تھی۔ لیکن اب روک ٹوک نہ تھی۔

رابعہ بیگم کا عزم بھی پختہ سے پختہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ معاملہ ضد کی حدود میں آگیا تھا۔

ماہ و سال گزرتے چلے گئے۔ ناصر بھی روزگار کے بہتر وسائل کی تلاش میں ملک سے باہر چلا گیا بچی اور بیوی کو بھی وہیں بلا لیا۔

پھر رابعہ بیگم نے بھی اپنا نیا گھر تعمیر کر ڈالا۔ یوں حویلی میں دوسرے عزیزوں کو رہائش پذیر چھوڑ وہ اپنے نئے گھر آ گئیں۔

وقت بدلا۔ حالات بدلے۔ شاہدہ کو دیارِ غیر میں موت آگئی۔ پھر رابعہ بیگم پر بیوگی ٹوٹ پڑی۔ ضیا اور شانی دو ہی بچے تھے۔ جن پر ان کی حیات کی ساری رونقیں مرکوز ہو گئیں۔

آٹھ نو سال پہلے جب ناصر واپس ملک آیا اور کراچی میں کاروبار کیا تو ایک جگہ پرانے آشیانے کا بھی لگایا۔ رابعہ بیگم نے اپنی دیرینہ خواہش کا احساس دلایا۔ اماں بی کے ناطے کی یاد دہانی کرائی تو اس نے اپنے آپ کو مرحومہ کی خواہش کا پابند پاتے ہوئے معذوری ظاہر کر دی۔ شاہدہ مرنے سے پہلے صاف طور سے کہہ گئی تھی۔ کہ سارہ کا رشتہ اختر سے طے کیا جائے۔

رابعہ بیگم جز بز تو بہت ہوئیں۔ طعن و تشنیع سے کام بھی لیا۔ لیکن ناصر نے سنی ان سنی کر دی۔ سارہ ان دنوں محض نو دس سال کی بچی تھی اس لئے اس معاملے پر بحث و تمحیص کو ضروری نہ سمجھا۔ یوں بھی جن ممالک میں رہ آیا تھا۔ وہاں ان جھنجھٹوں کا سوال ہی نہ تھا عادی ہی نہ رہا تھا۔

پھر وہ کراچی ایسا گیا۔ کہ کسی کی کبھی یاد آئی نہ خیال۔

رابعہ بیگم اپنی الجھنوں میں جکڑی رہیں۔ بچوں کی پرورش اور نگہداشت ہی بڑا اہم مسئلہ تھا۔

ضیاء بڑا ذہین بچہ تھا۔ ماں کی تربیت رنگ لائی۔ بڑا ہونہار نکلا۔ ہر امتحان بڑے اعزاز سے پاس کیا۔ ایف اے کے بعد آرمی میں جانے کی اس کی دلی خواہش تھی۔ لیکن ماں نے ایک ہی ایک بیٹے کو جانے نہیں دیا۔ ضیاء نے ایم اے کیا۔ اور پھر مقابلے کا امتحان بھی پاس کر لیا۔

رابعہ بیگم کی سوئی ہوئی خواہش اب پھر جاگ اٹھی تھی۔ ضیا جیسا گبھرو نوجوان جس کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا تھا۔ جس کا مضبوط جسم خوبصورت بھی تھا۔ جس کا اخلاق و کردار مثالی نہ سہی بلند اور مضبوط ضرور تھے۔ جو وجاہت اور مردانہ وقار کا مرقعہ تھا۔ سارہ کے لئے ہر لحاظ سے موزوں تھا۔

امید اب جاندار یوں بھی ہو گئی تھی۔ کہ اختر امریکہ انجنیئرنگ کے لئے گیا۔ تو وہیں شادی بھی رچا لی۔ شاہدہ کی خواہش اور وصیت ٹوٹ گئی تھی۔ ادھر ناصر نے بھی دوسری شادی کر لی تھی۔

رابعہ بیگم یہ سمجھنے میں حق بجانب تھیں کہ ناصر کی اپنی دلچسپیاں ہوں گی۔ سارہ کے مستقبل کا سوچنے کا انہیں بھی اب پورا پورا حق ہے۔

بہن بھائی میں اب کوئی تعلق تھا نہ واسطہ۔ خطوں کا سلسلہ منقطع ہوئے ایک مدت ہو چکی تھی
ناصر کبھی آیا تھا نہ رابعہ کراچی گئی تھی۔ کبھی کوئی عزیز رشتہ دار آتا جاتا تو خیر خبر مل جاتی۔

ناصر کا کاروبار اب بہت بلندیوں پر تھا۔ کراچی کے امیر کبیر لوگوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ نئی بیوی انتہائی خوبصورت اور ماڈرن تھی۔ بیٹی طحسین تھی جوان ہو گئی تھی۔ یہ سب باتیں رابعہ بیگم تک انہی آنے جانے والے عزیزوں سے پہنچی تھیں۔

اور

ان کی دبی ہوئی سوچوں نے پھر سے سر اٹھایا تھا۔ سارہ کو بہو بنا کر اپنی مرحومہ ماں کی وصیت کو پورا کرنے کا ارمان بھی جاگ اٹھا تھا۔ ضیا نے اس سلسلے میں کبھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ سارہ اس کے لئے ہونے نہ ہونے کے برابر تھی۔ جن خطوط پر رابعہ بیگم سوچتی تھیں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ بلکہ اکثر ایسے ان باتوں سے اپنی انا پر چوٹ سی لگتی محسوس ہوتی تھی۔ اور وہ غصے میں بھی آجاتا تھا۔

پھر بھی رابعہ بیگم پر اُمید تھیں۔

اور پچھلی دفعہ جب رحمان کراچی گیا تو اس نے بڑی رازداری سے اپنا پیغام ناصر کے لئے دیا تھا۔

اور

یہ خط جو آیا تھا۔ اسی پیغام کا جواب تھا رابعہ بیگم نے شانی سے یہ تو نہیں کہا۔ کہ ناصر کو اس سلسلے میں کچھ کہلا چکی ہیں۔ اسی لئے شانی ماموں کا اتنا پیارا اور شفقت بھرا خط دیکھ کر حیران ہوتی رہی تھی

اور

اپنی ساری حیرانی ضیا کو بھی جتلاتے ہوئے واپس آنے کا خط لکھ دیا تھا۔

اس نے مال کا پورا چکر لگایا

سورج اب غروب ہو چکا تھا۔ سیاہیاں اجالوں کو نگل رہی تھیں۔ ٹھنڈا سا ملگجا سا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ دکانوں کی مرکری ٹیوبیں روشن تھیں۔ سڑکوں پر لگے بڑے بڑے کھمبوں پر لٹکتے بلب جل اٹھے تھے۔ ان کی روشنی ابھی ماند ماند تھی۔ اندھیرا ابھی اندھا نہیں ہوا تھا۔ روشنیوں کا دم بھی تو اندھیروں سے آباد ہے۔ جتنا اندھیرے سیاہ ہوں گے روشنی اتنی ہی تابناک ہوتی چلی جائے گی۔ اپنے طور پر روشنی کچھ بھی تو نہیں۔

ضیا بنگلے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اندھیروں اور اجالوں کا امتزاج اسے بڑا پر فریب لگ رہا تھا۔ مال کی گہما گہمی دم بدم رنگین ہوتی جا رہی تھی۔ نمائشی جلوس بڑھتا پھیلتا جا رہا تھا۔ آنچل لہرا رہے تھے۔ لباسوں کی سرسراہٹیں پھیل رہی تھیں۔ اور خوشگن قہقہے، دلفریب ہنسیاں اور گمبھیر آوازوں کی گفت و گوئیں مل کر سمے کو خوبصورت بنا رہی تھیں۔

ضیا تلخ سی خوشگواری محسوس کر رہا تھا۔ اکیلا پن یہاں بھیڑ بھاڑ میں بھی بری طرح محسوس ہو رہا تھا۔ موسم کا حسن اپنی جگہ اثر انداز تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کل واپس چلا جائے۔ اور یہاں کی فضا دامن بھی کھینچ رہی تھی۔ آسودگی کے لمحوں کا جو نکھار یہاں تھا اور کہیں بھی نہ مل سکتا تھا۔ دو چار دن تو کیا کسی وقت تو جی چاہتا تھا۔ عمر ہی یہاں بیت جائے۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور دھیرے دھیرے کش لیتے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ کبھی

اس کا رُخ سڑک کی طرف ہو جاتا۔ جہاں رنگ و بو کا سیلاب سا نظر آتا۔ نگاہیں کبھی کبھی کسی حسین چہرے پر اٹک بھی جاتیں، کوئی خوبصورت جسم بھی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا۔ چند لمحے رنگین ہو جاتے۔ اس کے لبوں پر دھیما سا تبسم بکھر جاتا۔

اور کبھی وہ اپنا رُخ دوسری سمت پھیر لیتا، جہاں نشیبوں سے بلندیاں اٹھتی چلی جاتی تھیں۔ اور درختوں سے ڈھکی ڈھلانیں اندھیروں میں ڈوب رہی تھیں، ان ڈھلانوں پر بنے مکانوں کی بتیاں دور سے یوں لگ رہی تھیں۔ جیسے سینکڑوں جگنو چمک رہے ہوں۔

کتنی دیر وہ ان مناظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر تنہائی کا احساس ڈسنے لگا۔ اور اس تنہائی کے دلگداز احساس کا سرا آصفہ سے جا ملا۔

درمیانے سے قد کی عام سی لڑکی اس کے حواس پر چھا رہی تھی۔ وہ ایک ٹانگ جنگلے پر رکھ کر گھٹنے پر کہنی ٹکاتے ہوئے جنگلے پر جھک کر بڑے انہماک سے اس کے متعلق سوچنے لگا۔ وہ اپنے آپ کو مجبور پا رہا تھا۔ رمضو بابا سے جو اس نے کل چلے جانے کی ضد کی تھی وہ ایک دم فریب لگی۔

وہ یہاں سے کہاں جا سکتا تھا۔ آصفہ تو زنجیر بن کر اس کے قدموں کو جکڑ چکی تھی۔

آصفہ !

اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے زیر لب کہا۔

اور پھر اس کی سوچیں گمبھیر ہوتی چلی گئیں۔

وہ ایم اے پر یولیس کی طالبہ تھی۔ یونیورسٹی میں خاصی مقبول تھی۔ کچھ تو اس کا پس منظر اس مقبولیت کا باعث تھا۔ کچھ اس کی اپنی ذات اور شخصیت دبلی پتلی سنہری رنگت والی یہ لڑکی خوبصورت بے شک نہ تھی۔ لیکن سمارٹ بہت تھی۔ اور جاذبیت اور صلاحیت رکھتی تھی۔ یونیورسٹی میں کئی اس کے پروانے تھے۔ کچھ غریب لڑکے بھی اس کا دم بھرنے کی جرأت کرتے تھے کہ اسے غریب اور متوسط طبقے کے لڑکے لڑکیوں میں مقبول ہونے کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ محلوں میں

شہزادیوں کی سی آن بان سے رہنے والی یہ لڑکی سوشلسٹ نظریے کی پرچارک تھی۔ یونیورسٹی کے فنکشنوں میں دھواں دھار تقاریر کیا کرتی تھی۔ اُونچے اُونچے فلک بوس محلوں کو زمین بوس کر دینے کے نعرے لگاتی تھی۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم کے خلاف کھلے بندوں باتیں کرتی تھی۔

لیکن یہ دوسری بات ہے۔ کہ اگر کسی دن گھر سے گاڑی وقت پر یونیورسٹی نہ پہنچتی تھی۔ اور اسے بس یا ٹیکسی سے گھر آنا پڑتا تھا۔ تو طوفان اٹھا دیتی تھی۔ یوں آنا اس کی شان کے خلاف ہوتا تھا۔

اچھے اور جدید طرز کے لباس پہنتی تھی۔ پرفیومز کی دیوانی تھی۔ اس کی سنگار میز پر میک اپ کی قیمتی چیزوں میں غیر ملکی پرفیومز کی خوبصورت شیشیاں نمایاں ہوتیں۔ جب کوئی عزیز یا دوست باہر جاتا اسکی ایک ہی فرمائش ہوتی۔ "میری پرفیوم لانا نہ بھولئے گا"۔ اب تو اس نے باہر سے چیزیں منگوانے کا مسئلہ از خود حل کر لیا تھا۔ دو تین ایر ہوسٹس دوست بن گئی تھیں۔ وہ اس کے لئے باہر کے ملکوں سے رنگ رنگ چیزیں لے آتیں۔ اور منافعے کی بھاری سی شرح رکھ کر اس پر فروخت کر دیتیں۔ پیسہ اس کے یہاں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس لئے اپنی من پسند چیزیں منہ مانگے داموں خرید لیا کرتی تھی۔ ڈریسز کے علاوہ میک اپ کی چیزیں جرسیاں پل اوور جوتے تک وہ باہر سے منگواتی تھی۔ کارک سول کے اُونچے پلیٹ فارم کے جوتے اس کے درمیانے قد کو خاصہ اونچا بنا دیتے تھے۔

مما کے پاس نیا پُرانا بے شمار زیور ہونے کے باوجود آرٹی فیشل جیولری کی بھی بڑی شوقین تھی یہ چیزیں بھی وہ اکثر باہر سے منگواتی تھی۔ ماپنے ہاں کی پیتل موتیوں اور کانسی کی بنی انگھوٹھیاں آویزے اور بالے بھی بہت پسند تھے۔ انھیں شوق سے خریدنا اور موقعوں کی مناسبت سے پہننا اسے بہت پسند تھا۔

جس دن ضیار یہاں آیا تھا۔ اس نے چاندی کے بڑے لرزوں والے بالے کانوں میں پہن رکھے تھے اور شانوں تک کٹے بال ان بالوں سے جب الجھتے تھے۔ تو وہ خود بھی الجھ پڑتی تھی۔ غباری بالوں سے اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی درد کا احساس اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ یہی بات ضیار کو اتنی اچھی لگی تھی۔ کہ اس نے بے اختیارانہ بالوں کی تعریف کی تھی۔

اور

آصفہ نے یہ بلاۓ مسلسل دو دن پہنے تھے۔

ضیا ر ان ہالوں کی خفیف خفیف کپکپاتی لرزشوں میں کھویا تھا۔ سگریٹ انگلیوں ہی میں جل جل کر راکھ ہو رہا تھا۔ کہ اچانک اس کے کندھے پر کسی نے زور سے ہاتھ مارا۔

"السلام علیکم" بڑے پرجوش انداز میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے انور بولا۔ ضیا ر گھوم کر اس کی طرف مڑا۔

"اوہ انور" جوابی نعرہ بھی بڑا پرجوش تھا۔

مصافحے کے لئے بڑھے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے ضیا ر نے دونوں ہاتھ بغلگیر ہونے کیلئے بڑھا دیئے۔

تپاک اور گرم جوشی شاید اس کے اندرونی جذبوں کی غماز تھی۔ یا تنہائی میں شناسا صورت نظر آنے کا رد عمل۔ ورنہ انور کوئی اس کا ایسا گہرا دوست تو نہیں تھا۔ دونوں پرخلوص انداز میں بغلگیر ہوئے اور پھر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے محبت کی شدتوں سے دباتے ایک دوسرے کی احوال پرسی کرنے لگے۔

"کہاں ہوتے ہو آجکل" ضیا ر نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر پیش کرتے ہوئے پوچھا

"یہاں" انور نے ہنستے ہوئے سگریٹ لیا۔

"کرتے کیا ہو" ضیا نے سگریٹ اپنے ہونٹوں میں بھی دبایا اور لائیٹ سے انور کا سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا"

"آوارہ گردی" انور نے ہنس کر جواب دیا۔

پرانی بیماری گئی نہیں" ضیا نے اپنا سگریٹ سلگاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"بیماری میں نیا پن تو اب آیا ہے" انور چہک کر بولا۔

"اوہ - یہ بات۔

"ہاں"

دونوں ہنس دیے۔ انور بی اے میں ضیا کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد دونوں الگ ہو گئے تھے۔ انور نے نوکری کر لی تھی۔ اور ضیا نے ایم اے میں داخلہ لیا تھا۔ کبھی کبھار سرراہے ملاقات ہو جاتی تھی۔ اور بس۔ لیکن آج دونوں کے ملنے میں بڑی بھرپور اپنائیت تھی۔ شاید دونوں ہی انسانوں کے اس ہجوم میں قید تنہائی کے اسیر تھے۔ ضیا ر اس کے متعلق پوچھتا رہا۔ انور نے بتایا ان دنوں وہ اکسائز میں ہے، تنخواہ تو بے شک برائے نام ہے، لیکن پیدا بہت کر لیتا ہے۔ خوب ٹھاٹھ سے رہتا ہے اور دھڑلے سے اُوپر اُوپر کی کمائی ہوئی آمدنی خرچ کرتا ہے۔ یہاں ایک بڑے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا چند دن فرصت کے سکون اور ذہنی عیاشی میں گذارنے آیا تھا۔

ضیا اس کی باتیں سن سن کر مسکاتا رہا۔ اسے یاد تھا۔ کہ انور شروع ہی سے اس ٹائپ کا لڑکا تھا۔ سکول اور کالج کے زمانے سے گرل فرینڈز کا چکر چلایا ہوا تھا۔ جہاں موقع ملتا دل پشوری ضرور کر لیتا تھا۔ اب تو وہ آزاد تھا، برسر روزگار تھا۔ باپ مر چکا تھا۔ ماں پہلے ہی نہ تھی۔ خوب عیش کرتا تھا۔

"شادی وادی کر لی" ضیا نے اس کی باتیں سنتے ہوئے ہنس کر کہا۔

انور نے نفی میں سر ہلایا اور مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے بن کر بولا "اپنے نصیب میں سب کچھ ہے شادی نہیں"۔

"ویسے تمہیں اس کی ضرورت بھی نہیں لگتی" ضیا ر نے ہلکی سی مسکراہٹ سے طنز کیا۔

"نہیں دوست" انور اب سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ "یہ بات نہیں"

"تو پھر"

"کوئی قبول ہی نہیں کرتا"

"کیوں"

"جہاں بھی بات چلی۔ ہماری آوارہ گردی اور ہوائی عشق کے چرچے وہاں تک جا پہنچے۔ معاملہ

ٹھپ ہوگیا۔"

ضیا ہنس پڑا۔

"تمہیں مجھ سے ہمدردی کرنا چاہیے۔"

"کوشش کروں گا۔"

"دونوں ہنس پڑے۔"

"ہاں ضیا۔"

"کیا؟"

"تم کہاں ہوتے ہو کیا کرتے ہو۔"

"تمہارے سامنے کھڑا ہوں اور تم سے باتیں کر رہا ہوں۔"

"نہیں یار کام کاج کا پوچھ رہا ہوں۔"

"ان دنوں تو چوکیداری کر رہا ہوں۔"

"کیا؟"

"چوکیداری! نہیں سمجھتے چوکیداری کسے کہتے ہیں۔"

"جھوٹ مت بکو۔"

"اب تم نہیں مانو تو میں کیا کروں۔"

"کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوگے؟"

"یہ کیسے کہدیا تم نے۔"

"تمہارے حلیے سے۔ انداز سے۔ لباس سے۔"

ضیا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ قریب سے گذرنے والے جوڑے نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"ضیا تو ادھر متوجہ نہیں تھا۔"

"نو۔ نے ایک دم سینے پر ہاتھ مارا اور دبی زبان میں نعرہ لگایا، "کیا ظالم شے ہے۔"

"کون" ضیا حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔

"وہ۔ وہ۔ جو جا رہی ہے" انور لٹ جانے کے انداز میں مسخرے پن سے بولا۔

"کون؟۔ جا تو بہت رہی ہیں" ضیا نے تمسخرانہ کہا۔

"اجی صاحب وہ۔ وہ جس نے براؤن پینٹ پہ پیلا سا سوئٹر لے رکھا ہے۔ وہ اس دُبلے سے گنجے سر والے کے ساتھ جو جا رہی ہے۔ ابھی ابھی یہاں سے گذری۔ تم نے دیکھی ہی نہیں۔"

"کیا کرنا تھا دیکھ کر۔"

"پاگل ہو۔ دیکھنے کی چیز ہے۔"

"واقعی"

"ہاں"

"تم لگتا ہے پہلے بھی دیکھ چکے ہو۔"

"ہاں۔ تین چار دن سے نظر آ رہی ہے۔"

"بہت خوبصورت ہے۔"

"ایک دم لاجواب۔ چلو دکھاؤں تمہیں۔"

"نہیں بھائی مجھے تو معاف ہی کرو۔ تم ہی تعاقب کرو۔"

"ہرج کی کیا بات، یہاں تعاقب بڑی بات نہیں، ہر کوئی ایک دوسرے کے پیچھے لگا ہوا ہے چلے آؤ۔"

"نہیں یار۔ اس معاملہ میں بخشو مجھے۔"

"اب اتنے پاکباز بھی نہ بنو۔ کہ مضحکہ خیز لگو۔"

"حد ہو گئی۔"

"چلو پھر۔ دیکھو وہ بھیڑ میں گم ہو چکی ہے۔"

"اسے پتہ چل گیا۔ کہ جناب اس کے عاشقوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ تو۔"

"تو کیا ہو گا۔ تو کیا کرے گی۔"

"اس نے نہ کیا تو اس کا شوہر ضرور مرمت بنا دے گا۔"

اوہ۔ وہ گنجا موٹا۔ اوں ہوں۔ خدا قسم اس عورت کے ساتھ کسی طرح بھی تو سوٹ نہیں کرتا بیچاری کی قسمت پھوٹی ہوئی لگتی ہے۔ بیچاری ایسے کریہہ المنظر انسان کے ساتھ جانے کیسے دن گذارتی ہو گی۔"

ضیا انور کی بے تکی باتوں پر ہنسنے لگا۔

"وہ نہیں جاؤ گے،" ضیا کو جھٹکے سے اطمینان سے ٹکٹکی لگائے دیکھ کر انور روٹھنے کے انداز میں بولا

"چلتا ہوں۔ لیکن اس عورت کا پیچھا نہیں کرنا۔ یوں ہی چلتے ہیں۔ آؤ تمہیں اچھی سی چائے پلاؤں مفت کی پینے کے تو عادی ہو گئے ہو" ضیا نے چھیڑا انور نے جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "بہت مال ہے یار اپنے پاس۔ تم آؤ تو سہی۔ ویسے بھی اتنی دیر سے یہاں کھڑے ہو معیوب بات ہے۔

"کیوں"

لیکن انور نے اس کیوں کا جواب دینے کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اور ضیا بھی جو اتنی دیر سے کھڑا تھا۔ بور ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کے ساتھ چل پڑا۔ لوگوں کے بہتے سیلاب میں وہ بھی بہنے لگے۔

ضیا کا انداز پہلے کا تھا۔ اور انور جلدی جلدی قدم اٹھانے کو بے تاب تھا۔

"جلدی چلو نا" انور نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"چل تو رہا ہوں" مرے کیوں جا رہے ہو۔ اسی سڑک پر ہی ہو گی۔ اسے زمین کھا جائے گی نہ آسمان نگل جائے گا۔ ہو سکتا ہے ابھی واپس ہی آرہی ہو۔"

"نہیں وہ ہوٹل میں جائے گی۔"

"تو اس کا سارا پروگرام تمہارے علم میں ہے۔"

"تین چار دن سے یہی دیکھ رہا ہوں۔"

"گویا الجھ بیٹھے ہو۔" ضیا نے سگریٹ کا دھواں اس کے چہرے کی طرف چھوڑتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"اوہ نہیں یار۔ یہی تو ظلم ہے۔ کہ مجھے کوئی سمجھ ہی نہیں پاتا۔ فٹ آوارگی کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔"

"اب تمہاری اس حرکت پر کون شریف آدمی آوارگی کا لیبل تم پر چسپاں نہ کرے گا۔"

"مجھے اچھی صورتیں بھلی لگتی ہیں۔ تسکین سی ملتی ہے روحانی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ ذہن کو سکون سا ملتا ہے۔ بے چینیوں کو چین آجاتا ہے۔ بس اس سے آگے کچھ نہیں۔"

"بڑے استاد ہو۔ اتنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ بڑھے چلو اپنی راہ پر" ضیا نے اس کے کندھے کو معنی خیز انداز میں دبایا۔

ضیا کی بات کا جواب دینے کی بجائے وہ ایک دم بے قابو سا ہوتے ہوئے بولا "ضیا۔ ضیا وہ۔ وہ۔"

"وہ کیا" ضیا نے پوچھا

"وہ آرہی ہے" اس نے سرگوشی کرتے ہوئے ہاتھ کے خفیف سے اشارے سے بتایا۔

ضیا نے اس طرف دیکھا۔

"وہ رک گئی ہے۔ کوئی ملنے والے نظر آگئے شاید" انور بے تابی سے بولا۔ پھر ضیا کا ہاتھ پکڑ کر اسے تقریباً دھکیلتے ہوئے اس دکان کے برآمدے میں جا پہنچا جس کے عین سامنے وہ کھڑی تھی۔

گنجے سر والا موٹا سا ٹھگنا آدمی دوسرے دو آدمیوں سے بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا اور وہ الگ تھلگ سی کھڑی تھی۔ ارد گرد لوگ ہی لوگ تھے۔ چکا چوند روشنیاں تھیں اور وہ ان سب میں ایک منفرد سی شے لگ رہی تھی۔

برآمدے میں رنگا رنگ چیزیں دیکھنے کے بہانے انور اسے ہی تکے جا رہا تھا۔ ضیا نے پہلے

سرسری نظر اس پر ڈالی ۔

پھر دوبارہ دیکھا

تیسری نظر اس کے چہرے میں اٹک گئی ۔ اور وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر اسے دیکھنے لگا ،اس کا چہرہ ضیا کی نظروں کے لئے بالکل اجنبی نہیں تھا ۔لیکن ۔اسے یاد بھی نہ آرہا تھا ۔کہ یہ چہرہ وہ پہلے کہاں دیکھ چکا ہے ۔

وہ چند لمحوں بعد وہاں سے چلی گئی ،لیکن ضیا سوچوں میں گم چہرے کی مانوسیت کے متعلق غور کرتا رہا ۔

انور چند لمحے اُسے دیکھتا رہا ۔پھر مسکرایا ۔اور ضیا کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔" بس گئے ؟"

" اوہ نہیں ۔میں سوچ رہا ہوں ۔صورت مانوس ہے ۔کہیں پہلے بھی دیکھا ہے اسے یاد نہیں آرہا کہاں دیکھا ہے ۔

" یہیں دیکھا ہو گا ۔"

ضیا کچھ جواب نہ دے سکا ۔ایک عجیب سی الجھن ہونے لگی ۔ یاد کرنے پر بھی جب کچھ یاد نہ آئے تو ایسا ہوتا ہی ہے ۔

انور باتیں کئے گیا ۔اور ضیا بظاہر باتیں سنتا رہا ۔لیکن ذہن کرید میں لگا رہا ۔ پھر بھی یاد نہ کر سکا ۔کہ یہ چہرہ جو مانوس سا ہے ۔اس مانوسیت کی اساس کس بات پہ ہے ۔

" کچھ ملے گا رمضو بابا "

" جی صاحب "

" بھئی کچھ کھانا وانا ہے ۔"

" ہاں صاحب "

" بس تھوڑا سا نکال دو ۔ بھوک لگ رہی ہے ۔ آج میں کچھ کھا پی کر نہیں آیا ۔" رمضو بابا ضیا کی بات پہ پہلی بار ہنسا اور پھر خوشگوار لہجے میں بولا ۔" دیکھا نا صاحب آپ روز کہتے تھے کھانا نہ بنایا کروں ۔ آ گیا نا آج کام "

" اوہ تم بڑے عقلمند ہو رمضو بابا ۔" ضیا نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا " بس جلدی سے تھوڑا سا کھانا لے آؤ ۔"

" گرم کرنے میں کچھ دیر لگے گی صاحب ۔ آپ جب تک لباس تبدیل کریں میں لاتا ہوں کھانا ۔"

" اچھا ۔ ہاں تو پکایا کیا ہے ؟"

" بہت کچھ ہے صاحب جی ۔"

مجھے بہت کچھ نہیں چاہیے ۔"

" شلجم گوشت پکا ہے صاحب جی ۔ چاول بھی ہیں اور کھٹے مصالحے کی چنے کی دال بھی ایک آدھ چپاتی ابھی ڈال لیتا ہوں ۔"

"صرف چاول اور شلجم۔ چپاتی کی ضرورت نہیں۔"

"بہت اچھا صاحب"

"ہاں آج قہوہ ضرور پلاؤ گے۔"

"بالکل بالکل صاحب۔ آج ٹھنڈ بھی کافی ہے"

ضیا سر ہلاتے ہوئے پچھلے برآمدے میں آیا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ رمضو جلدی سے گیس کا چولہا جلا کر کھانا گرم کرنے لگا۔

ضیا اپنے کمرے میں آیا۔ بند کھڑکیوں کے سامنے پردے گرائے۔ باہر اندھا اندھیرا تھا۔ آسمان کا سینہ سیاہ بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ بادلوں کی دھند بہت نیچے اتر آئی تھی۔ چونے کی سی بو ہر سمت سے آرہی تھی۔ بادلوں کا دھواں کمروں میں بھی گھس آیا تھا۔ فضا نمناک سی ہو رہی تھی کمرے کی ہر چیز سیلی سیلی لگ رہی تھی۔

ضیا نے کپڑے بدلے۔ موٹے سے سوتی کپڑے کا شلوار کرتا پہنا۔ گرم کوٹی اوپر ڈالی اور کھانے کے کمرے میں آگیا۔

صبح کا اخبار وہیں میز پر پڑا تھا۔ وہ وقت گذاری کے لئے ایک ایک لفظ پڑھا اخبار پھر سے پڑھنے لگا۔

رمضو کھانے کی ٹرے لے آیا۔

"شاباش لاؤ بھئی۔" ضیا نے اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے خوشدلی سے کہا رمضو ٹرے میز کے ایک سرے پر ٹکائی اور پھر پلیٹیں ڈونگے اور ڈشیں اس کے سامنے سجانے لگا، سفید دھوبی کا دھلا نیپکن بھی اس نے ضیا کے آگے رکھ دیا۔ چمکتے ہوئے چھری کانٹے بھی سامنے کر دیئے

"ارے رمضو۔ ان تکلفات کی کیا ضرورت تھی بابا۔ ایک پلیٹ میں چاول اور ایک میں سالن ڈال لاتے۔"

رمضو اپنی کھچڑی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرانے لگا۔

"تکلف میں ہے تکلیف۔" ضیا گنگنایا۔

"نہیں صاحب جی تکلیف کیسی۔ اور پھر اپنے ہاں تو ایسا ہی دستور ہے۔ کبھی بڑے صاحب یا سعید صاحب کو کھانا دیتے نیپکن بھول جاؤں۔ تو شامت آجاتی ہے، بوڑھا رمضو ضیا کی باتوں سے ذرا جرأت پا کر حال دل کہنے پہ آگیا۔" اور جو آصف بی بی کو کبھی چھری کانٹا نہ دوں تو توبہ۔ بٹیا زمین آسمان ایک کر دیتی ہیں۔"

ضیا نے آصفہ کے نام پر چاول اپنی پلیٹ میں نکالتے نکالتے رمضو کی طرف متبسم لبوں سے دیکھا۔

"چھوٹی ہیں نا گھر میں بہت لاڈلی ہیں۔" اس کی نظروں سے نہ جانے کیا سمجھ کر رمضو بولا۔

"ہوں۔ ضیا نے سالن کی ڈش اپنے سامنے کی۔ اور خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

رمضو چند لمحے کھڑا رہا۔ پھر جانے کو مڑا۔

"ارے رمضو"

"جی"

"کوئی خط تو نہیں آیا میرا"

"جی نہیں"

"سعید کا فون وغیرہ۔"

"نہیں۔"

"خدا جانے یہ لوگ کب لوٹیں گے۔

"پرسوں آرہے ہیں نا جی۔

"پکا پتہ تھوڑا ہی ہے یہاں تک پہنچتے پہنچتے کوئی اور ہی پروگرام نہ بن جائے ان کا۔

"یہ بات تو ہے صاحب۔"

"تو یہ بات بھی پکی رمضو۔ کہ پرسوں بھی وہ لوگ نہ آئے نا۔ تو میں یہ گھر بار تمہارے سپرد کر کے

واپس چلا جاؤں گا۔ نہ نہ۔ کوئی بات نہیں سنوں گا۔ کوئی حیلہ نہیں چلے گا۔ ہاں سمجھے۔ بور کر دیا تمہارے صاحب نے۔

ضرور آجائیں گے جی۔ جہاں اتنے دن گذارے میں دو تین اور بھی سہی۔

ضیا کھانا کھانے لگا۔ رمضو کمرے سے نکل گیا۔

باہر فضا میں جیسے دھینگا مشتی ہونے لگی۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ دم بدم تیز اور خوفناک ہوتی چلی گئی بجلیاں کوندنے لگیں۔ ہوائیں پرزور ہوگئیں۔ درختوں سے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ اور شوریدہ سر ہواؤں کے رقص پر ادھر سے ادھر اڑنے لگے۔ کبھی کبھی کوئی پتوں بھری ڈال تڑاخ سے ٹوٹ کر ٹین کی چھتوں پر گرتی۔ تو خاموش کمرے میں ایک عجیب سی صدا پیدا ہوتی۔

ضیا کے کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے بارش شروع ہوگئی۔ پہلے تو موٹی موٹی بوندیں پڑیں ٹین کی چھتوں پر جیسے ساز سے بج اٹھے۔ لیکن جلدی بارش نے شدت اختیار کر لی۔ پانی چادروں کی صورت پڑنے لگا۔ بند برآمدوں کے شیشے پانی کی بوچھاڑ سے گھٹی گھٹی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ چھتوں پر موسلا دھار بارش نے شور مچا رکھا تھا۔ پہاڑی نالے بھر گئے تھے۔ بلندی سے نشیب کی طرف گرنے والا ان نالوں کا پانی شاں شاں کی قیامت خیز آوازوں سے فضا کو ہیبت ناک بنا رہا تھا۔

ضیا اپنے بستر میں آگیا۔

بارش کی چھم چھم ضیا کو ہمیشہ مترنم لگتی تھی۔ لیکن اس وقت بنگلے کی تنہائی میں یہ آوازیں ہیبت ناک لگ رہی تھیں۔

ادھ جلا سگریٹ دور پھینک کر ضیا نے کمبل کھینچا اور تکیے پر ٹھیک سے سر جماتے ہوئے برابر کی میز پر جلنے والا ٹیبل لیمپ گل کر دیا۔

کتنی ہی ساعتیں وہ بے حس پڑا رہا۔ ذہن میں کئی خیالات آ رہے تھے جا رہے تھے شانی کا خیال بھی آیا۔ امی کا بھی۔ آصفہ بھی خیالوں میں رہی اور انور بھی۔

انور کے تلازم سے وہ چہرا سوچوں میں الجھ گیا۔ جو مانوس تھا۔ اجنبی نہیں تھا۔ لیکن جس کے متعلق وہ اب تک جان نہ پایا تھا۔ کہ کب اور کہاں دیکھا ہے۔

غنودگی کے عالم میں تھا۔ حواس نیند کی مدہوشی میں گم ہو رہے تھے۔ کہ ایکدم کہیں بجلی گری روشنی کا پکا پردوں کی آوٹ سے بھی جیسے اندر در آیا۔ ضیا بستر میں اٹھ بیٹھا۔

بارش کا زور کچھ کم ہو چکا تھا۔ لیکن گرج چمک میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بار بار بجلی چمک رہی تھی۔ اور اندھیرے کمرے کو دم بھر کے لئے روشن کر کے کچھ زیادہ ہی سیاہی بخش رہی تھی۔

ضیا پھر بستر پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں، روشنی پھر ہوئی اور بالکل اچانک اور آناً فاناً اس کا ذہن روشن ہو گیا۔

اسے ایکدم وہ چہرہ یاد آگیا۔ جو اس نے سردیوں میں دیکھا تھا۔

یقیناً وہی ہے۔ اس نے بڑے تیقن اور بے صبر سے اعتماد کے ساتھ کہا۔ جان لینے کی خوشی اس کے رگ و پے میں سرور بن کر دوڑ گئی، اپنی یادداشت کی داد دیتے ہوئے وہ اس مانوس چہرے کے متعلق پوری مستعدی سے سوچنے لگا۔

وہ بے چین ہو رہا تھا۔ کہ وہ مانوس چہرہ وہی جو اس نے جرمنی میں دیکھا تھا تو اسکراہ کے جذبات کا عکس اس کے چہرے پر لہرا رہا تھا۔

گذری سردیوں ہی کی تو بات تھی۔

وہ جرمنی گیا تھا۔ وہ ان دنوں فارغ ہی تھا۔ امتحان دے چکا تھا۔ نتیجے کا ابھی کوئی امکان نہ تھا۔ رحمان چچا کو اچانک ہی اس کی ضرورت آن پڑی تھی۔

وہ خاصے بڑے بزنس کو چلا رہے تھے۔ جرمنی میں ایک مشہور فرم سے تجارت کر رہے تھے۔ فرم نے چمڑے کی مصنوعات کے کچھ سیمپل منگوائے تھے۔ آرڈر بہت بڑا ملنے کی توقع تھی۔ منافع بھی خاصا تھا۔ لیکن سیمپل بذریعہ ڈاک بھیجنے سے دیر کا امکان تھا۔ ضیا کو سیمپل دے کر انہوں نے بنفس نفیس بھیجنے کا ارادہ کیا۔

ضیا کو بھلا اور کیا چاہیے تھا۔ مفت میں یورپ کا ٹرپ بن رہا تھا۔ باہر جانے کے خواب تو اکثر وہ بھی دیکھا کرتا تھا۔ خواب یوں پورے ہو جانے کا تو اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔

"جرمنی جاؤ گے؟" رحمان چچا نے پوچھا تھا۔ تو وہ مذاق سمجھ کر ہنس پڑا تھا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا" وہ جب سنجیدگی سے بولے تھے تو ضیا حیران حیران سا انھیں دیکھنے لگا تھا۔

بزنس کے سلسلے میں کسی نہ کسی کو بھیجنا ہے۔ میرے خیال میں تم ان دنوں بیکار ہی ہو، چکر لگا آؤ میرا کام ہو جائے گا تمہاری سیر۔ کیوں؟"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں نا"

"بالکل"

"سچی"

"ہاں بیٹے۔ تم اپنی امی سے پوچھ لو۔ بزنس کا معاملہ ہے۔ ڈاک سے کام نہیں ہو سکے گا"

"لیکن مجھے تو بزنس کی الف ب بھی معلوم نہیں"

"رحمان ہنس پڑے تھے"، "تم گھبراؤ نہیں۔ پڑھے لکھے آدمی ہو، عقلمند اور ذہین بھی۔ پھر بزنس سے کوئی تعلق بھی نہیں۔ سیمپل لے جانے ہیں اور فرم کے منیجر کو ان کی ساخت اور قیمت وغیرہ کے متعلق بتانا ہے۔ یہ ساری باتیں لکھی ہوں گی۔ تم صرف تیار ہو جاؤ۔ امی سے صلاح کر لو جانے دیں۔ تو بہتر نہیں تو میں کسی اور سے بات کر لوں گا"

"نہیں رحمان چچا میں ہی جاؤں گا" وہ خوشی سے لپکتے ہوئے بولا تھا۔

اور پھر مہینے کے اندر اندر ساری تیاریاں مکمل کر کے وہ جرمنی کے لئے پرواز بھی کر چکا تھا۔

بارش کا دھیما پن مترنم ہو گیا تھا۔ ٹین کی چھتوں پہ بڑی شائستگی سے گرتے قطرے لطیف احساسات کو گدگدا رہے تھے، ہواؤں کا زور شاید کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ کہیں کہیں سے ہٹ بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

موسم اور ماحول سے بے نیاز ضیا آنکھیں بند کئے جاگ رہا تھا۔ وہ تصور کی سکرین ابھرتے پھیلتے سائے دیکھ رہا تھا۔ جرمنی کا سفر یاد آ رہا تھا۔ وہ صبح نکھر رہی تھی۔ جب وہ میونخ میں تھا ایک بہت بڑے سٹور میں جا رہا تھا۔ رنگا رنگ چیزیں سٹور کی ترتیب خرید و فروخت کا طریق کار ہر چیز کو شوق کی نگاہوں میں جذب کر رہا تھا۔ شانی اور امی کے لئے اس نے چھوٹے موٹے تحائف خریدنے تھے۔ رحمان چچا کے دیئے ہوئے خرچے میں سے اس نے بڑی کنجوسی کر کے یہ پیسے بچائے تھے۔ ان کا کام کر چکا تھا۔ بذریعہ تار اطلاع بھی دی تھی اور مفصل خط بھی تحریر کر دیا تھا۔ اس کا یہ ٹرپ رحمان چچا کے لئے خوب سودمند ثابت ہوا تھا۔

سارے کاموں سے نپٹ کر اس نے چند دن جرمنی کی سرزمین کو گھوم پھر کر دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ بہت سی جگہیں دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک گاؤں بھی دیکھے تھے۔ یہاں کی شہری اور دیہاتی زندگی کا موازنہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔ اب وہ میونخ میں تھا۔ رحمان چچا ہی کے ایک واقف کار کی وجہ سے اسے یہاں گھومنے پھرنے میں بڑی سہولت ہوئی تھی۔ وہ انگریزی جانتا تھا۔ اور ضیا کو جب کسی جرمن سے ہمکلام ہونے کی خواہش ہوتی وہ ترجمان کی حیثیت میں

بہت کارآمد ثابت ہوگا۔

یہاں ضیا کو بڑے دلچسپ تجربات ہوئے تھے۔ وہ ترجمان ساتھ نہ بھی ہوتا۔ جب بھی ضیا اشاروں کنایوں کی مدد سے اپنی بات جرمن بولنے والوں کو سمجھا لیتا۔ وہ اس حقیقت کو مان گیا تھا کہ انسان خواہ مشرق کا ہو خواہ مغرب کا۔ بنیادی طور پر ایک ہے۔ انسانیت کی عالمگیر برادری ہے۔ ورنہ کیسے بات کیئے بنا صرف اشاروں سے ایک دوسرے کی بات سمجھی جا سکتی ہے۔ کاش یہ زبانیں یہ بولیاں ایجاد نہ ہوئی ہوتیں۔ حد بندیاں نہ ہوتیں۔ انسان اور انسان میں فرق نہ رہتا کوئی قدامت پسند نہ کہلاتا کوئی ترقی پسند نہ ہوتا۔ سب ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھتے ملک کی قید نہ ہوتی علاقے کی حد بندی نہ ہوتی۔

سٹور میں بھی ضیا اسی اشاروں کی بنیادی زبان سے کام لے رہا تھا۔ کہیں کام نہ بنتا تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے والی جرمن لڑکیاں اور لڑکے اس کی مدد کر دیتے۔ وہ چند مطلوبہ اشیاء خرید کر پیکٹ اٹھائے سٹور سے باہر آ رہا تھا۔ کہ یہی عورت اندر داخل ہو رہی تھی۔

اس نے سفید فر کی ٹوپی پہن رکھی تھی اور اس کے خوبصورت گداز بدن کے ساتھ چپکا ہوا سفید فروں والا خوبصورت اور دیدہ زیب لباس تھا۔ وہ اکیلی نہ تھی۔ ایک خوبصورت سا آدمی جو جرمن تھا یا انگریز اس کے ساتھ تھا۔

اس عورت کو اس نے تحسین بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ جانے کیا بات تھی۔ کہ ایک بار دیکھنے کے بعد بار بار دیکھنے کی خواہش مچلی تھی۔ ضیا اس وقت اسے کوئی جرمن عورت سمجھا تھا اور چند لمحے خواہ مخواہ رک کر اسے دیکھتا رہا تھا۔

دوسری شام وہ میونخ کے گرداگرد پھیلے ہوئے یہ باغ خوبصورت انگلش گارڈنز میں گھوم رہا تھا۔ میونخ کے گرداگرد پھیلا ہوا یہ باغ خوبصورتی میں بے مثال ہے۔ مالٹے اور گریپ فروٹ کے پودوں سے پٹا ہے۔ درمیانی روشوں پر مخملیں گھاس کا فرش اس کے حسن میں بے بہا اضافہ ہے جا بجا خوبصورت جھیلیں جن کے شفاف پانیوں میں کالی بطخیں دو سفید بگلے تیرتے پھرتے

ہیں۔ چنار کے اونچے اور سرسبز درختوں میں جھیلوں کا چمکتا پانی انتہائی دلفریب نظر آتا ہے سیر و تفریح کے لیئے لوگ جوق در جوق آتے ہیں۔ اور باغ کے پرسکون گوشوں میں آسودگی کے لمحات گذارتے ہیں۔

شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ ڈوبتی شام کی سرخیاں جھیل کے پانی میں گھل رہی تھیں۔ نیلا اور شفاف پانی کالا ہو رہا تھا۔ سیاہ بطخیں کناروں کی طرف آ رہی تھیں اور سفید راج ہنس اپنی لمبی لمبی گردنوں کو بار بار گردنوں میں چھپا رہے تھے۔

ضیا چابکدستی سے ترشی ہوئی گھاس کی روش پر ٹہل رہا تھا۔ انسانی ہاتھوں کی صناعی اور قدرت کی کرشمہ سازیوں کا لطف لے رہا تھا۔ کہ اس کی نظر سنگترے کے ان پیڑوں کی طرف اٹھ گئی جن میں سے وہ ایک کے نیچے کھڑی تھی۔

اس نے بڑی خوبصورت جھلملاتی میکسی پہن رکھی تھی۔ اس کے گداز جسم کی ساری رعنائیاں قیامت خیز تھیں۔ اس کے ساتھ وہی مرد تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے انتہائی قریب تھے۔ مرد اس پر کئی بار جھک چکا تھا۔

ضیا ایسے مناظر یہاں کثرت سے دیکھ چکا تھا۔ اور پہلی بار کے مشاہدے سے اس پر جو کپکپی طاری ہوئی تھی۔ اب ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ قدرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور درخت کی پتیاں نوچنے کے بہانے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

جانے یہ عورت ضرورت سے زیادہ ہی حسین تھی۔ یا ساحرانہ کشش رکھتی تھی۔ ضیا نہ چاہنے کے باوجود بھی اسے تکنے پر اپنے کو مجبور پا رہا تھا۔ اپنی نگاہی چوری پر اسے ہنسی بھی آ رہی تھی۔ ورتیس بتیس سالہ عورت کو دیکھے جانے پر اپنے کو مجبور پاتے ہوئے الجھن بھی ہو رہی تھی۔

وہ دونوں بے تکلفی سے معاشقہ لڑا رہے تھے۔ پیار کا بے پناہ اظہار ہو رہا تھا جذبات یکجان تھے۔ مرد نے اس کو بازوؤں میں لے لیا تھا۔ اور وہیں درخت تلے بیٹھ کر اس کے ہونٹوں میں اپنے ہونٹ گاڑ دیئے تھے۔ یہ عمل جانے کتنی بار ہوا۔ عورت اس کے بازوؤں تھی

اور مرد کے جذباتی پن میں شدت آ رہی تھی۔

یہ شدت کہیں کسی انتہا ہی کو نہ چھو لے۔ ضیا یہ سوچتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔ دور جا کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ جوڑا ارد گرد سے بے نیاز آنے جانے والوں سے بے پرواہ اپنے آپ میں مست تھا۔

باغ کے دوسرے حصوں میں بھی نیم مدہوشی اتر رہی تھی۔ دھند پھیل رہی تھی اور رومان پسند جوڑے حسین گوشوں میں مقام عافیت ڈھونڈ رہے تھے۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں چھوٹی عمر کی لڑکیاں اور بڑی عمر کے مرد بڑی عمر کی عورتیں اور نوجوان لڑکے عجیب وغریب سے جوڑ نظر آ رہے تھے۔ ضیا ان لوگوں کی تہذیب پر نفریں بھیجتا واپس آ گیا۔ یہی قسم کی دو تین نوجوان لڑکیوں نے ضیا کو بھی دعوت حسن دی تھی۔ لیکن وہ معذرت کر کے دامن بچا گیا تھا۔

پھر اس نے اس عورت کو میونخ کے ایک اونچے ہوٹل میں دیکھا۔ رحمان چچا کے اسی واقف کار مسٹر گوریل کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ ہوٹل روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور ہال کے چکنے فرش پہ دھینگا مشتی نما رقص ہو رہا تھا۔ رنگ و نور کا سیلاب امنڈا ہوا تھا۔ ایک طرف کئی سازوں کا آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اور بڑی جوشیلی سی دھن فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ نوجوان جسم تھرک رہے تھے۔ ننگے شانے ٹکرا رہے تھے۔ مرمریں بازو جل مچھلیوں کی طرح اٹھ اور گر رہے تھے۔ ناچنے والے بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ ہو ہا کی تیز آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ ہوش اور سدھ بدھ سے بیگانہ رقص انداز جسم زمانہ قدیم کے کسی وحشی دور کی یاد دلا رہے تھے۔

ان سے کچھ ہٹ کر میزوں کے گرد لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ تو اس بے ہنگم ناچ سے لطف لیتے ہوئے کرسیوں پہ ہی اچھلنے کی مشق کر رہے تھے۔ کچھ شراب ارغوان کے کیف میں اتر رہے تھے۔ اور کچھ پنیر بسکٹ اور چائے کے ساتھ گرم گرم کافی حلق میں انڈیل رہے تھے۔

مسٹر گوریل نے اپنے لئے وہسکی منگوائی تھی۔

ضیا کو بھی اس نے دعوت دی تھی۔ لیکن ضیا نے مسکراتے ہوئے معذرت کر دی تھی۔ اس کیلئے مسٹر گوریل نے اس کی پسند کی چیزیں اور کافی منگوائی تھی۔ ضیا چائے پیتے ہوئے مسٹر گوریل سے باتیں کر رہا تھا۔ ہاں اسکی نظریں ارادی اور غیر ارادی طور پر تیسری میز پہ بیٹھی ایک دوشیزہ پر پڑ رہی تھیں جس کی سنہری رنگت شراب کی سی نشہ آور لگتی تھی۔ جس کے بھٹے کے ریشوں ایسے بال کندھوں تک پھیلے تھے۔ اور جس کی خوبصورت گردن میں پڑی باریک سی زنجیر اس کے نیم عریاں سینے پہ لٹک رہی تھی۔ سنہری پھسلنے بازوؤں پہ اس نے اودے رنگ کا سٹول ڈال رکھا تھا۔ اپنے جواں سال ساتھی سے وہ بڑی مسرور سی گفت وگو کر رہی تھی۔

یہ لڑکی ضیا کو بے طرح اچھی لگ رہی تھی۔ وہ پرستائش نظروں سے اُسے بار بار دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کا حوصلہ صرف دیکھنے تک ہی محدود تھا۔ اگر یہ لڑکی اس کے قریب آ کر اپنی تہذیب کی علمبرداری کرتے ہوئے اسے اپنا آپ پیش کر دیتی تو وہ بے طرح گھبرا کر معذرت کرنے لگ جاتا۔

اس میں قصور ضیا کا بھی نہیں تھا۔ نہ ہی یہ بزدلی اور کم ہمتی تھی۔ ضیا کے شعور اور اس کے حواس پر مسلط تھا۔ ڈر گناہ اور ثواب کا چکر بھی اپنی جگہ اہم تھا۔ اپنے ڈر اور خوف پہ قابو پا کر وہ وزدیدہ نگاہی پہ ضرور اتر آیا تھا۔

نگاہوں کا شوق و ذوق رواں دواں تھا۔ کہ وہ ہال میں آ گئی۔ یوں لگا جیسے اب تک محفل بے رنگ تھی۔ جمود کی کیفیت سے دوچار تھی۔ اس کے ہال میں آتے ہی چاروں طرف سرخ سنہری رنگ بکھر گئے اور قیامت کا شور بیدار ہو گیا۔

ضیا حیرت زدہ

ششدر

اور

سانس روک کر اسے تکنے لگا۔

اور بھی مشتاق نگاہیں۔

توصیفی نظریں

خوشامدی آنکھیں اس کے قدموں میں لوٹ گئی تھیں۔ کئی چہرے اسے دیکھ کر کھل اٹھے تھے کئی بازو لہرا گئے تھے۔ کسی نے دور ہی سے ہوائی بوسہ لیا تھا۔ کوئی لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھا تھا۔

لیکن ضیا رکو ان لوگوں کی حرکات نے متعجب کیا تھا نہ عورت کے انداز واطوار نے حیران تو وہ اس حقیقت سے ہوا تھا۔ کہ یہ عورت جرمن تھی نہ یونانی۔ بلکہ اس کے اپنے مشرق کی تھی۔ خوبصورت کام کی ساڑھی اور بڑے سے جوڑے میں وہ قاتلانہ حد تک حسین نظر آ رہی تھی۔

وہ اک شان استغنا سے مسکراتی آگے بڑھی۔ کسی کے لئے ہاتھ کے اشارے سے کسی کو سر کی جنبش سے جہرِ مروت کا اظہار کرتی ضیا کے دائیں ہاتھ والے خالی میز پر آ بیٹھی۔ اس کے ساتھ ایک پختہ عمر کا مرد تھا۔ ضیا نے قیافے سے ہی اندازہ لگایا۔ کہ وہ کوئی یونانی بحریہ کا افسر تھا۔ یہ مرد کل والا مرد یقیناً نہیں تھا۔

مسٹر گوریل نے ضیا کے انہماک کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور ٹھنڈی ہونے والی کافی کی طرف اشارہ کیا۔

" میں اس عورت کو دیکھ رہا تھا، مسٹر گوریل، ضیا نے حیرت ٹوٹنے پہ ایک مسرور کن سی اپنائیت کے احساس سے کہا" یہ میرے دیس کی ہے۔"

" اچھا۔"

" ہاں اس نے لباس جو پہن رکھا ہے نا۔ وہ ہمارے دیس کا لباس ہے۔"

" پھر تو تم اس کے ساتھ بیٹھنا پسند کروگے۔ اسے بھی اتنی ہی خوشی ہوگی، جتنی تمہیں ہو رہی ہے۔"

" ہاں میں اس سے ضرور ملونگا۔"

" جاؤ تم جا سکتے ہو۔ میں یہیں بیٹھا ہوں۔ اس بھدے آدمی سے تم کہیں بہتر ہو۔"

ضیا کچھ متذبذب تھا۔ وہ عورت کسی غیر ملکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کل اور کچھ دن پہلے اس کے ساتھ کوئی اور آدمی تھا۔ اینکٹس گارڈن کی دھیمے دھیمے اندھیروں شام بھی اس کے ذہن میں تھی۔ یہ بات اس کے عیاش ہونے کا واضح اشارہ تھی۔ اسے اس اشارے اس اشارے کی گھنٹی بجتی محسوس ہوتی تھی۔ جانے کیوں یہ لگ رہا تھا۔ کہ اپنا تعارف اس عورت کو گراں گزرے گا۔

وہ گھونٹ گھونٹ کافی حلق میں سے اتارتے ہوئے مسٹر گوریل سے باتیں کرنے لگا۔

" واپس جاتے ہوئے اس سے ضرور ملوں گا۔ ابھی شاید اس کو گراں گزرے۔ وہ اپنے واقف کار سے محو گفت وگو جو ہے۔"

" واقف کار۔" مسٹر گوریل ہنسا،

" ہاں تو اور۔" ضیا بے تابی سے بولا۔

" یہ یونانی بھدا سا آدمی بڑا عیاش ہے۔ غیر ملکی عورتوں سے عیاشی کرنا اس کی ہابی ہے آج اُسے کہیں سے پکڑ لایا۔" وہ اس یونانی کے متعلق بہت کچھ بتلانے لگا۔

ضیا کے خون میں ابال سا آگیا۔ مسٹر گوریل کی باتوں سے کوفت ہونے لگی، اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس یونانی کو بُرا بھلا کہتے ہوئے وہ ضیا کو موٹی موٹی گالیوں سے نواز رہا ہے اس کے دیس کی حرمت کا تمسخر اڑا رہا ہے۔ اس کے منہ پہ تھپیڑ مار رہا ہے۔

وہ دونوں اب آمنے سامنے بیٹھے شراب کے جام چڑھا رہے تھے۔ ایک مشرقی عورت کو اتنی بے باکی سے شراب پیتے دیکھ کر ضیا کٹا جا رہا تھا۔ مسٹر گوریل کے لئے بات باعث حیرت تھی نہ اہم۔ وہ اس خاتون کو بڑی ہوسناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اور بڑے عاصیانہ انداز میں اس کے بے پناہ حسن، قاتل جوانی اور گدرائے ہوئے جسم کی باتیں کر رہا تھا۔

ضیا کی ملی غیرت اور حمیت کلبلا رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ کہ یہ عورت پاکستان کی ہے

ہے یا ہندوستان کی۔ لیکن پھر بھی اسے گوریل کی باتوں سے تکلیف پہنچ رہی تھی۔ عورت مسلمان ضرور تھی۔ ضیا کی طبیعت مکدر ہو چکی تھی، اس خاتون کے لئے جو جذبات ستائش دیکھتے ہی دل میں اٹھنے لگے تھے۔ استکراہ میں بدل گئے۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا،" مسٹر گوریل نے ضیا کے شکن آلود ماتھے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"میں واپس جانا چاہتا ہوں۔"

وہ بھی اٹھا۔ ویٹر کو بلایا بل ادا کیا اور ضیا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"ان سے ملو گے نہیں۔" وہ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے بولا۔ اور ضیا کے انکار یا اقرار کے بغیر ہی ہاتھ سے ایک خوبصورت اشارہ عورت کو کیا۔ جو محبت ستائش اور دوستی کا مظہر تھا۔

وہ مسکرا دی۔

مسٹر گوریل نے انگریزی میں پوچھا "آپ انگریزی جانتی ہیں۔"

"ہاں" خاتون مسرت سے بولی۔

"اور اردو بھی یقیناً" ضیا نے اردو میں کہا۔

"اوہ بالکل بالکل۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟" عورت کِھل کر تقریباً اٹھتے ہوئے بولی

"میں پاکستانی ہوں،" ضیا ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

"کتنی خوشی کی بات ہے۔ میں بھی پاکستانی ہوں،" وہ ایکدم کہہ اٹھی۔

ضیا نے اس کے سراپا پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔ اس نے بیٹھنے کے لئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بڑی پرفریب اور پرسحر نظروں سے ضیا کو دیکھ رہی تھی "اللہ وطن سے ہزاروں میل دور ایک ہم وطن کو دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے مجھے۔ بیٹھئے نا۔"

"آپ کو دیکھ کر مجھے خوشی کی بجائے دکھ ہوا ہے۔" ضیا نے بھرپور طنز سے کہا۔ اور پھر علیک

سلیک کئے بغیر اپنے قدموں پر مڑا اور تیزی سے ہال سے نکل گیا۔

مسٹر گوریل بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل آیا۔ خاتون چند لمحے بوکھلائی اور پھر شراب سے شغل کرنے لگی، اپنے ہوٹل میں آ کر جب وہ بستر پر لیٹا تو متاسف ہو رہا تھا۔ اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا۔

"آخر مجھے کیا حق تھا اس عورت سے طنزیہ انداز میں ایسی بات کرنے کا؟"

وہ سوچ رہا تھا۔

سوچتا رہا تھا۔

لیکن اسے پتہ نہ چل سکا۔ کہ کس حق کی بنا پر اس نے خاتون کی مہذب پیش کش کو اتنی بری طرح ٹھکرایا تھا۔

شاید یہ ہم وطنی کا حق تھا۔

یا شاید

ضیا کے اپنے جذبہ شکست کی انتقامی حس کا۔ پھر بھی۔

وہ کچھ نہ جان پایا۔

ضیا وطن واپس آتے ہی اپنے معمولات میں کھو گیا۔ کبھی کبھی اس عورت کا خیال آتا۔ تو تنفر کی ایک لہر سی اسے اپنے رگ و پے میں نشتر کی طرح چبھتی محسوس ہوتی۔

پھر اس کا خیال ذہن سے نکل گیا۔

آج اتنے ماہ بعد بڑے ڈرامائی طور پر وہی خاتون اس کی نظروں کے سامنے آئی تھی ایک نئے آدمی کے ساتھ۔

"ہو سکتا ہے یہ آدمی اس کا شوہر ہی ہو۔" ضیا نے سگریٹ کا آخری سرا دور دیوار کے ساتھ پھینکتے ہوئے کروٹ بدل کر کمبل سر تک تان لیا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ خاتون کوئی اور

ہی ہو۔"

"جہنم میں جائے۔" غنودگی میں ڈوبتے ہوئے وہ آپوں آپ بڑبڑا رہا تھا۔

بادل بہت ہی نیچے جھک آئے تھے۔ مال پر دھواں پھیلا ہوا تھا۔ شام کے اترتے دھندلکوں میں دھواں گہرا ہو رہا تھا۔ پھر بھی نمائشی جلوس رواں دواں تھا۔ رونق چہل پہل اور گہما گہمی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ضیا آج لاشعوری طور پر کچھ زیادہ ہی اہتمام سے تیار ہو کر باہر آیا تھا۔ اس کے ذہن میں گذشتہ رات والی عورت گھوم رہی تھی۔ اور مال پر چہل قدمی کرتے ہوئے وہ لوگوں کے ہجوم میں اسے تلاش کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر یقین کی حدوں کو چھونا چاہتا تھا۔ میونخ والی خاتون کیا یہی تھی؟ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا۔

پورا چکر لگانے کے بعد وہ ایک دوکان کے برآمدے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی متلاشی نگاہیں بار بار لوگوں کے ہجوم پر پڑ رہی تھیں۔ اس مانوس چہرے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جس کے متعلق اجنبی ہونے کے باوجود وہ بہت کچھ جانتا تھا۔

اسے یقین کی کیا ضرورت تھی!

اس کے متعلق جاننے کی کرید کیوں تھی؛

تجسس کیوں پیدا ہوا تھا!

برآمدے میں کھڑے کھڑے وہ اپنی خطوط پر اپنے جذبات کا تجزیہ کر رہا تھا۔ پرائے معاملے میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑانے والی بات تھی۔ جو اسے مضحکہ خیز بھی لگ رہی تھی۔

پھر بھی

تجسس اور کرید انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ انجانے کو جان لینے کی خواہش ضرور ہوتی ہے۔ ذرا سا سرا مل جائے تو کڑیاں ملانے کی جستجو ہونے لگتی ہے۔ دوسروں کے اندر جھانکنے میں لطف ملتا ہے۔

ضیا بھی کچھ ایسے ہی جذبوں کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ ہجوم پہ بار بار بے تاب نگاہیں ڈال رہا تھا۔

لیکن

آج وہ مانوس صورت اسے نظر نہیں آئی۔

شام سو گئی اور جھلملاتی رات بیدار ہو گئی۔ ضیا گھنٹہ بھر گھومنے پھرنے کے بعد ہوٹل میں آ بیٹھا۔

دو ایک شناسا صورتیں نظر آئیں۔ انھیں کے ساتھ آ بیٹھا۔ وقت گذاری کے لئے سب اچھے رفیق ثابت ہوئے۔ حالات حاضرہ پہ بڑی دلچسپ اور پر مغز بحث ہوتی رہی گھنٹہ پون گھنٹہ چٹکی بجاتے گزر گیا۔

ضیا کی طبیعت میں ہلکا سا الجھاؤ تھا۔ وہ خاتون اُسے تلاش کے باوجود آج نظر نہ آئی تھی کیا واپس جا چکی تھی؟

اس خیال سے ہی اُسے کوفت ہوتی۔ یوں لگا جیسے بہت بڑی اور اہم بات ادھوری رہ گئی ہے۔ اور ادھورا پن بذات خود ایک خلجان ہے۔

ضیا ہوٹل سے باہر نکلا، سگریٹ کا نیا پیکٹ خریدا۔ گھڑی دیکھی۔ اور پھر واپس گھر لوٹنے کا موڈ بنا لیا۔

وہ ابھی آدھا راستہ بھی طے نہ کر پایا تھا۔ کہ اچانک اور غیر متوقع طور پہ وہ اپنے سامنے سے آتی نظر آ گئی۔

وہ آج اکیلی تھی۔

ڈارک براؤن ساڑھی پہ اس نے اورنج رنگ کا خوبصورت اور ہلکا پھلکا سٹول کندھوں پہ ڈال رکھا تھا۔ بال جُوڑے کے انداز میں سجے تھے۔ اور میک اَپ دودھیا روشنیوں میں چمک رہا تھا۔

ضیا نے رک کر دم روک کر اسے دیکھا۔

سو فیصدی وہی عورت تھی۔

وہی قد۔ وہی قیامت خیزی۔ وہی گداز۔ وہی چال ڈھال۔ ضیا کی نگاہیں دھوکہ نہ کھا سکتی تھیں۔ ضیا کو اتنی خوشی ہوئی۔ یوں جیسے کسی اہم راز کا سرا ہاتھ آ گیا ہو۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ ضیا کے قریب آئی۔

ضیا نے اسے متوجہ کرنا چاہا۔ بلانا چاہا۔ بات کرنا چاہی۔

لیکن وہ اس پہ سرسری سی نگاہ ڈالتی آگے بڑھ گئی۔

وہ اپنے قدموں پہ گھوم گیا۔ چند لمحے رک کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر جانے کیوں اسی سمت چلنے لگا۔

چلتے چلتے اس نے کئی نوجوانوں کی حریصانہ نظریں اس پہ پڑتی دیکھیں۔ اس کے حسن جہاں سوز کا اعتراف کرتے کئی لبوں سے الفاظ پھسلتے دیکھے۔

وہ دور جا کر لوہے کے ایک جنگلے کے ساتھ ہو گئی اور پھر وہیں سے چوڑی کشادہ سڑک پہ اتر گئی۔

ضیا جنگلے کے قریب رک گیا۔ اسے اندازہ کرتے دیر نہ لگی۔ کہ وہ ہوٹل کی طرف جا رہی تھی۔

پہاڑ کے سب سے مہنگے ہوٹل میں قیام اس کی مالی حیثیت کا کھلا اظہار تھا۔

ضیا کچھ دیر وہیں رکا رہا۔ اونچے نیچے غیر ہموار پہاڑی ٹکریوں پہ پھیلی ہوٹل کی عمارت

رات کے گہرے اندھیرے میں روشنی کی جھلملاہٹ کے باوجود بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ عورت اندر جا چکی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے ایک بہت بڑے اسرار پر اس عمارت نے اور پردہ ڈال دیا ہو۔

وہ کچھ مسحور سا کچھ سحور سا پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے خراماں خراماں واپس ہو گیا اور جانے کیوں رات ہی سے کل شام کا انتظار ذہن میں لذت بن کر پھیلنے لگا۔

انسان اپنی ذات کا قد کاٹھ بڑھانے کے لئے بعض اوقات شعوری اور لاشعوری طور پر بہت کچھ کرتا ہے۔ ضیا اس خاتون کے متعلق کچھ زیادہ نہیں سہی پھر بھی بہت کچھ جانتا تھا وہ یقیناً بڑی عیاش و دولت مند عورت تھی۔ اس عیاشی کا آنکھوں دیکھا حال اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اپنے خیالات اور سوچوں کے اعتبار سے وہ راندہ درگاہ تھی۔ اور اسی شخصیت سے ملنا یا راہ و رسم پیدا کرنا یقیناً مستحسن فعل نہ تھا۔

پھر بھی وہ اپنے اندر اٹھتی پر زور خواہش کو رد نہ کر پایا تھا۔ وہ اس عورت کو ملنا چاہتا تھا اسے جتلانا چاہتا تھا۔ کہ وہ جرمنی میں اسے مل چکا ہے اس کے متعلق جانتا بھی ہے یہ جان لینا دوستی کی فضا ہموار کر رہا تھا۔ اور باوجود اس خاتون کے گھناؤنے کردار کا عینی شاہد ہوتے وہ اس سے ملنے کی راہیں ہموار کر رہا تھا۔

یوں شاید اسے اپنی ذات کا قد کاٹھ بڑا لگنے کی توقع تھی۔ لوگوں کی باتوں اور نظروں سے وہ اندازہ کر چکا تھا۔ کہ وہ ایک پسندیدہ شخصیت ہے۔ کس طرح بھی سہی اس کے ساتھ رابطہ پیدا کر کے وہ ان لوگوں کو مرعوب کر سکتا تھا۔ ضیا کے لاشعور میں شاید یہی امنگ کارفرما تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد آج وہ حسب معمول دیر تک پڑا سوچتا رہا۔ بلکہ کھڑکی کے قریب کرسی ڈالے دھوپ کی زد میں بیٹھا ناول پڑھتا رہا۔

شام اس نے بڑی دیدہ زیب قمیض نکالی۔ اسی کی ہم رنگ پتلون اور چمڑے کی جیکٹ پہنی

بڑے سے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ خاصہ وجیہہ اور شکیل تھا۔

زیر لب مسکراتے ہوئے وہ اپنی خوبصورت آنکھوں میں جھانک اللہ جانے کیا کچھ کہتا سنتا رہا۔

باہر جانے کو دروازے سے نکلا ہی تھا کہ پچھلی طرف سے رمضو آگیا۔

"صاحب جی"

"ہوں"

"آپ کی چٹھی"

ضیا نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر رمضو کے ہاتھ سے لفافہ پکڑ لیا۔ ایڈریس دیکھتے ہی اسے پتہ چل گیا۔ کہ شانی کا خط ہے

اس نے جلدی سے خط کھولا۔ نیلے پیڈ کے کاغذ پر شانی ہی نے خط لکھا تھا۔

ضیا جلدی جلدی پڑھنے لگا۔

شانی کا خط بڑا دلچسپ اور معلوماتی ہوتا تھا۔ گھر چھوڑ محلے میں ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بڑے دلچسپ انداز میں لکھی ہوتی۔ فضل بی بی سے لے کر امی اور گھر میں آنے جانے والے عزیزوں کا لکھا ہوتا۔ اپنی بلی کے دونوں بچوں کا حال احوال تو یوں لکھتی جیسے وہ بلی کے نہیں خود اس کے اپنے بچے ہیں۔

ضیا کے لبوں پر خط پڑھتے تبسم بکھر رہا تھا۔ رمضو قریب ہی کھڑا اس کے انہماک اور شوق کو شوق سے دیکھ رہا تھا۔ ضیا نے صفحہ الٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا

"کس کا خط ہے صاحب جی"

"میری بہن کا"

"چھوٹی ہیں یا بڑی"

وہ چھوٹی ہے مجھ سے بڑا دلچسپ خط لکھتی ہے۔ دیکھو تو اپنی بلی کے بچوں کا جو حال احوال لکھا ہے،، ضیا ہنستے ہوئے خط کا وہ حصہ رمضو کو سنانے لگا۔

رمضو سر ہلاتے ہوئے مسکرانے لگا۔ ان چند دنوں میں وہ ضیا سے کافی کھل گیا تھا۔ ضیا کی طبیعت میں انکساری اور غریب پروری نے اُسے یہ جرأت دلائی تھی۔ ورنہ صاحب لوگوں سے سوائے کام کی بات کرنے کا اسے حوصلہ تھا نہ اختیار۔

صفحہ الٹ کر پھر ضیا خط پڑھنے لگا۔ رمضو کندھے پر بڑے جھاڑن کو جھاڑ کر پھر کندھے پر رکھتے وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے صفحے پر امی کی طرف سے جلد واپس آجانے کی تاکید تھی۔ شانی نے ماموں کے خط کا ذکر کیا تھا۔ بڑے رازدارانہ انداز میں امی کے کراچی جانے کے پکے پکے پروگرام کا لکھا تھا۔

ضیا کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے شانی اس کے سامنے کھڑی۔ نگاہوں میں شریر سی مسکراہٹ لئے کہہ رہی ہے،، سیدھی طرح واپس آجایئے۔ پہاڑ پر زیادہ ٹکنے کی ضرورت نہیں۔ دوستوں سے زیادہ رشتہ دار قریب ہوتے ہیں۔ ماموں نے امی کو بلایا ہے۔ اور بلا وجہ نہیں بلایا سمجھے امی کا بس چلے تو ابھی اڑ کر چلی جائیں۔ ہوں۔ کچھ آیا عقل شریف میں۔

اسے یہ بھی لگا کہ یہ الفاظ کہتے ہوئے شانی شوخی سے کھلکھلا کر ہنس بھی پڑی ہے۔

خط کا آخری حصہ موسم کے متعلق تھا۔ شانی نے گرمی کی ہلاکت آفرینی کے متعلق لکھا تھا۔ شاید رات کو حبس اور گھٹن سے نیند نہ آنے کی باتیں بھی لکھی تھیں۔ ضیا نے سرسری طور پر ان سطور پر نگاہ ڈالی۔

وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

شانی کے الفاظ بڑی اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ وہ حیران تھا کہ شانی نے جو ڈھکا چھپا اشارہ آصفہ کی طرف کیا ہے۔ اس کا علم اسے کیسے ہو گیا۔ آصفہ کو پسند کی نظروں سے

تو اس نے یہاں آکر دیکھا تھا۔ چند واقعات جو اس پسند کو چاہت میں تبدیل کرنے کا موجب بنے تھے۔ ان سے شانی قطعاً نابلد تھی۔

پھر

پھر اس نے کیونکر اتنے شوخ اور شور مچاتے الفاظ میں اس بات کا ذکر کیا تھا۔؟

”شانی تو بہت تیز ہے“

ضیا نے دل ہی دل میں کہا۔ اور خط تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔

جس سکون اور ذہنی آسودگی سے تیار ہو کر وہ باہر جا رہا تھا۔ اب مفقود تھی۔ ضیا کا دل و دماغ ایک نئے مسئلے کے الجھاؤ میں تھا۔ خاتون سے ملنے اور اپنے تعارف کی خوشی زائل ہو چکی تھی۔

سوچوں میں گم وہ کتنی ہی دیر وہاں کھڑا رہا۔ واپس جانے کا فیصلہ کوئی اتنا مشکل نہ تھا۔ لیکن مشکل تو یہ تھی۔ کہ امی کراچی جانے کا پروگرام بنا چکی تھیں۔

یہ بات اپنی جگہ غیر اہم نہ تھی۔

سارہ اس کے لئے فقط ایک نام تھی۔ اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن امی کے سینے میں جس قدر تیز و تند خواہش تھی۔ اس کا بھی اسے علم تھا۔

وہ پڑھا لکھا جوان آدمی تھا۔ اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کرنے کا مجاز تھا۔ امی اسے ایک ایسی لڑکی سے منسلک کرنا چاہتی تھیں۔ جسے اس نے برسوں پہلے جب وہ صرف نو دس سالہ بچی تھی دیکھا تھا۔ اب وہ کیسی تھی۔ اس کے عادات و اطوار کیسے تھے۔ اس پر شریعت طاری تھی۔ یا مغرب کا رنگ چڑھا تھا۔ بات کا اسے تو کیا خود امی کو بھی علم نہ تھا۔ کئی بار وہ اس معاملے میں امی سے الجھ بھی چکا تھا۔ ماموں نے امی کی خواہش کا احترام بھی کب کیا تھا۔

اور اب پھر۔

گڑھے مردے اکھیڑے جارہے تھے۔ ماموں کا پیار بھرا خط آیا تھا: امی کراچی جارہی تھیں۔

یہ سب کیا چکر تھا؟

ضیا کے ذہن میں وسوسہ پہلے ہی موجود تھا۔ جانے کیوں یہ بات ذہن میں گھر کرچکی تھی کہ امی سارہ اس کے پلے ہر قیمت اور ہر صورت باندھیں گی۔ ماموں کے انکار کے باوجود انہوں نے آس نہ توڑی تھی۔

یہ صرف وسوسہ ہی تھا نا؟

مگر اب تو

شانی کے خط سے وسوسہ حقیقت میں بدلا نظر آرہا تھا۔

وہ باہر جانے کی بجائے اپنے کمرے میں آگیا۔ دھم سے بستر میں بیٹھتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

کئی لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا۔ تو اس کی نظریں آصفہ کی تصویر پہ مرکوز ہوگئیں۔

وہ دیکھتا رہا

اور

پھر بے اختیارانہ اس نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ جیسے تصویر نہیں آصفہ کو پکڑنا چاہتا ہو

لیکن

آصفہ تو کیا

وہ

تصویر بھی نہ پکڑ سکا

تصویر اور اس کے ہاتھوں کے درمیان سعید کا پلنگ پڑا تھا۔

چاند سمندر کے آخری کنارے سے ابھر رہا تھا۔ چاندنی برس رہی تھی اور پانی پہ نورانی چادر کی طرح پھیل رہی تھی۔ سمندر میں دیوانہ پن تھا اور لہروں کی کیفیت جنونانہ ہوئی جارہی تھی۔ اچھل اچھل کر چاند کو چھونے کی کوشش میں پاگل ہو رہی تھیں۔

زور دار ریلے کے ساتھ لہریں، کف اڑاتی دور تک بھاگتی چلی جاتیں۔ اور پھر مایوسانہ سمٹ کر لوٹ آتیں۔ جوں جوں چاند کا منور چہرہ روشنیوں کی بوچھاڑ کرتا، چاندنی کی سحر خیز پھوار برساتا اونچا ہو رہا تھا۔ لہروں کی شوریدہ سری بڑھ رہی تھی۔ پانی کی غراہٹیں تیز ہو رہی تھیں۔ فضا اس مترنم شور سے بھری ہوئی تھی۔

چاندنی کی روپہلی چادر لہروں کی مسلسل چھیڑ چھاڑ کی زد میں تھی۔ کبھی پوری طرح بچھ کر وہیں لیٹ کر لیتی اور کبھی بپھری ہوئی لہروں سے خائف ہو کر سمٹ جاتی۔

سمٹنے اور پھیلنے کا عمل ایک تواتر سے جاری تھا۔

سمندر کے اس حسن سے مسحور ہونے بہت سے لوگ آئے تھے۔ ریتلے ساحل پہ حد نگاہ تک وجود ہی وجود تھے۔ عورتیں مرد بچے تفریح کے لئے آئے ہوئے تھے۔ کوئی گیلی ریت پہ ننگے پاؤں بھاگ رہا تھا۔ کوئی قدموں میں مچل مچل کر لوٹ جانے والی لہروں سے لطف لے رہا تھا۔ بہت سے لوگ سومنگ کوسٹیوم میں تھے۔ پانی کی لہروں سے کھیلتے ہوئے نہا رہے تھے۔ کچھ رومان پسند جوڑے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی آڑ میں جذباتی سکر توڑ رہے

تھے۔ کچھ دیواروں کی اوٹ میں بیٹھے دل کی کہانیاں کہہ سن رہے تھے۔ کہیں ٹولیوں کی صورت لوگ بیٹھے تھے گانے بجانے میں مصروف موسیقی کا سحر جاگ رہا تھا۔ لطف وانبساط کے نئے نئے در کھل رہے تھے۔

ساتھ لائے ہوئے ٹرانسسٹر اور ٹیپ ریکارڈر بھی نغمے بکھیر رہے تھے۔ ان کی آوازیں آپس میں خلط ملط ہو رہی تھیں۔ انگریزی دھنوں میں مشرقی آوازیں گھل رہی تھیں، لہروں کی عفیلی غراہٹ اور مترنم شور میں موسیقی کا ڈھلتا جادو فضا کو پراسرار مدہوش کن اور دلآویز بنا رہا تھا۔ کوئی بھی بے ہنگم شور شرابے سے بور نہیں ہو رہا تھا۔ شاید سب لوگوں کا مقصد ہی سکوت شب کو توڑنے سے تھا۔ سب لوگ اس شور کے عادی تھے۔ اور جس چیز کی عادت ہو جائے وہ چبھن نہیں دیتی۔ محسوس ہو بھی تو بری نہیں لگتی۔

سارہ سونیا اور شاہد بھی اس پرفسوں ماحول سے لطف اندوز ہونے آئے تھے۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے تینوں سوکھی ریت سے گیلی ریت پر آ گئے تھے۔

"بس بھئی۔ آگے نہیں جانا" شاہد نے قدم روک لئے۔

"کیوں" سونیا بولی۔

"بس" شاہد نے کہا۔

"کیا ارادہ ہے تمہارا سارہ۔" سونیا نے سارہ سے پوچھا۔

"جو آپ دونوں کا" سارہ نے ہنس کر کہا۔

"لیکن ہم میں تو اختلاف رائے ہو گیا۔" سونیا بولی۔

"تو پہلے آپ دونوں نپٹ لیں۔" سارہ مسکرائی۔

"میرا ساتھ نہ دوگی" شاہد نے اس کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھا۔

"بھئی مجھے نہیں پتہ۔" سارہ گڑبڑا گئی "آپ دونوں پہلے فیصلہ کر لیں۔"

"میری رائے تو یہی ہے کہ وہاں بیٹھیں۔" اس نے ایک ابھری چھوٹی سی چٹان کی

اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے" سارہ بولی۔

"لیکن میں آج ان لہروں سے کھیلنے کے موڈ میں ہوں" سونیا نے اک شان بے نیازی سے کہا

"خواہ مخواہ کپڑے گیلے کر لوگی" سارہ نے کہا۔

"اچھا جی۔" سونیا آنکھیں نچاتے ہوئے ہنسی۔

"کیوں؟"

"تو تمہارا مطلب بھی وہی ہوا"

"وہی کیا"

"یعنی شاہد کا ساتھ دینے کا۔ طرف داری کا انداز خوب ہے"

"نہیں۔ میں نے ان کی طرفداری تو نہیں کی۔"

"بس ہو گئی نا بات۔"

"چلو ہو ہی گئی" شاہد نے سارہ کی بجائے جواب دیا۔ "آؤ سارہ۔ اسے جانے دو پانی میں۔"

"اکیلی" سارہ بولی۔

"جنم جنم سے اکیلے ہیں ہم تو بھئی" سونیا کہتے ہوئے آگے بڑھی۔

"ہم ساتھ دینے تو آئے ہیں" سارہ نے کہا۔

"جس کا ساتھ دینے آئی ہو بس اسی کا دو۔" سونیا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"وہ تو عمر بھر دے گی" سارہ کی بجائے شاہد نے کہا۔ لیکن اتنی آہستگی سے کہ جسے صرف سارہ ہی سن سکی۔

"سارہ نے شاہد کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر رخ پھیر لیا۔

"ہم اس ٹیلے کے پاس ہوں گے۔ نبا چکو تو ادھر ہی آجانا۔" شاہد نے دور ہوتی سونیا سے بلند آواز میں کہا۔

"آؤ" اس نے ملائمت سے سارہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سارہ پر اسرار سی رات میں ایک نوجوان کے ہاتھ کا دباؤ جذباتی شدتوں سے محسوس کر رہی تھی۔ اس نے جلدی سے گھبرا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

شاہد گوشۂ چشم سے اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اس ٹیلے کی طرف بڑھنے لگے جس پر چاندنی پوری شفقتوں سے پھیلی تھی۔ اور جہاں سوکھی ریت چمک رہی تھی۔

شاہد اونچے قد کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ ناک نقشہ بھی پتلا پتلا تھا چہرے کے دُبلے پن کو چھپانے کے لئے لمبے لمبے بال بڑھا رکھے تھے۔ بھاری مونچھیں اور چوڑی چوڑی سولہویں صدی کے بحری قزاقوں جیسی قلمیں چھوڑی ہوئی تھیں۔ جدید وضع کا لباس پہن رکھا تھا۔ گلے میں پتلی سی زنجیر تھی۔ پتلون کی چوڑی بیلٹ میں بھی چھوٹی چھوٹی زنجیریں جھول رہی تھیں اس کے ایک ہاتھ میں ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اور کسی مغربی نغمے کی دھن بج رہی تھی۔

وہ سونیا کا کوئی کزن تھا۔ ایک مقامی فرم میں ملازمت کر رہا تھا۔ تنخواہ سے کہیں زیادہ اخراجات تھے۔ اس کی شامیں کلبوں ہوٹلوں اور سمندری کناروں پہ گذرتی تھیں۔ پیسے کے حصول کا اس نے خوب چکر چلایا ہوا تھا۔ اور ایک نہیں کئی چکر چلائے ہوئے تھے۔ جن میں اس جوئے خانے کی ممبر شپ اور امیر لڑکیوں سے دوستی سرفہرست تھے۔

سونیا کے ہاں ہی وہ سارہ سے پہلی بار متعارف ہوا تھا۔ تعارف پہلی ہی ملاقات میں اتنے گہرے نقش بنا گیا تھا۔ کہ بار بار ملنے کی سبیل بنتی گئی تھی۔

سونیا شہر کے ایک فیشن ایبل علاقے میں چھوٹے مگر خوبصورت فلیٹ میں رہتی تھی۔ اس کی ماں چھوٹا بھائی اور [illegible] تھیں۔ وہ کراچی کی رہنے والی تھی۔ یا کہیں اور سے آئی

تھی۔ اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ بیس اکیس سالہ سونیا حسین تو بے شک نہ تھی لیکن ایسی قیامت خیز جنسی کشش رکھتی تھی۔ کہ الاماں۔ وجود کیا تھا۔ شراروں کو تراش کر اس پیکر میں ڈھالا گیا تھا۔ آگ کی لپکیں دور ہی سے دامن پکڑنے دوڑتی تھیں۔ رنگ گورا نہیں تھا۔ پیتل اور تانبے کے امتزاج سے جو رنگ نکھرتا ہے وہ سونیا کا تھا۔ بالوں کا بھی کچھ ایسا ہی رنگ تھا۔ اس کی یہ رنگت ہی اسے دوسری عام لڑکیوں سے منفرد مقام دیتی تھی۔ آنکھیں دھانی تھیں۔ ناک کچھ چپٹی سی لیکن ہونٹ بھرے بھرے تھے۔ یوں جیسے رس سے بھری قاشیں ہوں۔ ساتھی لڑکیاں جل کر اس کے ہونٹوں کو موٹے اور بھدے کہتی تھیں۔ لیکن سونیا کو خود علم تھا۔ کہ جنس مخالف کے لئے اس کے یہی ہونٹ کتنی بڑی اور ظالم کشش کے حامل ہیں۔

سونیا نے تھرڈ ایئر میں داخلہ لیتے ہی پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ اس کا باپ کسی ایکسیڈنٹ میں مر گیا تھا۔ اور گھر بار کی ذمہ داری سونیا کے کندھوں پہ آگئی تھی۔ اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے سونیا نے جو طریق اپنائے تھے۔ وہ ہرگز مستحسن نہ تھے۔ لیکن وہ خوش تھی۔ اونچے درجے کا معیار زندگی اپنانا اور بنا ٹھنا اس کے نزدیک صرف یوں ہی ممکن تھا۔ ہوسکتا ہے یہ زندگی بھی اس کے تجربے کا نفسیاتی ردعمل ہو۔ کیونکہ اس نے نوکری کے لئے ہر در کھٹکھٹایا تھا۔ اس کی ماں نے بھی محنت مشقت کرنا چاہی تھی۔ لیکن بار اتنا تھا۔ کہ سمیٹا جانے کی کچھ امید نہ تھی۔

مذہب سے بیگانگی اس گھر کا خاصہ تھی۔ اس لئے سونیا کے پھسلنے کے امکانات واضح تھے۔ جب کوئی بندش نہ ہو۔ پابندی سے بھی واسطہ نہ پڑے۔ ثواب و عذاب کا خوف بھی نہ رہے تو پھر اخلاقی قدروں کے ٹوٹنے کا قوی احتمال ہوتا ہے۔ اخلاقی قدریں آخر ہیں کیا۔ یہی پابندی و بندش! ثواب و عذاب کا خوف! انہیں ہی پیمانہ جان کر چند اصول وضع کرلئے جاتے ہیں۔ کچھ قانون بنا لئے جاتے ہیں۔ کچھ قدریں ترتیب دے لی جاتی ہیں۔

حب بنیادیں ہی ڈول جائیں۔ تو پھر ان پر کھڑے ڈھانچے کے صحیح و سالم رہنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

سونیا اپنی جوانی اور جذباتی کشش سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اونچے طبقے کے نوجوانوں سے راہ و رسم پیدا کرنا اس کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔ یوں اس کے کئی دوست تھے۔ جنہیں وہ ہمیشہ کزن کہہ کر ہی متعارف کرواتی تھی۔ یہ کزن نما دوست سونیا کی ہر ضرورت کا منہ بڑی فراخدلی سے بند کر دیا کرتے تھے۔ اور انہی کے ہمراہ وہ اونچے درجے کے ہوٹلوں میں آتی جاتی اور نائٹ کلبوں کی ممبر بنتی تھی۔

سارہ سے اس کی سکول اور کالج کے زمانہ سے جان پہچان تھی۔ کالج چھوڑنے کے بعد کچھ عرصہ وہ سارہ سے نہیں مل پائی تھی۔ لیکن چند ماہ پہلے ہوٹل میں کسی کی شادی کے فنکشن پر اس نے سارہ کو دیکھا تھا۔ تو دوستی کا ہاتھ پھر سے بڑھا دیا تھا۔

سارہ اٹھارہ انیس سالہ گوری چٹی لڑکی تھی۔ بال سیاہ اور آنکھیں خوبصورت تھیں قد و جسم بھی متوازن تھا۔ فورتھ ایئر میں پڑھتی سہیلیاں بنانے کی شوقین تھی۔ شاید یہ اکیلے پن کی وجہ سے تھا۔ ایک ہی ایک بیٹی تھی۔ ابو نے دوسری شادی کر لی تھی۔ گو ان کے لاڈ پیار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ لیکن سارہ کی تنہائی زیادہ ہی کٹھن ہو گئی تھی۔ زوبی آپا بہت اچھی بہت خوبصورت اور بہت ہی شائستہ تھیں۔ سوتیلے پن کی کوئی آگ کوئی ٹھنڈک اس نے محسوس نہ کی تھی۔ دونوں میں تعلق دوستانہ نوعیت کے تھے۔ زوبی آپا نے کبھی اس کے معاملات میں دخل دیا تھا۔ نہ اس نے زوبی آپا کے متعلق گہرائیوں میں جانے کی کبھی کوشش کی تھی۔

یوں بھی یہ گھرانا مالی لحاظ سے روز بروز اُوپر ہی اُوپر جا رہا تھا۔ دولت آ رہی تھی نئے دور کے نئے تقاضے اپنائے جا رہے تھے۔ پرانی قدریں ٹوٹ رہی تھیں۔ نئے افق ابھر رہے تھے ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی کا فرسودہ اور ناپسندیدہ فعل

ترک کر دیا گیا تھا۔ یوں اس حد تک کٹ جانے کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ کہ ہر کوئی اپنی ہی ذات کے خول میں سمٹ گیا تھا۔ اپنے غم اپنی خوشیاں اور اپنے ہی جذباتی تقاضے تھے۔ جن میں مخل ہونا دوسرا آداب کے خلاف سمجھتا تھا۔

سارہ نے زوبی آپا کے آجانے سے جو خلا پھیلتا محسوس کیا تھا۔ وہ بھی ایک دوسرے سے کٹ جانے کا احساس تھا۔ جو خلا بن کر پھیلتا ہی چلا جا رہا تھا۔ بیگانگی بڑھتی جا رہی ظاہرہ طور پر سب ایک دوسرے کے قریب تھے۔ لیکن یہ قربتیں فاصلوں پر محیط ہوتی جا رہی تھیں

بیگانگی اور کٹ جانے کے احساس کو مٹانے کے لئے سارہ نت نئی سہیلیاں بناتی تھی۔ ان کے گھروں میں جاتی انھیں اپنے گھر بلاتی۔ چھوٹی موٹی پارٹیاں دیتی۔ پکنک کے پروگرام بناتی اور یوں زندگی میں در آنے والی تشنگی کو مٹاتی رہتی۔

سونیا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ سارہ اور سونیا میں میل ملاپ بے تکلفی کی حد تک بڑھ گیا تھا۔ فنکشنز میں شرکت۔ ہوٹلوں میں گھومنا اور کلبوں میں جانا سونیا کا کام تو تھا ہی۔ یہ دعوت سارہ تک بھی پھیلنے لگی۔

اور

ایک ایسی ہی دعوت نے شاہد کا سونیا سے تعارف کروایا تھا۔

میرے کزن ہیں۔ بہت ہی دلچسپ انسان ہیں۔

شاہد نے بے باک نظروں سے سارہ کو دیکھا تھا تو وہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گئی تھی۔

سارہ جیسی معصوم اور بھولی بھال لڑکی کو دام میں لانا کچھ مشکل کام نہیں تھا۔ سارہ بے شک فیشن ایبل تھی۔ لوگوں سے ملتی جلتی تھی۔ ابو کے دوست اور زوبی آپا کے عزیز سبھوں سے ملنا ہوتا تھا۔ پھر بھی ذہنی طور پر انتہائی سادہ اور بھولی بھالی تھی۔

شاہد گھاگ شکاری تھا۔ ایک ہی نظر میں قدر و قیمت جان لی تھی۔ اور پھر دونوں میں دوستی اور بے تکلفی بڑھنے لگی تھی۔

سونیا نے ایک کاروباری وسیلے سے یہ کام سرانجام دیا تھا۔ لیکن سارہ لاعلم تھی۔ انجانی لڑکی محبت پر ایمان لے آئی تھی۔ شاہد کو پسند کر لیا تھا۔ اور یہ پسند تیزی سے مراحل طے کرتے محبت کی بلندیوں کی طرف پرواز کر رہی تھی۔

شاہد سونیا ہی کے قماش کا آدمی تھا۔ دونوں میں مراسم تھے۔ لیکن کچھ وقت گذرنے کے بعد دونوں کو احساس ہو گیا تھا۔ کہ معاملہ یوں نہیں چلے گا۔ وہ دوسرے کو دے گا ہی کیا جو خود ضرورت مند ہو اور ہاتھ پھیلائے رکھتا ہو۔

سونیا نے شاہد سے وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ اس کی دوستی اور شادی کسی دیکھی بھالی دولتمند لڑکی سے کرا دے گی۔ جس سے دوستی اور شادی دونوں ہی سودمند ہو سکتی ہوں۔ پہلے اس کی نظر میں آصفہ آئی تھی۔ جو اس کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ اور اب بھی میل ملاقات کبھی کبھی ہو جاتی تھی۔

لیکن

آصفہ کے سلسلے میں کامیابی کی توقع زیادہ نہ تھی۔ اس کے دو بھائی اور مما ڈیڈی سوسائٹی کے جانے پہچانے لوگ تھے۔ آصفہ کے گرداگرد لوگ آہنی حصار بھی تھے۔

اس کے برعکس سارہ کے حالات اس دوستی کے لئے انتہائی سازگار تھے۔

گھر میں سے کسی کی روک ٹوک نہ تھی۔ لاڈلی تھی اکلوتی تھی۔ اور باپ لاکھوں سے شاید کروڑوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

سونیا کا اس کا صلہ شاہد سے اکثر و بیشتر وصول کر لیتی۔ شادی ہو جانے کی صورت میں تو بہت بڑی منفعت۔ کا امکان نظر آ رہا تھا۔

سارہ ان سب باتوں سے لاعلم تھی۔ انجانی راہوں پر شاہد کے سہارے بڑی تیزی سے

بڑھ رہی تھی۔

شاہد کو دو ایک بار اس نے گھر پہ بھی بلایا تھا۔ ابو سے بھی ملایا تھا اور زوبی آپا سے بھی دونوں میں سے کوئی بھی معترض نہ ہوا تھا۔

یوں دونوں ملنے لگے تھے۔ سونیا اکثر ساتھ ہوتی۔ لیکن کبھی کبھی شاہد اور سارہ اکیلے پکچر پہ بھی چلے جاتے۔ چائے پینے بھی کسی چھوٹے سے ریسٹورانٹ میں جا گھستے۔ وہ ایک بار دوستوں کے دیئے گئے فنکشنز پہ بھی شاہد نے سارہ کو مدعو کیا تھا۔ ان سب باتوں کے لئے سارہ ابو سے اجازت لینے کی پرانی رسم اب بھی ضرور پوری کر لیتی تھی۔ آج بھی وہ سونیا اور شاہد کے ساتھ ابو کی اجازت لے کر ہی آئی تھی۔ وہ جانتی تھی ابو انکار بھی کریں گے ہی نہیں اپنی بیٹی پہ پورا اعتماد تھا۔ یا اس کے وجود سے بیگانگی کچھ بھی تھا۔ سارہ کو انہوں نے کبھی نہیں روکا ٹوکا تھا۔

جوں جوں اس ور پہ وہ بے تعلقی کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔ سارہ دوستوں اور سہیلیوں کی طرف زیادہ ہی بڑھ رہی تھی۔ شاہد تو اس کی زندگی کا وہ محور بن رہا تھا۔ جس کے گرد وہ تیزی سے آنکھیں بند کر کے گھومنا چاہتی تھی۔

لیکن بے تکلفی اور چاہت کے اس بے پناہ اظہار کے باوجود سارہ رکھ رکھاؤ کی قائل تھی۔ شاہد جتنی حدود میں جتنا بڑھنا چاہتا تھا۔ سارہ نے اس کی کبھی اجازت نہ دی تھی۔ وہ ایسا موقع آنے کا موقع ہی نہ دیتی اور کبھی شاہد کی تگ و دو اور لگن سے موقع آ بھی جاتا۔ تو جال پھیلا ہی رہ جاتا اور سارہ غڑاپ سے پھسل اور مچھلی کی طرح نکل جاتی

وہ کھسیانا ہوتا

اور

سارہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔

محبت کے نظریے کے اس تضاد پہ دونوں اکثر الجھ جاتے۔ شاہد تہذیب نو کا دلدادہ

تھا۔ سونیا کی طرح وہ بھی کسی اصول اور ضابطے کا پابند نہ ہونے کا قائل تھا۔ فطرت آزاد ہے
اور جنس انسانی جسم کی فطری ضرورت۔ وہ اس اصول کا سختی سے قائل ہونا چاہتا تھا۔
جنس کی فطری مانگ سے انکار سارہ کو بھی نہ تھا۔ لیکن وہ اس سلسلے میں حد بندی کی
شدت سے قائل تھی۔ شادی آخری حد تھی۔ وہ کہتی تھی۔ اگر انسان جذبات پر قابو نہ رکھ
سکے تو انسان نہیں حیوان ہے۔

انسان اور حیوان میں یہی فرق اسے نمایاں لگتا تھا۔

ریت پر دبے دبے قدموں سے چلتے دونوں ٹیلے تک جا پہنچے۔ دودھیا چاندنی
کے غبار میں سمندر ریت چٹانیں اور کالا آسمان سب کچھ ہی دلکش لگ رہا تھا۔
سارہ نے جوتے اتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ اور ٹیلے کا سہارا لیتے ہوئے بیٹھ گئی

"یہاں نہیں۔" شاہد نے ناپسندیدگی سے کہا۔

"تو اور کہاں"

"یہاں بہت روشنی ہے"

"بھلی لگتی ہے"

"لوگ بھی آجا رہے ہیں"

"تو کیا ہوا"

"اچھا نہیں لگتا"

"برا بھی نہیں لگتا۔ شاہد صاحب۔ تشریف رکھئے"

"اداس ہوں۔ اٹھو"

"اداس ہوں۔ بیٹھو"

شاہد پٹپٹایا تو سارہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔ اور ٹیلے کا ٹیک لے کر نیم دراز ہوگئی۔

"یہ جگہ بالکل موزوں نہیں سارہ۔ دوسری طرف چل کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں تو یوں لگتا

ہے جیسے سر بازار بیٹھے ہیں۔

"کوئی بات نہیں۔ چاندنی اور سمندر کا لطف ہی لینا ہے نا۔ یہاں سے دیکھیں۔
لہروں کی یورش کتنی دلفریب لگتی ہے۔

باتونی بہت ہو" شاہد بُرا سا منہ بناتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ سارہ نے
اس کے ہاتھ سے ٹیپ ریکارڈر لے لیا۔ اور اپنی پسند کے گانے تلاش کرنے لگی
شاہد چند لمحے تو روٹھا روٹھا بیٹھا رہا۔ پھر باتیں کرنے لگا۔ موسم کی باتیں دفتر
کی باتیں دوستوں کی باتیں اور مستقبل کی باتیں۔

کب تک انتظار کرنا ہے" مجھے اس نے سارہ سے مدہوش کے عالم میں سوال
کیا۔

"ابو سے پوچھیں" سارہ نے ہنس کر کہا۔

"آپ تو کرنا ہی پڑے گی بات"

"اپنی امی کو بھیجو نا"

"تمہاری نزدیکی آپا آجائیں۔ پہلا کام یہی کروں گا۔ لیکن ڈرتا ہوں"

"کس بات سے۔"

"آپکے ابو نے کہیں ریجیکٹ کر دیا تو"

سارہ نے مسرت بھری مسکراہٹ لبوں پہ لاتے ہوئے کہا" تو پھر صبر شکر کر کے
بیٹھ جائیے گا"

"سارہ"

"اور کریں بھی کیا"

"بات مذاق میں نہیں اڑاؤ۔ مجھے تسلی دو۔ تسکین دلاؤ۔ تاکہ میں اعتماد سے قدم
آگے بڑھا سکوں"

شاہد نے کچھ ایسی بے صبری اور التجا سے کہا۔ کہ سارہ سنجیدہ ہوگئی۔

"سارہ تم مجھے نہ ملیں۔ تو یقین کرو۔ میں اپنے آپ کو اپنی بپھرتی لہروں کے سپرد کر دوں گا۔

"شاہد یوں نہ کہیے" وہ گلوگیر سی ہوگئی "مجھے یقین ہے کہ ابو میری پسند رد نہیں کرینگے"

"سارہ" فرط جذبات سے مغلوب ہو کر شاہد نے سارہ کا ہاتھ تھام لیا۔

سارہ نے دوسرے ہاتھ سے محبت سے شاہد کا ہاتھ تھپتھپایا۔ شاہد نے پیار سے سارہ کو اپنی طرف کھینچا۔

اگر وہ سنبھل نہ جاتی تو اس کے سینے سے ٹکرا جانا بعید نہ تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے پرے ہٹ گئی۔

وہ جی بھر کر باتیں کرتے رہے۔ شاہد سارہ کے معاملہ میں سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ ٹھنڈی چاندنی میں یہ ٹھنڈی سی لڑکی اس کے حواس پہ پوری طرح چھا رہی تھی۔

بوند بوند پڑتی بارش ایک دم موسلا دھار برسنے لگی تھی۔ مال پہ خراماں ٹہلتے لوگوں میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ کوئی لباس بچانے کو سر پہ ہاتھ رکھے دوڑ رہا تھا۔ کوئی سر جھکائے دوڑ رہا تھا۔ دکانوں کے برآمدے بھر گئے تھے۔ جہاں کہیں ذرا سی بھی بچاؤ کی صورت نظر آتی لوگ گھسے چلے آ رہے تھے۔ ریسٹورانٹ ہوٹل سبھی بھر چکے تھے۔ سیٹیں پُر تھیں۔ اور درمیانی جگہ پہ لوگ کھڑے تھے۔ دروازوں تک لوگ جیسے ٹھنسے ہوئے تھے۔

سیٹوں پہ اطمینان سے بیٹھے لوگ شیشے کی دیوار کے پار بارش اور لوگوں کی بھاگ دوڑ دیکھ رہے تھے۔ چائے کافی اور آئس کریم کے دور چل رہے تھے۔ کھڑے ہونے والے اپنے بھیگے کپڑے جھاڑتے ہوئے ادھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کہ شاید کسی کونے کھدرے میں کوئی جگہ بیٹھنے کے لئے مل ہی جائے۔

ضیا بھی ان لوگوں میں تھا۔ جو بارش کے قطرے بالوں اور کوٹ پر سے رومال سے پونچھتے ہوئے جگہ کے لئے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اس کا نیا دھاریدار خوبصورت کوٹ پہلے ہی دن بارش سے خراب ہو گیا تھا۔

بارش دھواں دھار تھی۔ بادل اور دھند بہت نیچے اتر آئے تھے باہر سڑک پر جگمگانے والی ٹیوب لائٹیں اندھی اندھی ہو رہی تھیں۔ تیز پاور کے بلب بے رنگ سے گولے نظر آ رہے تھے۔

ہوٹل کے اس خوبصورت ترین ہال میں تیز روشنیوں کا دودھیا غبار پھیلا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی کا دلنواز ترنم بارش کے شور میں گھل رہا تھا۔ اندر کی فضا نسبتاً گرم تھی۔ اور ہلکی ہلکی گرمی کا احساس باہر کی کپکپاہٹ کے مقابلے میں بہت خوشگوار لگ رہا تھا۔

ضیا کے لئے موسم کا حسن اور ہال کی دلفریبی کوفت کا باعث بن رہی تھی۔ اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ کہ خواہ مخواہ ایسے سمے میں گھر سے باہر آگیا۔ کوٹ کے ستیاناس ہو جانے کا بھی افسوس ہو رہا تھا۔

ضیا نے پھر ہال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ جھنجھلاہٹ پہلے ہی اعصاب پر سوار تھی جگہ نہ ملنے سے اپنا آپ سبک لگ رہا تھا۔ وہ تو آج خاص اہتمام سے تیار ہو کر آیا تھا بیٹھے لوگوں پر خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا۔ کتنے اطمینان سے بیٹھے تھے۔ باتوں میں کس دلجمی سے مشغول تھے۔ ٹھنڈی گرم چیزوں کے ساتھ بے فکری سے شغل کر رہے تھے کوئی کھڑے ہونیوالوں کو جگہ ہی دے دیتا۔

ضیا کوٹ صاف کر کے بالوں کو ہاتھوں سے درست کرتے ہوئے ایک ایک میز کا جائزہ لینے لگا۔ وقت گذاری کا بہترین طریق ان سب لوگوں کا جائزہ لینا تھا۔ وہ ناقدانہ نظروں سے سب کو دیکھنے لگا۔

کسی میز پہ دوستوں کا جمگھٹا تھا۔

کسی پر خاندان کے افراد جمع تھے۔

کہیں نئے بیاہتا جوڑے ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔

اور

کہیں بوائے فرینڈز کے ساتھ گھر والوں سے چھپ چھپ کر ملنے والی لڑکیاں براجمان تھیں۔

اچانک

ضیا کی نگاہیں دائیں ہاتھ کے آخری میز پہ اٹک گئیں۔

شیشے کی دیوار کے قریب والی کرسی پہ وہ خاتون بیٹھی تھی۔ جس کے ساتھ اس کا تین دنوں سے ذہنی رابطہ تھا۔

خوشی کی ایک جوشیلی لہر اس کے رگ وپے میں دوڑ گئی اس نے دوبارہ ادھر دیکھا وہ بھی ادھر دیکھ رہی تھی۔

ضیا کے لبوں پر یونہی مسکراہٹ بکھر گئی۔

اس خاتون نے اچنبھے سے اس مسکراہٹ کو دیکھا۔

ضیا نے رُخ دوسری طرف موڑ لیا۔

اور جب۔

کئی لمحوں بعد اس نے پھر گردن موڑی تو نگاہیں خاتون کی نگاہوں سے ٹکرا گئیں۔ خاتون کی نگاہوں میں بڑی انوکھی لیکن بڑی واضح چمک تھی۔

آج وہ اس میز پہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے والی کرسی خالی تھی۔ شاید اس کا خاوند یا ساتھی اٹھ کر کہیں گیا تھا۔ کیونکہ کھڑے ہونے والوں میں سے کوئی بھی خالی کرسی کی طرف نہیں بڑھا تھا۔

تعارف کا اچھا موقعہ تھا۔

ضیا نے سوچا۔ کرسی پہ بیٹھنے کے بہانے ادھر جائے۔ خاتون سے پوچھے کہ سیٹ خالی ہے؟

یوں جگہ نہ بھی ملی تو اس سے باتیں کرنے کا موقعہ تو مل سکے گا۔

ضیا تذبذب کے عالم میں چند لمحے کھڑا ادھر ہی دیکھتا رہا۔ خاتون سے کئی بار اس کی نگاہیں ملیں۔ اچنبھے کی کیفیت اب ان آنکھوں میں نہ تھی۔ بلکہ ستائش کا ہلکا سا تاثر تھا۔ اعتماد کا پرتو بھی تھا۔ اور خوشی کی لو بھی۔

ضیا ابھی کوئی فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا۔

کہ

خاتون نے مسکراتے ہوئے اسے ہاتھ سے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

ضیا کچھ بوکھلا سا گیا اور پھر اپنے دائیں بائیں یوں دیکھا آیا وہ عورت کسی اور کو تو نہیں بلا رہی ؟

لیکن اس نے پھر سر کی ہلکی سی جنبش سے اشارہ کیا۔

جواباً سر اثبات میں ہلایا گیا۔

ضیا خالی جگہوں پر کھڑے لوگوں کو شائستگی سے ہٹاتا راستہ بناتا اس میز تک پہنچ گیا جہاں وہ خاتون بیٹھی تھی۔

"آپ نے مجھے بلایا" ضیا نے قدرے جھکتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹھیے۔" اس نے مسکرا کر میز کے دوسری طرف پڑی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"سیٹ خالی ہے۔ ؟ ضیا نے پوچھا۔

"ہوں۔ وہ ہلکی سی آواز نکالتے ہوئے بولی۔

"شکریہ" ضیا کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس نے محسوس کیا۔ کہ بہت سی نظریں اس پر چاروں طرف سے پڑی تھیں۔ اور اتنی تیز تھیں۔ کہ وجود میں اترتی محسوس ہوتی تھیں۔ خاص کر ان لوگوں کی۔ جو غالباً یہ خالی کرسی دیکھ چکے تھے۔ لیکن وہاں بیٹھنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔

شاید اجنبی اور اکیلی عورت کے ساتھ بیٹھنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔

یا

اس کے حسن اور اس کی امارت سے مرعوب ہو گئے تھے۔ کہ قریب آنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا تھا۔

مسرت وخفت کا ملا جلا احساس تھا۔ ضیا اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ایک بھرپور نظر

اس پر ڈالی۔

کتھئی رنگ کی خوبصورت ساڑھی میں خاتون کا گداز جسم لپٹا ہوا تھا۔ سڈول اور پھسلنی بازوؤں کی سنہری سنہری ڈھلانیں ننگی تھیں۔ سیاہ موٹا اور نرم سٹول اس کے بازوؤں سے کھسک کر پیچھے کی طرف ہو گیا۔ اس کی گردن میں ہلکا سا تناؤ تھا۔ رعب حسن تھا یا اپنے منفرد ہونے کا احساس۔ وہ اک خاص شان سے بیٹھی استغنائی علامت لگ رہی تھی۔ دودھیا روشنی میں اس کا حسین چہرہ بڑا ہی پروقار لگ رہا تھا۔ اس کے سیاہ بالوں کی بناوٹ بھی چہرے کے وقار میں اضافہ تھی۔ اس کی عمر بتیس تنتیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ نوخیز لڑکی نہ تھی نہ ہی نوجوان دوشیزہ۔ لیکن وہ بھری پری مکمل عورت ضرور تھی۔ اس کی آنکھوں میں ان دیکھی دنیا کے تصورات نہیں تھے۔ بلکہ ان آنکھوں کی مستی میں تجربات کا نچوڑ نشہ بن کر ڈول رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی وقت کے قدموں نے آڑھے ترچھے نشان ضرور چھوڑے ہوں گے۔ لیکن خود اعتمادی اور احساس حسن نے ان نقوش کو دھندلا دیا تھا۔ اس کا خوبصورت صندلی چہرہ بے داغ تھا۔ اور جدید طریق کے میک اپ نے اسے حسین سے حسین تر بنا رکھا تھا۔

سٹول پیچھے کھسک رہا تھا۔ ساڑھی کا پلو بھی ڈھلک رہا تھا۔ اور اس کے کھلے گریبان سے قدرے سریانی کا تاثر ملتا تھا۔ لیکن وہ اس طرف متوجہ نہیں تھی۔ گداز بدن کی حشر سامانیوں کا ارادی اور غیر ارادی اہتمام تھا شاید۔

ضیا توصیفی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے ذہن میں اسنکراہ کھول رہا تھا۔ وہ اب پورے تیقن سے کہہ سکتا تھا۔ کہ یہ وہی عورت ہے جسے وہ مہو نجیدہ دیکھ چکا ہے۔

"پہاڑ کا موسم بھی کتنا غیر یقینی ہوتا ہے" وہ بولی۔ ضیا کو یوں لگا جیسے نقرئی گھنٹیاں ایک ساتھ بج اٹھی ہوں۔ اتنی خوبصورت آواز اس نے شاید پہلی بار سنی تھی۔

"جی۔ واقعی۔"

"جب میں یہاں آئی۔ تو مطلع بالکل صاف تھا۔

"میں بھی گھر سے نکلا تو بارش کا امکان نہیں تھا۔"

"تو یہ کیسی خوفناک بارش ہے۔"

اس نے بادل کی گرج اور بجلی کی ہولناک کڑک سے ڈر کر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ بجلی کی چمک سے سڑک اور اس کے پار کا علاقہ لمحہ بھر کے لئے روشن ہو گیا۔

"یہ پردے کھینچ نہ دیں" اس نے جلدی سے کہا۔

"میں کھینچ دیتا ہوں" ضیا نے اٹھ کر پردہ کھینچ دیا۔

"شکریہ" وہ مسکرائی۔

ضیا اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اب اس میں خود اعتمادی آگئی تھی۔ وہ اس کے سامنے یوں بیٹھ گیا۔ جیسے اس سے سات آٹھ برس چھوٹا نہیں اس کا ہم عمر ہو۔

چند لمحے دونوں موسم کی بے تکی باتیں کرتے رہے۔ باتوں کے دوران وہ آر پار ہو جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کبھی کبھی تو ضیا کو یوں محسوس ہوتا۔ جیسے وہ بڑی ناقدانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے اسے پرکھ رہی ہے جانچ رہی ہے۔

"آپ چائے پسند کریں گی یا کافی" ضیا نے قدرے توقف سے کہا۔

"اوہ نہیں۔ شکریہ میں چائے پی چکی" وہ مسکرا کر بولی۔

"پھر بھی۔" ضیا نے اصرار کیا۔

"ضرور پینا پڑے گی؟" وہ ضیا کی آنکھوں میں نشیلی آنکھوں کا جادو انڈیلتے ہوئے بولی۔

"ضرور۔" ضیا کو اس کا انداز بہت اچھا لگا۔

بہرے کو چائے اور ساتھ چند لوازماتی چیزیں لانے کا آرڈر دے کر ضیا پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بہرے سے باتیں کرتے ہوئے وہ خاتون کی جوشیلی نظروں کو اپنی رگ پے میں اترتے محسوس کر رہا تھا۔

"آج آپ یہاں اکیلی بیٹھی ہیں۔ آپ کے شوہر ساتھ نہیں" ضیا نے بات کرنے کی غرض سے کہا خاتون کے چہرے پر ہلکے سے اذیت کے آثار نظر آئے۔

یوں

جیسے چپکے سے کوئی نشتر جگر میں اتر جائے اور درد کا احساس ہونے سے پہلے ہی نکل جائے۔

جیسے دل کی کانپتی لو ایک لمحہ کو بجھتی محسوس ہو۔ لیکن دوسرے لمحے پھر سے جھلملانے لگے۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ ہی یہاں آئی ہوں" اس نے بڑے شوق سے ضیا کو دیکھا۔

"میں علم نجوم جانتا ہوں" وہ بھی خوش دلی سے بولا۔

"ہوں" اس نے ادائے ناز سے سر کو ہلکی سی جنبش دی "یہ بڑی خوشی کی بات ہے میرے متعلق تو بہت کچھ بتا سکتے ہوں گے آپ"

یقیناً وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ ذو معنی تھی۔

خاتون ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی "کیا جانتے ہیں میرے متعلق"

ضیا اس کی سنجیدگی سے کچھ گڑبڑا سا گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ خاتون پر کوئی بھی ایسا لمحہ منکشف ہو جائے۔ جو اس ملاقات کے انجام کا باعث بنے۔ ذہین اور معاملہ فہم تو تھا ہی۔ ہنس کر بولا "یونہی کہہ رہا تھا۔ خاتون۔ ویسے روز آپ کو مال پر دیکھتا تھا

جو صاحب آپکے ساتھ ہوتے تھے۔ میں ان کو آپکا شوہر سمجھے ہوئے تھا۔"

"وہ اطمینان سے کرسی پر پیچھے کو ہٹ گئی۔"

"تو گویا آپ ہمیں مال پر دیکھتے رہے ہیں"

"جی ہاں۔ تین دن سے متواتر دیکھ رہا ہوں"

"حیرانی کی بات ہے"

"کیا؟"

"میں نے آپ کو ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا"

ضیا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر خوشدلی سے بولا "یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ کہ خواہ مخواہ ہی نظر آجائیں۔ اور کچھ ہم جیسے۔ کہ ہوں بھی تو دکھائی نہ دیں۔"

وہ بڑے دلآویز انداز میں ہنس پڑی۔ ضیا کی فطری شوخی اور جلد بے تکلف ہو جانے کی عادت اُسے اچھی لگی۔

"یہ ہوں بھی تو نظر نہ آئیں" اس نے برق پاش نظروں سے ضیا کی طرف دیکھا اور زیر لب بڑبڑائی۔

"بالکل"

"حد ہے انکساری کی"

"من آنم کہ من دانم۔"

"بہت بنتے ہیں آپ"

"وہ کیسے؟"

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی بیرا چائے کی ٹرے اور دوسری چیزوں کا سٹینڈ لے آیا۔ ضیا نے ساری چیزیں میز پہ اس کے سامنے رکھ دیں۔

باہر بارش جھنجلا جھنجلا کر برس رہی تھی۔ بادلوں کی ہیبت ناک گرج پہاڑ کے نشیب وفراز میں گونج رہی تھی۔ بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ ننگے خنجروں کی طرح لہرا لہرا کر بادلوں کے دل چھید رہی تھیں۔

ہال کے اندر موسیقی کا ترنم تھا۔ ہلکے سروں میں کوئی بڑی ہی دلفریب دھن بج رہی تھی۔ چائے کی پیالیاں کھنک رہی تھیں۔ لوگوں کی سرگوشی نما آوازیں مل جل کر موسیقی میں گھل رہی تھیں۔ تاثر پھر بھی خوشگوار ہی تھا۔

ضیا نے چائے بنائی۔

اور

پیالی اس کے آگے کر دی۔

رنگین ناخنوں والی لمبی لمبی پوروں سے اس نے پیالی کو چھوا اور چائے اپنے سرکا لی۔

"شکریہ" وہ بولی۔

"شکر خود ڈال لیجئے" ضیا نے چینی دان آگے بڑھایا۔

"شکریہ" اس نے پیالی نزاکت سے اٹھاتے ہوئے کہا "میں شکر نہیں پیتی۔"

ضیا نے چینی دان رکھ دیا اور اپنی چائے میں چمچ چلانے لگا۔

اکا دکا پرلطف اور ذومعنی جملوں کے درمیان چائے حلقوں سے اترنے لگی۔

ضیا بہت مسرور نظر آرہا تھا۔

شاید اتنے دنوں کی تنہائی کا ردعمل تھا۔ خاتون خاصی مہذب تھی۔ اس کی گفت وگو سلجھی ہوئی تھی۔ ذومعنی جملے کہنے میں مہارت رکھتی تھی۔ آنکھوں اور ابروؤں کے لطیف اشارے اس کی گفتگو کا اہم حصہ تھے۔

ضیا اس کی شخصیت سے مرعوب ہو رہا تھا۔

لیکن

یہ مرعوبیت اپنی جگہ الجھ بھی رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اتنی مہذب ایسی شائستہ اور اتنی وضع دار عورت کے کردار کا رُخ اتنا گھناؤنا بھی ہو سکتا ہے۔

گھناؤنے پن کا وہ عینی شاہد تھا۔ ورنہ اس بات کو وہ سختی سے جھٹلا دیتا۔ ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ اور چائے کا دور چلتا رہا۔

بارش کا زور ٹوٹنے لگا۔ بادل ہلکے ہو کر اوپر اٹھتے جا رہے تھے۔ پھوار اب بھی پڑ رہی تھی۔ گھن گرج میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی۔

بیرہ بل لایا

تو

ضیا سے پہلے ہی اس خاتون نے اپنا بیگ کھولا اور نوٹ بیرے کی طرف بڑھا دیا

"نہیں جی نہیں" ضیا نے مداخلت کی

"کوئی بات نہیں" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"نہیں محترمہ۔ بل میں دوں گا" اس نے بیرے سے نوٹ واپس لینے کو ہاتھ اٹھایا تو خاتون نے اپنا نرم و گداز ہاتھ ضیا کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

ضیا کو جھٹکا سا لگا۔ یوں جیسے کئی سو کلو واٹ بجلی کے تار سے چھو گیا ہو۔

وہ بڑے دلفریب انداز سے مسکرائی "آج میری باری۔ کل آپ کی"

اس کا ہاتھ ضیا کے ہاتھ پہ تھا۔ وہ ہلکے ہلکے اسے تھپتھپاتے ہوئے بات کر رہی تھی۔

ضیا پہ مدہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کہ کیا ہو رہا ہے قطرہ قطرہ نشہ اس کے اندر اتر رہا تھا۔ رگوں میں سلگاؤ تھا جلنے کی کیفیت تھی۔

خاتون نے بظاہر سادہ سی بات کہی تھی۔ لیکن کل کی ملاقات کی نڈر اور بے باک

دعوت صاف تھی۔

آخر ہم صرف کانوں ہی سے تو نہیں سنتے صرف آنکھوں ہی سے تو نہیں دیکھتے۔ بعض اوقات تو ہم اپنے رویئں رویئں سے سنتے اور دیکھتے ہیں۔ انگ انگ کھلی ہوئی آنکھ ہوتا ہے۔ عضو عضو قوت سماعت لئے ہوتا ہے۔

کئی لمحے گذر گئے۔

ضیا نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور وہ آسودگی سے کرسی میں ایک طرف کو جھک کر بیٹھ گئی۔

ضیا نے سنبھل کر بھرپور نگاہوں سے اس خاتون کو دیکھا۔ وہ اسے دریا میں پھینکا ہوا جال لگی۔ مضبوط جال۔ جس سے کسی بھی مچھلی کا بچ نکلنا ممکن نہیں ہوتا مچھلی اپنی پھسلنی خاصیت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے تو ہو جائے، ورنہ عام حالات میں بچنے کا امکان نہیں ہوتا۔

"آپ نے بل دے کر بہت زیادتی کی ہے" خاموشی کو توڑتے ہوئے ضیا بولا

"اتنی بری بڑی بات نہیں صاحب۔" وہ روشنیوں کے ہالہ زار زاویوں کی زد میں بیٹھے بیٹھے متانت سے بولی:

"مجھے اچھا نہیں لگا"

"کل حساب چکا دیجئے گا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتی ہوں"

"ضیا اسکی مسکراہٹ سے مرعوب ہو گیا۔ خود بھی مسکرانے لگا۔ یوں جیسے دیئے کی لو سے دوسرا دیا جل اٹھے۔

دونوں پھر باتیں کرنے لگے۔

"آپ ملازمت کرتے ہیں" خاتون نے پوچھا۔

ضیا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پڑھتے ہیں"

اس نے پھر نفی کے انداز میں سر ہلایا۔

"بزنس"

"نہیں"

"امیرزادے ہیں"

"وہ ہنس پڑا" یہ آپ نے کیسے کہہ دیا"

"ملازمت بھی نہیں کرتے۔ پڑھتے بھی نہیں۔ بزنس سے بھی سروکار نہیں۔ تو لے دے کے یہی بات رہ جاتی ہے۔ پہاڑ پہ تفریح کے لئے ایسے میں کون آتا ہے"

اس نے شانوں کو بڑی جذبات خیز جنبش دی۔ باپ دادا کی دولت پہ عیش کرنے والے امیرزادے ہی ہو سکتے ہیں۔

ضیا نے بے ساختہ ماتھے پہ ہلکا سا ہاتھ مارتے ہوئے سر کو دائیں بائیں ہلایا وہ اس کی اس ادا پہ جیسے لوٹ پوٹ گئی۔

"کیوں۔ غلط ریڈنگ ہے میری" وہ بولی

"بالکل" ضیا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا" معمولی آدمی ہوں خاتون۔ ایک دوست کے ہاں آیا ہوں۔ ورنہ پہاڑ کی تفریح سے میری کوئی نسبت نہیں"

"کرتے کیا ہیں آخر" اس نے زور دے کر پوچھا۔

بیکار ہوں ان دنوں"

گویا تعلیم سے فارغ ہو چکے ہیں"

"جی ہاں۔ پی سی ایس کا امتحان پاس کر کے جاب کا انتظار کر رہا ہوں"

"خوب میرا بھی یہی خیال تھا"

"کہ میں پی سی ایس ہوں"

"پی سی ایس تو خیر میں جان نہ پائی۔ لیکن یہ سمجھنے میں قطعی دقت نہ ہوئی۔ کہ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں"

"شکریہ شکریہ" ضیا نے جیسے کسی ملکہ عالیہ کے حضور کورنش بجا لاتے ہوئے کہا۔

وہ زیر لب مسکرائی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن کہتے کہتے رک گئی۔

اب بارش بالکل تھم چکی تھی۔ ہوٹل میں پناہ لینے والے لوگ باہر نکل رہے تھے میز خالی ہو رہے تھے اور کھڑے تھک جانے والوں میں سے کئی ان پہ براجمان ہو رہے تھے۔

چلنا چاہیے بارش تھم چکی" خاتون نے پیچھے کو کھسکا ہوا اسٹول اٹھا کر کندھوں پہ ڈالا۔ ساڑھی ٹھیک کی۔ بالوں کو ہلکے ہلکے ہاتھوں سے درست کیا۔ اور بیگ سنبھالتے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ضیا کو یوں لگا جیسے عورت نہیں قیامت اٹھ کھڑی ہوئی ہو۔ ضیا نے جلدی سے آنکھیں جھکا لیں۔ کسی مہکتی دہکتی قربت کا تجربہ اس انداز سے اس کے لئے بالکل نیا تھا۔

نیا

انوکھا

لیکن حد درجہ تسکین بخش۔

دونوں ہوٹل سے باہر نکلے۔ تھوڑے سے وقت میں دونوں بے تکلفی کی بہت سی مسافتیں طے کر چکے تھے۔

"مجھے میرے ہوٹل تک چھوڑ آئیے" خاتون نے اس کے قریب کھڑے ہو کر کہا۔

"بہت اچھا" ضیا بولا۔ اور اس کے ساتھ چل دیا۔ کسی پالتو جانور کی طرح۔

وہ دروازہ کے باہر ہی رک گیا۔

"آیئے" خاتون نے کمرے میں داخل ہو کر پلٹ کر دیکھا۔

"بس۔ اب اجازت چاہوں گا" وہ باہر کھڑے کھڑے بولا۔

"کہیں اور اپوئنٹمنٹ ہے"۔

"نہیں۔ نہیں تو۔"

"پھر کیا کریں گے ابھی سے گھر جا کر۔ آپ نے بتایا تھا۔ کہ ان دنوں آپ اکیلے ہیں۔

"جی۔ ہوں تو سہی"

"پھر آیئے۔ زیادہ وقت تو نہیں ہوا۔ جلدی سونے کے عادی ہیں۔؟"

"نہیں"

خاتون اس کا منہ تکنے لگی۔ اتنا وجیہہ باوقار نوجوان اس کی روح کے تاروں کو مسلسل چھیڑ رہا تھا۔

"ڈرتے ہیں اندر آتے ہوئے" وہ ادائے دلربائی سے بولی۔

"جی ہاں" وہ شوخی سے بولا۔

"اندر اندھیرا بھی نہیں۔ اور میں چڑیل بھی نہیں لگتی منہ سے" اس نے ہنس کر "آجایئے۔"

ضیا پر جیسے کوئی نشیلی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ کمرے کی روشن نیلاہٹوں میں وہ چمک رہی تھی۔ بیگ اور سٹول اس نے بیڈ پر پھینک دیا تھا۔ اس کے جسم کے سارے خطوط۔ سارے زاویے اب کھلی نظروں کی پوری زد میں آسکتے تھے۔

اس نے پھر بڑے محبت بھرے اصرار سے ضیا کو اندر آنے کی دعوت دی۔ جو وقت کے سینے میں گڑے ہوئے کسی واقع کی طرح دروازے سے باہر جم کر کھڑا تھا۔

بھیگی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کہیں کہیں سے آسمان ننگا ہو گیا تھا۔ اور نکھرے ہوئے ستارے جھلملا رہے تھے۔ اونچے اونچے درختوں کی پھنگوں میں اٹکے بارش کے قطرے ہواؤں کے ریلے سے گر رہے تھے۔

"اچھا۔ تو بہت بہت شکریہ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ اس کے چہرے کی جگمگائی روشنیاں جیسے ایکدم گل ہو گئیں۔ دروازے کا پٹ بند کرنے کو اس نے ہاتھ بڑھایا۔

لیکن

دروازہ بند نہ کر سکی۔

ضیا کسی غیر ارادی خیال کی طرح کمرے کے اندر آگیا۔ وقت کی فیاضی کو رد کرنا اسکے بس میں نہ رہا۔ وہ کسی معمول کی طرح تھا۔ جس کے بس میں عامل کی مرضی کے خلاف جانا ممکن نہیں ہوتا۔

وہ قاتلانہ انداز میں مسکرا دی۔ قاتلانہ انداز فاتحانہ بھی تھا۔ وہ بہت مطمئن نظر آنے لگی "بیٹھے" ضیا کو پیار سے دیکھتے ہوئے وہ بولی۔

ضیا نے سرسری نگاہ کمرے پر ڈالی۔ ہوٹل کا شاید یہ بہترین کمرہ تھا۔ نیلے اور پنک رنگ کے قالین پر نیلے بیڈ اور نرم نرم صوفے کے ساتھ سٹول اور پنک پردے تھے وہ ایک صوفے پر قدرے سمٹ کر بیٹھ گیا۔

خاتون اس کے سامنے چھوٹے سے سٹول پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر گھٹنے کے گرد ہاتھوں کی گرفت بناتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"آپ کا نام۔ حیرانی کی بات ہے"، کہ میں نے اب تک آپ کا نام ہی نہیں پوچھا۔"

"مجھے ضیا کہتے ہیں"

"بعض لوگ نام رکھنے میں بہت حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ آپ کا نام آپ ہی طرح خوبصورت ہے۔"

"واقعی بہت پیارا نام ہے"

"آپ کو کس نام سے مخاطب کر سکتا ہوں"

"مجھے؟" اس نے سینے پر لمبے ناخن والی انگلی رکھتے ہوئے پر اسرار مسکراہٹ سے پوچھا۔

"جی ہاں" ضیا مخمور نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کچھ کہہ سکتے ہو" وہ ادائے دلربائی سے بولی۔

"جی ۔!"

"کچھ کہہ سکتے ہو۔ کوئی نام دے سکتے ہو" وہ اٹھتے ہوئے مسکرائی۔

"میں سمجھا نہیں" وہ اس پر اسرار سی عورت کو حیرانگی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ضیا۔ نام کیا ہے۔ یہ تو ایک صوتی اشارہ ہے کسی کی شخصیت کو منفرد کرنے کا۔" وہ اپنے پاؤں پر خوبصورتی سے گھوم گئی۔

ضیا کو خاتون بے حد پر اسرار لگ رہی تھی۔

لیکن

اسرار ہی میں تو حسن ہوتا ہے۔ وہ دلچسپی سے اسے تکنے لگا۔

"مجھے کوئی نام دے لو ضیا۔ کسی نام سے پکار لو" وہ بے تکلفی پر اترتے ہوئے بولی۔

ضیا کی دلچسپی اور بڑھی، آگے بڑھتے اسراروں میں الجھنے کا ڈر تو تھا۔ لیکن وہ اس کشش سے انحراف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جو اسے سومنات کے بت کی طرح خلا میں معلق رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ضیا کھلی کھلی آنکھوں سے اسے تکے جا رہا تھا۔

"ہوں۔ تو تم میرا نام پوچھ رہے تھے"

"جی"

"نہ پوچھو تو۔"

"اب تو جاننے کی خواہش شدید ہو گئی ہے۔"

"وہ ہنس دی۔

ضیا کو یوں لگا جیسے کہیں قریب ہی نقرئی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں چند لمحے وہ چپ چاپ بیٹھا صرف اسے تکتا رہا۔

پھر

سنبھلا۔ اپنے آپ سے وہ تو کٹ کر دور ہوتا جا رہا تھا۔ سر کو ہلکی سی جنبش دیکر اس نے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔ کوٹ کی جیب سے رومال نکالا۔ ناک منہ اور پیشانی کو پوچھا

اور

پورے پورے حواس میں آکر اس کو دیکھنے لگا۔

یہ عورت کیا شے تھی؟ وہ سوچ رہا تھا۔ عمر میں اس سے سات آٹھ بلکہ نو دس سال بڑی ہوگی۔ وہ اسے آپا۔ باجی یا بہن جی کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔ لیکن یہ الفاظ اسکی زبان پر آ ہی نہ پاتے تھے۔

جانے ان الفاظ کا تقدس اس خاتون پر فٹ نہ بیٹھتا تھا۔ یا ضیا کے جواں جسم کے جنسی تقاضے ان الفاظ کی ادائیگی میں مانع تھے۔ لیکن اس حقیقت سے انحراف کی گنجائش

نہ رہی تھی۔ کہ خاتون اپنی ساری کشش ساری جاذبیت اور سحر کاری سے اس کے دل و دماغ پہ مسلط تھی۔

اسے اپنے چھوٹے پن کا احساس ہو رہا تھا۔ نہ عورت کے بڑے پن کا اس وقت صرف اس کا اپنا آپ تھا۔ جو صرف مرد تھا۔ جذبات سے بھرپور مرد۔

اور

خاتون عورت تھی۔

جو چھوٹی تھی نہ بڑی۔ عمر کی قید سے آزاد۔ آسودگی راحت و تسکین کا سرچشمہ۔

تم کہاں کے رہنے والے ہو۔" عورت نے مدھر خاموشی کو توڑا۔ اپنے حسن کی سحر کاریوں کی کامیابی سے وہ کچھ اور چمک اٹھی تھی۔

"جی میں" ضیا کی آنکھیں جھپکتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔"

پاکستان میں رہتا ہوں۔ کہیں کا سمجھ لیجئے" ضیا نے اس کا وار اسی پہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرانے لگی۔

"میں بتاؤں"

"ہوں"

"لاہور کے رہنے والے ہو؟"

"نہیں بتاؤں گا"

"اوہو"

"آپ اپنا نام نہیں بتاتیں۔ میں مقام نہیں بتاؤں گا اور شکر ہے میں نے آپ اپنا اصلی نام نہیں بتایا" ضیا نے خاتون کے نام نہ بتلانے پہ احتیاطاً جھوٹ بولا۔

وہ ننھا سا قہقہہ بکھیرتے ہوئے اس کے صوفے کے قریب آکر قدرے جھکتے ہوئے بولی تمہارا نام ضیا ہو یا کچھ اور اس سے پھر کیا فرق پڑے گا۔ مجھے تمہارے وجود کی پہچان کیلئے کوئی لفظ ہی استعمال کرنا ہے۔ کوئی بھی سہی، اسی طرح میرے بھی کئی روپ ہیں، جانتے ہونا عورت کے کئی روپ ہوتے ہیں جو روپ پسند ہو اسی سے پکارلو۔" میری بات آپ بڑی خوبصورتی سے گول کر رہی ہیں" ضیا نے صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا "خیر کوئی بات نہیں"

وہ سیدھی ہو کر پیچھے ہٹی اور پھر بدمست شرابی کی طرح لہراتے ہوئے ہنس دی۔

ضیا چند لمحے چپ رہا پھر جیب سے سگریٹ نکالا۔

"اجازت ہے" اس نے ڈبیہ سے سگریٹ نکالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے جیب سے لائٹر ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور۔ پیو۔ مجھے بھی پلاؤ" اس نے اس انداز میں کہا۔ جیسے ضیا سے سگریٹ نہیں اس کی جوانی کا نشہ پینے کا اصرار کر رہی ہو۔

ضیا اب اس کی بے تکلفی اور جذبات انگیز باتوں سے مانوس ہو چکا تھا۔ اس کا فطری اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ بڑے بے تکلفانہ انداز میں باتیں کرنے لگا تھا۔

اس نے انگلی میں پکڑا سگریٹ اسے تھما دیا۔ دوسرا سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔

خاتون نے انگلیوں کی پوروں میں چند لمحے سگریٹ گھمایا پھر منہ میں رکھتے ہوئے ضیا کے ہاتھ میں جلنے والے لائیٹر پہ جھک گئی۔

ضیا نے اپنا سگریٹ بھی سلگا لیا۔ اور کش لیتے ہوئے بے تکلفی سے دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔

بل کھاتے دھوئیں کے پار اس خاتون کا چہرہ وہ بڑی عمیق نظروں سے دیکھ رہا تھا

وہ پھر اس کے سامنے سٹول پر آ بیٹھی۔
اس انداز سے کہ اس کے گھٹنے ضیا کے گھٹنوں سے ٹکرانے کی نوبت آسکنے کا امکان تھا۔

ضیا قدرے پیچھے ہٹ گیا۔ اور گوشۂ چشم سے خوبصورت نظروں کے وار خاتون پر ہونے لگے۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ضیا نے پھر اس کا نام پوچھا۔

"کوئی روپ نہیں اچھا لگتا میرا۔" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھتے ہوئے سگریٹ کا دھواں ضیا کے چہرے پر چھوڑ دیا۔

ضیا وارفتگی کے عالم میں آگے کو ہوا۔ لیکن جلد ہی محتاط ہو کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولا

"آپ پر وہ راز میں رہنا چاہتی ہیں۔ عورت کے روپ کا محض چکر دے رہی ہیں۔"

"قطعاً نہیں۔ یہ کہیے کہ آپ کو عورت کا کوئی روپ نہیں اچھا لگتا؟" اس نے پھر دھواں ضیا کے چہرے پر پھینکا۔

"لگتا ہے۔" ضیا شوخ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کونسا" اس نے بے صبری سے پوچھا۔

"ماں بہن اور بیٹی کا۔" ضیا نے بھرپور شوخی سے کہا۔

"شریر" وہ خفیف سی ہو کر بولی۔

"پھر بتایئے نام۔ میں بھی اپنا نام بتاؤں گا" اس نے پھر عورت کو اپنے نام کے سلسلہ میں چکر دینے کی کوشش کی۔

"اچھا۔ سوچنے دو۔"

"سوچنے کی کیا ضرورت ہے"

"ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے آپ مجھے اپنا اصلی نام نہیں بتائیں گی۔"

"خاصے ذہین ہو۔"

"بتایئے سوچے بغیر۔ اصلی اصلی نام۔"

"شہلا۔"

"آگئے۔"

"شہلا رفیق۔"

"شکریہ" ضیا نے کہا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا۔ کہ عورت نے اپنا اصلی نام نہیں بتایا ہوگا۔

"بس" وہ راکھ جھاڑتے ہوئے بولی۔

"تو وہ صاحب رفیق تھے۔" ضیا نے جان بوجھ کر کہا۔

"کون؟"

"جنہیں دو تین دن سے آپ کے ساتھ دیکھتا رہا ہوں۔"

"اوہ۔ ہاں۔ ہاں۔"

"آپ کے شوہر۔؟"

خاتون نے سر اثبات میں ہلایا۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ حقیقت کی نفی کر رہی ہے
ضیا نے کن انکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ جواب کسی طور مسرور نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے کوئی پاور فل بلب دھند کی لپیٹ میں آیا ہوا ہو۔

ضیا نے دانستہ گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ خاتون سے اتنا بے تکلف نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ اس کی نجی زندگی کے بارے میں کھل کر باتیں کر سکے۔ سچائیاں اگلوا سکے اور حقیقتوں کے چہرے بے نقاب کر سکے۔

وہ یہ بھی جانتا تھا۔ کہ خاتون اپنا آپ چھپانے کے لئے قدم قدم پر بڑی سچائی سے

جھوٹ بھی بول سکتی ہے۔

وقت گذرنے کا احساس ضیا کو ہوا نہ خاتون کو۔ دونوں نے اپنی اپنی ذات سے ہٹ کر بہت سی باتیں کیں۔

ضیا نے محسوس کیا کہ شہلا اچھی خاصی سلجھی ہوئی عورت ہے اس کی معلومات کا ذخیرہ کافی وسیع ہے۔ معاملہ فہم بھی ہے اور ذہین بھی۔

ضیا نے اس کے متعلق باتوں ہی باتوں میں بہت کچھ معلوم کر لیا۔ عورت حد درجہ محتاط تھی۔ کھل کر سامنے نہیں آئی۔ اشارے کنایوں ہی سے ضیا نے کہانی مرتب کر لی۔ ضیا نے اپنے جرمنی کے دورے کا دانستہ ذکر کیا۔ اس طرح سے اس کے بیرونی دوروں کی بات اگلوا کر اس نے اپنے یقین کو اور پختہ کر لیا۔ لیکن عورت پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کہ وہ اسے پہلے سے جانتا ہے اور میونخ میں مل چکا ہے۔

خاتون نے بتایا کہ وہ ایک بار نہیں کئی بار باہر جا چکی تھی۔ اس کے شوہر کا بہت وسیع کاروبار تھا۔ اور اکثر کاروبار سلسلے میں وہی باہر جاتی تھی۔ جاتی سردیوں میں اس نے میونخ میں ہفتہ بھر قیام کیا تھا۔

ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ جب ضیا اس کے کمرے سے باہر نکلا کل رات کھانا اکٹھے کھانے کا وعدہ کر کے ضیا لوٹا تو لبالب بھرے پیمانے کی طرح تھا۔

عورت جیسی بھی تھی۔ دلچسپ ضرور تھی۔ اس کی صحبت سے وہ مخمور ہوا تھا۔ اب کسی بدمست شرابی کی طرح لہراتا ہوا اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہا تھا۔

رمضو کو جگا کر اس نے دروازہ کھلوایا۔ نیند غلبے میں رمضو جان نہ سکا۔ کہ رات کا ایک بجنے والا ہے۔

ضیا اپنے کمرے میں آیا۔ وہ مخمور سا تھا۔ گنگناتے ہوئے اس نے کپڑے بدلے اور بستر میں گھس گیا۔

آصفہ کی تصویر پر نظریں پڑیں۔

مجرمانہ سا احساس اس کے دل میں ابھرا۔ جلدی سے ٹیبل لیمپ کا بٹن آف کرتے ہوئے اس نے سر کمبل کے اندر کر لیا۔

" دوستی بُری چیز تھوڑا ہی ہے۔ اس نے سوچا اور اپنے اور خاتون کے ایک روزہ تعلق کو اس دائرے میں مقید کرتے ہوئے اپنے آپ کو مطمئن کرنے لگا۔

اس کے دل و دماغ پہ خاتون ہی کا وجود چھایا ہوا تھا۔ آصفہ اس پھیلے ہوئے وجود کے پیچھے گئی تھی۔

یہ احساس وقتی بھی۔ تھا ضرور۔ وہ اس عورت کے گلیمر اور چارم میں کھو چکا تھا رات اس نے بڑے بڑے سنہری رنگین رنگین خواب دیکھے۔

اور

دن چڑھے تک بے خبر پڑا سوتا رہا۔

"سنبھل جاؤ صاحبزادے"

"وہ آگ ہے۔ آگ! اسے پکڑو گے تو جل جاؤ گے"

"باز آجاؤ۔ اس کے متعلق سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس دیوانگی سے اس کی طرف بڑھ رہے ہو۔"

"دوستی کے لبادے میں اپنے جذبات چھپا کر اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دو۔"

"ہرج کیوں نہیں۔ وہ ایسی دلدل ہے جس میں تم پھنس گئے۔ تو پھر پھنستے ہی چلے جاؤ گے۔ نکلنا ممکن نہ ہوگا۔

"اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہو۔ تم محض وقت گذاری کے لئے اس کے پاس نہیں جاتے"

"سب کو دھوکہ دے سکتے ہو۔ اپنے آپ کو نہیں"

اس سے ملنے کا خیال ذہن سے نکال دو۔ تم آصفہ کی خاموش چاہت کا اقرار کر چکے ہو یہ آصفہ سے زیادتی ہے۔ اک ان چھوئی معصوم لڑکی سے زیادتی دل کی دنیا کا سب سے بڑا جرم ہے۔

"اور پھر آصفہ ہی نہیں۔ تمہاری امی بھی کراچی جا رہی ہے۔ سارہ۔ امی کی پہلی اور آخری تمنا ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

ضیا شہلا کے پاس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ذہن میں خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے

اپنے چاروں طرف طنز کے تیروں کی بوچھاڑ محسوس ہو رہی تھی۔ دل کی آواز دماغی استدلال کو سختی سے ٹھکرا رہی تھی۔ اس کے شوق جنوں میں تیزی آ رہی تھی۔ آصفہ کی تصویر خاموش استدعا تھی۔ لیکن وہ اس طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ جو لمحہ گرفت میں ہے وہی سب کچھ ہے گرفت سے نکلا ہوا لمحہ بچھڑ جاتا ہے۔ اسے پھر سے پکڑا نہیں جا سکتا۔ کوئی خوشی اس سے چھینی نہیں جا سکتی۔ کوئی غم اُسے لوٹایا نہیں جا سکتا۔ وہ گرفت میں آئے ہوئے لمحے سے استفادہ کرنا چاہتا تھا۔
خاتون اچھی تھی یا بری: مقناطیس کا سمندر تھی۔ وہ خود بخود اس کی جانب کھنچا رہا تھا۔

"دوستی میں کیا برائی ہے" اس نے جھلا کر کہا۔ لیکن اس آواز کے ساتھ ہی اس کے اندر کے سناٹوں میں طنز بھرے قہقہے کی صدا گونج گئی۔

جھلا کر اس نے چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ تکیہ کہیں پھینکا کمبل کہیں۔ اتارے ہوئے کپڑے بھی گول کر کے کرسی پر پھینک دیئے۔ کرسی کو ٹھوکر ماری۔ میز پرے دھکیلا۔

اور

آصفہ کی تصویر الٹ دی

وہ ذہنی طور پر منتشر ہو رہا تھا۔ دوسروں سے تو اپنے آپ کو چھپانا بڑا آسان ہوتا ہے۔

وہ کتنی ہی دیر کرسی کی پشت پر سر رکھے شش و پنج کے عالم میں رہا اندر ہی اندر جنگ کی سی کیفیت تھی۔ کبھی آصفہ سامنے آ رہی تھی۔ کبھی امی سارہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی طرف بڑھا رہی تھیں۔

لیکن

ان سب سے الگ تھلگ وہ خاتون تھی۔ جس کی مسکراہٹیں لو دے رہی تھیں۔ جس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ جو ایک کھلی دعوت تھی۔ ایک پیغام تھی۔ ایک تحریک تھی

اس نے سر اٹھایا۔

اور

خاتون کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ آج شاید پہلی بار اسے اپنی مردانہ وجاہت کا احساس ہوا۔ وہ چند لمحے اپنے پیکر کو دیکھتا رہا۔

اور پھر ذہن سے ہر خیال جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ خاتون سے ملنے کی خوشی اس کے خون کی گردش کو تیز کر رہی تھی۔ اسے اس اعتراف میں اب کوئی باک نہیں تھا۔ کہ خاتون کی شخصیت کا جادو اس پہ پوری طرح اثر کر چکا ہے۔ اور وہ اسے پسند کرنے لگا ہے۔ اس جادو سے اس پہ مدہوشی طاری ہو رہی ہے۔ اور یہ مدہوشی کسی طور اسے بری نہیں لگ رہی۔

ہم نے اپنے تڑختے ہوئے وجودوں کو خوش رنگ خولوں میں چھپا رکھا ہوتا ہے عارضی سہاروں سے سنبھالا دیا ہوتا ہے۔ بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں خوشنما خول ان دھچکوں سے ٹوٹ کر گر نہ پڑیں اور ہمارے تڑختے ہوئے وجودوں کی اصلیت واضح نہ ہو جائے۔

لیکن جب ہم بے باک ہو جائیں۔ نڈر بن جائیں۔ سچائی کو گلے لگا لیں۔ حقیقت سے آنکھیں ملا لیں۔ تو پھر کوئی خوف ہم پہ مسلط نہیں ہوتا۔ تڑختے ہوئے وجودوں ہی سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ انھیں ہی عظیم سمجھنے لگتے ہیں۔

یہی حال کچھ ضیا کا تھا۔

وہ ڈر کی کیفیت سے گزر چکا تھا۔ خوف کی آگ پھاند چکا تھا۔ گھبراہٹ کی محرابوں تلے سے گزر چکا تھا۔ لمحوں میں جیسے صدیوں کے فاصلے کوئی پھاندتا چلا جائے۔

اُس کے قدم پورے اطمینان اعتماد اور مسرت سے بڑھ رہے تھے۔ وہ برملا کہہ

دینے کو تھا۔ کہ کوئی چیز اچھی نہیں ہوتی۔ کوئی چیز بری نہیں ہوتی۔ اچھائی اور برائی کی جمع تفریق ہم خود کرتے ہیں۔ اپنے خیالات اپنے حالات اور ماحول کی قدروں کی روشنی میں کرتے ہیں۔ وہ بچہ نہیں۔ سمجھدار ذہن معاملہ فہم انسان ہے۔ اس کی سوچ اور اس کی فکری صلاحیتیں اس کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔

رات والے کمرے کے دروازے پہ ہوٹل کا ملازم کھڑا تھا۔

”ضیا صاحب“

اس نے ضیا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی پوچھا۔

”ہوں“

”بیگم صاحبہ اندر منتظر ہیں۔“

”اچھا۔“

وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ اور ضیا دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔

کمرہ روشنیوں کے جذبات انگیز غبار سے پر تھا۔ پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک فضا میں رچی بسی تھی۔

کمرے کی شمالی دیوار کے ساتھ بیڈ تھا۔ جس پہ وہ سینے تک گلابی کمبل ڈالے نیم دراز تھی۔ نرم نرم تکیوں میں اس کا آدھا وجود دھنسا تھا۔ پنک رنگ کی بغیر آستین کے میکسی میں اس کے سنہری شانوں اور خوبصورت سینے کی نامکمل سی ستر پوشی ہو رہی تھی۔ پنک تاروں سے جھلملاتا لباس صرف دیدہ زیب ہی نہیں جذبات انگیز بھی تھا۔

سائیڈ ٹیبل پہ سگریٹ اور ایش ٹرے رکھی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے بیشمار سگریٹ پھونک ڈالے ہیں۔ ایش ٹرے ننھے ننھے بجھے ہوئے سگریٹوں سے بھری تھی۔ اور راکھ اڑ اڑ کر ٹیبل کی شفاف سطح کو گدلاتے ہوئے تھی۔

سامنے صوفے کے آگے پڑی میز پہ موسمی پھل۔ کچھ ڈرائی فروٹ اور سویٹس رکھی تھیں۔

ضیا نے دروازے کے قریب رُک کر کمرے پر نگاہ ڈالی۔ پھر اس کی نظریں بیڈ پر پڑیں
"آجاؤ" وہ بیڈ میں قدرے اونچے ہوتے ہوئے تکیئے سے ٹیک لگا کر مسکراتے ہوئے
خوش آمدیدی انداز میں بولی۔ کمبل ہٹ گیا تھا۔ اور اس کے سینے پر لباس کی جھلملاہٹ
کچھ زیادہ ہی چکا چوند پیدا کرنے لگی تھی۔

بیڈ کے قریب رکھی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولی، "بیٹھو۔"

ضیا کے اندر ہی اندر جنگ کی سی کیفیت پھر سے بیدار ہو گئی۔ اسے یوں لگا جیسے
غلط جگہ پہ آگیا ہے۔ وہ تو بے داغ کردار رکھتا تھا۔ ایسا بے باک تجربہ اس نے کب
کہیں کیا تھا۔ معصوم معصوم لڑکیوں سے کبھی کبھی دل لگی کی باتیں کر لیں۔ کسی دوشیزہ کو
کانوں تک سرخ ہوتے دیکھ لیا۔ یا حیا سے پلکیں اٹھاتے گراتے دیکھ کر دل تھام لیا۔
شوخی میں آیا تو کسی کا ہاتھ تھام لیا۔ یا دور کھڑی دوشیزاؤں کا ہوائی بوسہ لے لیا۔

یہاں تو معاملہ بہت آگے نکل چکا تھا۔ اس قماش کی عورت سے دوستی کر کے
اس نے اچھا تو نہیں کیا تھا۔

اگر اُسے آصفہ یہاں دیکھ لے۔

یا

امی ہی کو پتہ چل جائے تو۔

تو۔

"تو کچھ نہیں ہوگا" اس نے ایک بار پھر ظاہرداری کا خول توڑ دیا اور اپنی خواہش شوق
اور امنگ کے ہاتھوں بکا ہوا انسان بن گیا۔

معاف کرنا میں بستر میں ہوں۔" وہ سگریٹ کی ڈبیہ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"طبیعت خراب ہے کیا" ضیا نے پوچھا۔

بس کچھ یہی سمجھ لو۔ رات پوری طرح نیند نہ آئی۔ وہ نشیلی خمار آلود آنکھوں کو

اٹھاتے ہوئے بولی۔

کیوں ہو" ضیا مسکرایا۔

یونہی۔ بیقراری سی رہی رات بھر۔" اس نے سگریٹ ضیا کو پیش کیا۔

"شکریہ" ضیا سگریٹ لے کر بولا۔

شہلا نے بھی سگریٹ نکالا۔

ضیا نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے لیا۔

"کیوں" وہ حیران ہوئی۔

"بہت پی چکی ہیں۔" ضیا نے سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ" اس نے جلے ادھ جلے بےشمار سگریٹ دیکھے۔

"بسیار نوشی اچھی نہیں ہوتی" ضیا مسکرایا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا" وہ گہرا سانس لے کر بولی "لاؤ میرا سگریٹ۔"

"اوں ہوں" ضیا نے سگریٹ میز پر رکھ دیا "چلئے میں بھی نہیں پیتا۔"

"میرا ساتھ دینے کو" اس نے نظروں کا سارا فسوں لٹاتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل" ضیا نے قدرے تن کر کہا اور سگریٹ میز پہ ڈال دیا۔

"تمہارے اس فعل سے مجھے قطعاً خوشی نہیں ہوئی" وہ سر کے نیچے دونوں ہاتھ
رکھ کر چھت کو دیکھنے لگی۔

"ہونی تو ضرور چاہیے" ضیا مسکرا کر بولا۔ خاتون نے گردن قدرے موڑی اور نیم باز
آنکھوں سے ضیا کو دیکھنے لگی۔

"آپ خود پینے والی ہیں۔ آپ کو پتہ ہے۔ کہ ہاتھ میں آیا سگریٹ واپس رکھ دینا
کتنی بڑی بات ہے۔" ضیا نے مزاحیہ انداز میں کہا "بہت بڑی قربانی۔ آپ لازمی طور پر
خوش ہوں گی۔

"خوشی اس لیئے نہیں ہوئی ۔ کہ میں جانتی ہوں ۔ یہ قربانی وقتی ہے ۔ عارضی اور برائے نام ۔" وہ جلدی سے بولی ۔

"یہ آپ کیوں کر کہہ سکتی ہیں ۔" ضیا پہلو بدل کر بولا ۔

"میرا تجربہ تم سے کہیں زیادہ ہے دوست ۔" اس نے سگریٹ اٹھاتے ہوئے پوچھا

"آپکا تجربہ کیا کہتا ہے مادام ۔" ضیاء نے سگریٹ اٹھاتے ہوئے پوچھا ۔

"کہ ہم کسی کے لئے کچھ نہیں کرتے ۔ کسی سے محبت نہیں کرتے ۔ کسی کے لئے نہیں مرتے صرف اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں ۔ اپنے وجودوں سے اپنی خواہشوں سے اپنی تمناؤں سے اپنی آرزوؤں سے ۔ ہمارے لئے صرف اپنا آپ ہے ۔ اور کچھ نہیں ۔" اس نے آنکھیں بند کئے کئے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں کہا ۔

ضیا سگریٹ سلگائے بغیر اسے ہونٹوں میں دبائے دم بخود سا اس کی باتیں سنتا رہا ۔

"کیوں ۔" وہ ایکدم کمبل ہٹا کر اٹھ بیٹھی ۔

ضیا اس کی طرف تکتا رہا ۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ "میری باتوں سے تم بور ہونے لگے ہو ۔"

"نہیں ۔ نہیں تو ۔" ضیا غور سے اسے دیکھ رہا تھا ۔ جانے کیوں آج وہ اسے چال نہیں لگ رہی تھی ۔ وسیع گہرا اور ساکن سمندر دکھائی دے رہی تھی ۔ جس کی وسعت گہرائی اور ٹھہراؤ میں ہزاروں طوفان چھپے ہوئے ہیں ۔

آج بھی کل کی طرح وہ نگاہوں کی خیرہ سامانی کے وہی تیکھے انداز اپنائے تھی ۔ اس کا حسن جاں سوز تھا ۔ اس کے لباس کا ستر پوشی کے سلسلہ میں نامکمل پن بذات خود ایک خوبصورتی تھا ۔

لیکن آج وہ کچھ اداس لگ رہی تھی ۔ بے چین افسردہ اور بیقرار ۔ ایک مسئلے کی طرح

الجھی ہوئی ۔ ایک سوال کی طرح جلتی ہوئی ۔

وہ بستر سے اٹھی ۔ اس کی سفید سفید پنڈلیوں سے میکسی ہٹی ہوئی تھی اس نے پاؤں میں سلیپر پہنے اور خود ہی سگریٹ اٹھاتے ہوئے بولی "آؤ ۔ ادھر صوفے پر بیٹھتے ہیں تم یقیناً بے آرام بیٹھے ہو ۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں ۔" وہ اس کے حسین سراپا کو غور دیکھتے ہوئے بولا ۔

"کچھ کھاؤ پیو گے نہیں ۔"

ان تکلفات کی ضرورت نہیں ۔ آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی ۔ بستر میں لیٹ جایئے ۔" ضیا نے بیٹھے بیٹھے کہا ۔

وہ بیڈ کے سرے پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی ۔ ضیا نے لائٹر سے اس کا سگریٹ سلگا دیا ۔

ماحول کی اکتاہٹ کو دور کرنے کے لئے ضیا قدرے مسکرایا اور بولا "آج آپ چپ چپ کیوں ہیں ۔ اداس ہیں کیا ۔"

اس نے ہونٹوں کا سکڑا ہوا دائرہ بناتے ہوئے سگریٹ کا دھواں ضیا کی طرف پھینکا ۔

"رفیق صاحب یاد آ رہے ہیں ؟" ضیا نے از راہ مذاق کہا ۔

"کون رفیق ۔" وہ ایک دم چونکی ۔

"شہلا رفیق صاحبہ ۔" ضیا نے ہنس کر کہا ۔ ایک ایک لفظ پر اس نے الگ الگ زور دیا ۔"

"اوہ ۔" وہ بے دم سی ہو گئی ۔ ایک ٹک ضیا کو دیکھتی رہی ۔ وہ مزے سے سگریٹ پیتا رہا ۔

"میں جانتا تھا آپ نے مجھے اپنا نام غلط بتایا ہے ۔ اپنا بھی اور اپنے شوہر کا بھی ۔"

ضیا کچھ دیر بعد سنجیدگی سے بولا۔

" بڑے ذہین ہو۔" اس نے پیار سے ضیا کو دیکھا" چالاکی کی حد تک ذہین۔"

" مانتی ہیں نا۔" ضیا چہکا۔

" ہوں"

"کیوں غلط نام بتایا تھا۔"

" مستور رہنا چاہتی ہوں"

" لیکن میں آپ کا اصلی نام جاننا چاہتا ہوں"

"کیا فرق پڑے گا۔ شہلا نہ ہوئی فوزیہ ہوئی۔ فوزیہ نہ ہوئی حمیدہ ہوئی۔ تم اتنے مشتاق کیوں"

" کیوں"

" تاکہ آپ کا اصلی چہرہ دیکھنے کی امید بندھ جائے۔"

وہ چپ ہوگئی۔ لمبے لمبے کش لے کر اس نے سگریٹ ختم کر ڈالا پھر اسے ایش ٹرے میں پھینکتے ہوئے مسکرا کر بولی" میرا اصلی چہرہ دیکھ کر کیا کرو گے"

" معلومات میں اضافہ" ضیا نے فوراً کہا۔

" وہ پھر چپ ہوگئی۔ ہنسی نہ مسکرائی سنجیدہ ہوگئی۔

ضیا نے اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں پھینک دیا۔ کرسی پہ پہلو بدلا اور پھر دائیں ہاتھ پڑی میز پہ رکھا میگزین اٹھا لیا۔

رسالہ سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے ضیا خاتون کی نظروں کی حدت و شدت پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

وہ بستر میں پھر پہلے سے انداز میں نیم دراز ہوگئی۔

" آپ برا مان گئیں۔" ضیا کن انکھیوں سے اس کی ہر حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔

" کوئی اور باتیں کرو ضیا" اس کروٹ بدل کر رُخ ضیا کی طرف کر لیا" اپنے آپ سے ہٹ کر۔ عام سی باتیں۔ دوسروں کی باتیں۔ بے تعلق سی باتیں"

" آپ یقیناً بُرا مان گئیں۔"

" نہیں"

" پھر"

" تم کریدنے پہ ضدی بچے کی طرح کیوں اڑے ہو۔"

" یہ انسانی فطرت ہے۔"

" اسے دبایا بھی جا سکتا ہے۔" اس نے بیڈ کی پٹی پہ تکیہ رکھتے ہوئے سر اس پر ٹکا دیا۔ پھر مسکرا کر بولی" ضروری تو نہیں۔ کہ ہم تم ایک دوسرے کے سامنے اصلی روپ میں آئیں۔ دوستی کا بھرم یوں بھی تو رکھا جا سکتا ہے؟"

" دوستی کچھ اصولوں کی تابع بھی ہونی چاہیے۔"

" لیکن میرا اصول ہے۔ کہ۔"

" او۔ اصول۔ اصول" وہ جھلا کر بولی" یہ سب زندگی پر چڑھائے ہوئے خول ہیں ضیا۔ ورنہ ہر انسان اندر سے بالکل بے اصولا ہے۔ تم بتا سکتے ہو۔ کہ ایک اجنبی عورت کے پاس تنہائی میں کس اصول کے تحت ملنے آئے ہو۔"

ضیا ایک لمحے کو بوکھلایا" پھر مسکرا کر بولا۔

" تو آپ صیغہ راز میں رہنے پر مصر ہیں۔"

" راز میں حسن ہوتا ہے ضیا۔ مستور شے مجھے اچھی لگتی ہے۔ اسرار بھید۔ سب خوبصورت صیغے ہیں۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان بند آنکھوں کا فسوں کھلی آنکھوں سے بھی کہیں زیادہ تھا ضیا کے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ ان خوبصورت آنکھوں کو ہونٹوں سے چھولے

لیکن وہ جرأت نہ کر سکا۔ کتنی دیر خاموشی چھائی رہی۔

پھر وہ چت لیٹ کر دونوں ہاتھ سر تلے رکھتے ہوئے ضیا کو گوشہ چشم سے دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بولی "ضیا۔ میں یہاں اجنبیوں کی بھیڑ میں گم ہو جانے کو آتی ہوں۔ اجنبیوں سے ملنے آتی ہوں۔ اجنبیوں سے گھل مل جاتی ہوں۔ اور پھر اجنبیوں ہی کی طرح بچھڑ کر ہمیشہ کے لئے اجنبی بن جاتی ہوں۔ یہ میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ میں کسی کے متعلق کچھ زیادہ جاننا چاہتی ہوں نہ اپنے متعلق بتانا۔"

وہ سر اٹھا کر ضیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "کہو ان بنیادوں پہ دوستی کر سکتے ہو؟"

"نہیں۔" ضیا نے آہستگی سے کہا۔

"کیوں" وہ مستفسرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں اجنبی رہنا نہیں چاہتا۔ میں بچھڑ کر اجنبیوں کی بھیڑ میں گم بھی نہیں ہونا چاہتا" ضیا چھوٹے سے ضدی بچے کی طرح معصومیت اور ضد کے ملے جلے جذبات سے بولا۔

وہ دم بخود سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر جیسے قطرہ قطرہ آنسو اس کے حلق میں اترنے لگے۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ "تمہاری ضد بچگانہ ہے۔"

"کچھ بھی سہی"

"بہت بھولے بھالے ہو۔ لیکن فراخدل نہ بن سکو گے۔"

"جی۔ کیا مطلب؟

"تم جیسے بہت کچھ لئے دئے رہنے والے مرد کبھی فیاض نہیں ہوتے۔"

"کس معاملے میں؟"

"بتا دوں گی۔"

"ابھی بتائیے"

"بے صبر مت بنو"

وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ضیا اس کی باتوں سے کچھ بھی سمجھ نہ پایا۔ وہ چند لمحے ٹانگیں لٹکا کر جھل مل جھل مل کرتا رہا۔ وہ ضیا کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی یہ مسکراہٹ جانے کیوں زخمی اور خون آلود لگ رہی تھی۔

ضیا بے چین ہو رہا تھا۔

"ضیا"

"جی"

"ایک بات پوچھوں"

"ضرور"

"یہ بتاؤ۔ تمہیں، تمہیں مجھ سے مل کر خوشی ہوئی ہے"

"یقیناً"

"کتنی؟"

"بہت زیادہ۔ حد سے زیادہ۔ بے حساب۔"

وہ سر جھکائے دکھ سے مسکرائی۔ پھر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں معمول والی کھنک نہیں تھی۔

"تو پھر۔ ضیا" اس نے دھیمے دھیمے لہجے میں کہا "اس خوشی کو خوشی رہنے دو۔"

"میں کوڑھ مغز ہوں۔ اشاروں کنایوں کی زبان نہیں سمجھ سکتا۔ کھل کر بات کیجئے مجھے ذہنی کوفت ہو رہی ہے۔"

"میرے متعلق جاننے کی کبھی خواہش نہ کرنا۔ ورنہ تمہاری خوشی مر جائے گی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

ضیا جان گیا۔ اس کی دکھی مسکراہٹ نے اسے بڑا دکھ دیا۔ ایکدم جی چاہا کہ کہہ دے

جو باتیں تم صیغہ راز میں رکھنے پر مصر ہو۔ میں جانتا ہوں۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود
کسی غیر مرئی طاقت نے مجھے تمہارے قریب کر دیا ہے۔ میں بہت فیاض ہوں۔ میں
نے تمہاری ساری اخلاقی گراوٹوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ساری کمزوریوں کو درگذر کر دیا ہے
اسی لئے تو تمہاری طرف اتنی جرأت سے بڑھا ہوں۔ یہ نظر اندازی اور درگذری کے جذبات
ہی متقاضی ہیں۔ کہ تم مجھے اپنے متعلق سچ سچ بتا دو۔ کوئی پردہ کوئی راز نہ رہے"

وہ شاید اس سلسلے میں کچھ کہہ بھی دیتا۔ کہ خاتون نے گھنٹی بجا دی۔ چند لمحوں بعد
ہوٹل کا ملازم آگیا
اور
اس نے کھانا اسی کمرے میں لے آنے کا اسے آرڈر دے دیا۔

رات دھواں دھواں تھی۔ بادلوں کی یلغار پھر سے ہونے لگی تھی۔ نچلی ڈھلانوں پر
کہیں بادل زور سے ٹکرائے تھے اور بجلی کے لپکے قد آور درختوں کو چھو گئے تھے۔
ہوائیں تند تھیں اور فضا میں شور سا گھلا تھا۔

موسم کی تبدیلی سے بے نیاز ضیا اور خاتون صوفے پہ قریب قریب بیٹھے تھے
کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا تھا۔ ایک دفعہ کافی بھی پی جا چکی تھی۔ اب تیسری
دفعہ خاتون نے چائے بنوائی تھی۔

چائے کے خالی برتن میز پہ ہی پڑے تھے۔ اور خالی پیالیوں میں اب سگریٹ
کی راکھ جھاڑی جا رہی تھی۔ بچے ہوئے ٹکڑے پھینکے جا چکے تھے۔

انسان بھی عجیب و غریب شے ہے۔ کبھی تو برسوں ایک دوسرے کے ساتھ
رہ کر بھی بیگانگی کی دیواریں نہیں گراتا۔ اور کبھی لمحوں میں اتنا اپنا بن جاتا ہے کہ بیگانگی
انگشت بدنداں رہ جاتی ہے

وہ ہلکی پھلکی گفت و گو بھی کرتے رہے۔ ثقیل باتیں بھی ہوئیں۔ سیاست بھی زیر بحث
آئی اور حالات حاضرہ پر بھی تبصرے ہوئے۔

وقت گزرتا گیا۔ خاتون کو احساس ہوا نہ ضیا کو۔

ضیا حیران بھی تھا۔ کہ قربت کی یہ کونسی منزل ہے۔ کہ سب کچھ جاننے کے باوجود
ہو اس خاتون کے لئے جو نشیلی محبت اور چاہت کے جذبات سینے میں موجزن ہو رہا تھا

اس خاتون کے لئے تو اس کے دل میں استکراہ مچلا کرتا تھا۔ لیکن اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے اور اس کی محبت میں گزرنے والا ہر لمحہ حاصل زندگانی ہے۔

دور کہیں گجر نے ایک بجایا۔ ضیا نے جلدی سے کوٹ کی آستین کھینچ کر گھڑی دیکھی۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔

"اوہ۔ کتنا وقت جا چکا۔ احساس ہی نہ ہوا"

"ایک بجا ہے"؟ خاتون نے پوچھا۔

"ڈیڑھ" ضیا نے گھڑی والی کلائی اس کے سامنے کر دی۔

"نیند آنے لگی ہے؟"

"نہیں"

بیٹھنا چاہو گے۔ یا۔"

"آپ کی اجازت ہو۔ تو عمر بھر بیٹھا رہوں"

"انہونی باتیں مت کرو"

"کیا یہ ممکن نہیں شہلا۔؟ اچانک ضیا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ ایک لمحہ کو چکرا سی گئی۔ پھر ملائمت سے ضیا کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے مسکرائی، "کوئی بات نہیں۔ یہ تمہاری عمر کا تقاضہ ہے۔ ایسی باتیں سوچ سکتے ہو" ضیا از خود رفتہ سا نظر آ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی۔ کیا کہے کیا کرے۔ خاتون تو بھرا نشے کی طرح اس کی رگ رگ میں اتر چکی تھی۔ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ جذباتی ہونا چاہ بھی رہا تھا۔ لیکن خاتون پر ٹھہراؤ کی کیفیت غالب تھی۔ وہ بڑے سکون اور تحمل باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں اب کوئی انتشار تھا نہ خلفشار۔

ضیا نے نیا سگریٹ سلگا لیا۔

"ضیا" وہ قدرے خنداں تھی۔

"جی"

"میں تو ڈرنے لگی ہوں۔

"کیوں"

"کہیں تم سے محبت نہ کرنے لگوں"

ضیا نے شوخ نظروں سے اسے دیکھا۔ بے صبری کچھ اور بے صبر ہوئی۔ اس کا بازو پھیلا اور خاتون کو بجلی کی سرعت سے اس کی لپیٹ میں لیتے ہوئے بولا "ہرج بھی کیا ہے" خاتون نے اس کے مضبوط بازو کا فولادی گھیرا شکنجے کی طرح محسوس کیا۔ لطف و انبساط کی بھرپور لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی اسے یوں لگا جیسے جنم جنم کی تشنگی سیرابی سے ہم آہنگ ہو رہی ہو۔ لیکن اس نے کسی جذباتی پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ خوبصورتی سے مسکرائی اور ضیا کی طرف سکون سے دیکھتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔ اور آہستگی سے بولی۔

"نہیں" میں تم سے محبت نہیں کروں گی۔

"کیوں" ضیا نے اسے اور قریب کر لیا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ گھل رہا تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور تنفس کا زیر و بم غیر متوازن ہو رہا تھا۔

"نہیں۔ ضیا۔ میں صرف حال میں جینا چاہتی ہوں"

اس نے ضیا کے بازو کا حلقہ تنگ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں شہلا" ضیا بڑبڑایا۔

میں صرف حال میں جینا چاہتی ہوں ضیا۔ تم سے محبت نہیں کر سکتی۔ نہیں کروں گی حال کے جو لمحے میری گرفت میں ہیں۔ میں انہی سے آسودگی حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ماضی۔ اور مستقبل کو میں نے ہمیشہ بے معنی سمجھا۔ جس لمحے کو میں گرفت میں لینے سے قاصر ہوں اس کو ذہن پر مسلط کیوں کیا جائے۔"

"شہلا" ضیا اس کی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

"ضیا" وہ بمشکل اس کی گرفت سے نکلتے ہوئے بولی "میں چند دن یہاں ہوں۔ تم بھی یہاں رہوگے بس۔ پھر ہم اجنبیوں کی طرح الگ ہوجائیں گے۔ محبت تو مستقبل کا مستقل روگ ہے"

"نہیں شہلا نہیں۔ ہم اجنبیوں کی طرح کبھی الگ نہیں ہوسکتے۔" ضیا وفور جذبات سے گھٹتی آواز میں بولا۔ اس نے سختی سے دونوں ہاتھوں کو آپس میں الجھا لیا۔

خاتون اپنی جگہ سے اٹھی اور میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیہ کا آخری سگریٹ سلگائے ہوئے سامنے سٹول پر بیٹھ گئی۔ وہ جیسے کسی مشکل میں گرفتار تھی۔ کشمکش و پیچ کے عالم میں تھی، تذبذب کا شکار تھی۔

ضیا اسے سرخ سرخ نشیلی آنکھوں سے گھورنے لگا۔

وہ دیو مالائی کہانیوں کے کردار کی طرح سٹول پر بیٹھی پراسرار لگ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مضمحل اور سلگتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ محبت اور جذباتیت کی کشمکش نے اسے ڈانواڈول کر رکھا تھا

کئی لمحے بوجھل خاموشی کی نذر ہوگئے۔

"میری ازدواجی زندگی چار سالوں پر محیط ہے ضیا۔" وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی "اور ان چار سالوں میں تم پہلے آدمی نہیں ہو۔ جو میری زندگی میں آئے۔ لیکن جانے کیا بات ہے تم مجھے شروع ہی سے بہت اچھے لگے۔"

ضیا بھرپور نظریں اس پر گاڑے رہا۔

وہ قدرے مسکرائی۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگی "میری زندگی میں جو بھی اجنبی آیا جذباتیت کا شکار ہو کر آیا۔ میں تمہیں سچ سچ بتا دوں۔ کہ تمہیں بھی میں جذباتیت کا شکار بنا کر اپنے قریب لائی تھی۔ لیکن جانے کیوں میں ایک دوراہے پر آن کھڑی ہوئی ہوں۔"

ضیا کچھ نہیں بولا۔

خاتون نے چٹکی سے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور قدرے رک کر بولی "میں اپنے اصول کے خلاف جا کر تم سے محبت بھی کرنا نہیں چاہتی۔ اور۔ اور۔ جذباتیت کا شکار ہونے کو بھی دل

نہیں چاہتا۔ بس تم مجھے اچھے لگ رہے ہو۔ اچھے لگ رہے ہو۔ کیوں اچھے لگ رہے ہو؟" اور باتیں کرتے کرتے اسے جانے کیا ہوا۔ وہ بپھر کر اٹھ کھڑی ہوئی "تم کیوں اچھے لگ رہے ہو مجھے۔ ضیا۔ بتاؤ۔ کیوں تم نے میرے اصول توڑ دیئے۔ یہ کیا کر دیا تم نے مجھے"

وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے بولی۔

ضیا چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھا۔ اور

اس کے قریب آ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

دونوں جذباتی ہوگئے۔

اور

پھر

جوش کو ہوش کہاں رہتا ہے۔ بازوؤں کا حلقہ تنگ ہوگیا اور ضیا نے اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

خاتون جو پہلے ٹھہرے ہوئے سمندر کی طرح تھی ہلکی ہلکی لہریں لیتا ہوا سمندر۔ آہستہ آہستہ پھیل کر سمٹتی اور سمٹ کر پھیلتی لہروں والا پرسکون سمندر!

اب چودھویں رات کے چاند کی طرف دیوانہ وار اچھلنے والی متلاطم لہروں سے طوفان آشنا سمندر لگ رہی تھی۔ ضیا بھی جذبات کے جوار بھاٹے سے دوچار تھا۔

طوفان طوفان سے ٹکرا گیا۔

اور

جب بپھری لہریں سمٹ کر سمندر کی گہرائیوں میں اتر کر پرسکوں ہوگئیں۔ غراتے ہوئے ساحل کی طرف دوڑنے والی پانی کی دیواریں منہدم ہوگئیں۔

تو

ضیا پلنگ کے ٹیک سے لگا یوں بیٹھا تھا۔ جیسے کوئی معصوم دوشیزہ لٹ جانے کے

بعد پچھتاوے اور خوف وہراس سے دوچار ہو۔ اس کا بے داغ کردار۔ اخلاقی اصول۔ تہذیبی
قدریں۔ سب جذبات کے تندوتیز دھارے کی نذر ہو چکی تھیں۔

خاتون اس کے قریب ہی تکئے میں منہ دیئے لیٹی رہی۔

دونوں چپ تھے۔

جانے کچھ کہنے سننے کو رہا ہی نہ تھا۔

یا

کچھ کہنا سننا چاہتے ہی نہ تھے۔

خاموشی دم بخود تھی۔ ایک غیر محسوس سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پورے کمرے کی فضا جیسے
دم روکے ہوئے تھی۔ باہر بھی بارش ختم ہو چکی تھی۔ اور ہواؤں کا دم بھی جیسے گھٹ چکا تھا
خاموشی کے بڑھتے پھیلتے دباؤ کو توڑنے کے لئے آواز درکار تھی۔ اور دونوں میں سے شاید
کسی کی آواز پہل کرنے کی ہمت نہ کر رہی تھی۔

اچانک گجر نے کہیں دور سے صدا دی۔ خاموشی ٹوٹ گئی۔ اس ٹوٹنے کی آڑ لے کر
وہ اٹھ بیٹھی۔ پلنگ کے سپرنگ کے چرچرائے اور لباس کی سرسرائیوں نے خاموشی کو
ذرا اور زبان دے دی۔

ہمت بندھی۔ جرأت ہوئی۔ خاتون نے خاموش نظروں سے ضیا کو دیکھا دیکھتی رہی
اور پھر بولی "پچھتا رہے ہو۔؟

ضیا نے پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا۔

"ثواب و عذاب کے چکر میں ہو" وہ ہنسی

ضیا نے جواب دینے کی بجائے سگریٹ کی نئی ڈبیہ اٹھا لی۔ ایک سگریٹ سلگا
کر خاتون کو دیا۔ اور دوسرا خود لے لیا۔

پچھتانا مجھے چاہیے۔" اس نے لمبا سا کش لیتے ہوئے کہا۔ پھر ضیا کے جواب کا انتظار

کئے بغیر وہ بولی "اس لئے نہیں۔ کہ میں ایک عدد شوہر کی بیوی ہوں۔ بلکہ اس لئے۔ کہ۔"
وہ رک گئی۔ ضیا نے مستفسرانہ اسے دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی کچھ کہنے اور نہ کہنے
کے درمیان جیسے معلق تھی۔

ضیا صرف اسے تکے گیا۔ پھر وہ بولی " ضیا میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ اور یہ
یہ میری زندگی کا شاید سب سے بڑا المیہ ہے۔

"کیوں" وہ راکھ جھاڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بنا بولا۔

محبت پاکیزگی کی متقاضی ہوتی ہے" وہ دکھے لہجے میں بولی۔

ضیا چپ رہا۔

تم سنجیدہ نہیں ہو۔ سنجیدہ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ مجھ جیسی عورت سے شکر کی ہی بات
ہے کہ تم نے نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ میرے لئے یہی بڑی خوشی کی بات ہے۔ تم تو جذبات
میں بہک گئے۔ لیکن میں۔ میں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔

کرتی جایئے۔ مجھے اچھی لگ رہی ہیں۔ آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے شہلا۔!
وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

وہ چپ رہی

میں اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہوں۔ تو شہلا۔ یقین مانو عشق بھی ہیچ سا لفظ ہے

بہت جذباتی ہو رہے ہو۔ میرے کردار سے پوری طرح متعارف ہو گئے۔ تو ڈرتی ہوں
کہیں نفرت ہی نہ کرنے لگو۔"

" میں متعارف ہوں"

" پوری طرح نہیں"

" پوری پوری طرح "

"اوں ہوں۔"

"یقین مانیئے۔"

اور پھر اس نے میونخ والے مشاہدات خاتون کو ورطہ حیرت میں ڈالتے ہوئے پوری سچائی سے بیان کر دیئے۔

"تو تم مجھے پہلے سے پہچانتے تھے؟" وہ خوشی اور حیرت سے بولی۔

"ہاں"

"اس کے باوجود بھی میرے قریب آگئے"

میں خود نہیں جانتا کہ کیوں؟

وہ ہنس دی۔ اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم بھی میرے حافظے میں تب سے محفوظ تھے۔ جب ہوٹل میں بھرپور طنز کرتے ہوئے تم نے کہا تھا۔" آپ سے مل کر مجھے خوشی نہیں ہوئی۔"

اب حیرت ضیا کو ہو رہی تھی۔ خاتون کی ساری باتیں سننے کے بعد بولا۔ "آپ نے مجھے جتلایا تک نہیں۔ کہ آپ مجھے اس وقت سے جانتی تھیں۔"

"ڈرتی تھی ضیا۔"

"کس بات سے"

"نفرت سے۔"

"اب کیوں بتادیا۔ کیا نفرت کا خوف جاتا رہا۔"

"ہاں"

وہ مسکرایا اور قدرے شوخ ہو کر بولا۔ "اگر میں واقعی آپ سے نفرت کرنے لگوں تو۔"

خاتون نے نفی میں سر ہلایا۔"

"اتنا اعتماد"

"بالکل"

"فرض کرو۔ ایسا ہو تو"

"یعنی"

"یعنی میں آپ سے نفرت کرنے لگوں۔"

خاتون نے قاتل نظروں سے ضیا کو دیکھا اور پھر بھرپور اعتماد سے بولی "تو یہ نفرت محبت کی شدت کی انتہا ہوگی۔"

ضیا خاتون کے اعتماد پر بڑے اعتماد سے مسکرایا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا وہ ڈال سے ٹوٹتے ہوئے پھل کی طرح اس کے بازو کے حلقے میں آگئی۔ دونوں کافی دیر تک سگریٹ پیتے رہے۔

باتیں کرتے رہے۔

اور

پیار کی انتہاؤں کو چھوتے رہے۔

جب دونوں سنبھلے۔ ہوش کا دامن سنبھالا۔ تو ضیا نے خاتون سے اس کے اس طرز زندگی کے متعلق پوچھ ہی لیا۔ ایک شادی شدہ عورت۔ جو خاصی سلجھی ہوئی اور معقول بھی تھی۔ اصولوں ضابطوں اور قدروں کو توڑ پھوڑ کر بے راہ روی پر کیوں اتر آتی تھی۔ جب کہ شوہر موجود تھا۔ اور خوشگوار زندگی گذارنے کو بے انتہا دولت بھی اس کے پاس تھی۔

وہ چپ ہوگئی۔ اس کے چہرے پر چند لمحے پہلے جو چمک تھی وہ غائب ہوگئی اس کی آنکھوں میں ڈھلتی نشے کی کیفیت کرب بن کر پھیلنے لگی۔

ضیا دزدیدہ نظروں سے اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ میں تمہیں

سب کچھ بتا دوں گی ضیا۔" اس نے ٹوٹتے لہجے میں کہا" ساری روئداد سن لینا۔ فیصلہ شاید تم میرے حق میں نہ کر سکو۔ کہ تم بھی معاشرے کے لگے بندھے اصولوں سے بغاوت کرنے کے اہل نظر نہیں آتے۔ پھر بھی۔ پھر بھی۔ میں تمہیں بتاتی ہوں، سب کچھ بتاتی ہوں۔"

ضیا تجسس شوق اور کرید کے احساس سے تکنے لگا۔

اندرون شہر تنگ و تاریک گلیوں میں ہمارا گھر تھا۔ چھوٹا سا گھر جو دو کمروں چھوٹے سے صحن اور چھت پر ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ میں حیران ہوں کہ پہلے زمین اتنی وسیع تھی۔ لیکن لوگ گھر چھوٹے چھوٹے بناتے تھے۔ اور اب زمین تنگ ہو رہی ہے۔ اور کشادہ وسیع اور جہازی سائز گھروں کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔

ہمارا مکان پکا تھا۔ ہاں ہمارا مکان پکا ہی کہلاتا تھا۔ کیونکہ محلے میں یہی واحد مکان تھا جو سیمنٹ اور اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اور جس کی مرمت وغیرہ ہر سال باقاعدگی سے ہوا کرتی تھی یہ مکان ہمارے دادا تھا۔ اسی وجہ سے اس میں ہمارے علاوہ ہمارے چچا بھی مع اپنے بال بچوں کے رہتے تھے۔ چھت پہ وہ لوگ ہوتے اور نچلے میں ہم۔ مجھے یاد ہے کہ دونوں گھرانوں کے درمیان پیار اور بھائی چارے کی فضا ہمیشہ رہتی تھی۔

محلے میں ہماری بڑی عزت اور ساکھ تھی۔ جس کی وجہ دونوں گھرانوں کا سلوک و اتفاق اور اہل محلہ کے مقابلہ میں اچھی مالی حالت تھی۔ اچھی مالی حالت سے یہ نہ سمجھ لینا۔ کہ میں امارت کا ذکر کر رہی ہوں۔ بس گزر اوقات اچھی ہوتی تھی متوسط طبقہ میں ہمارا شمار ہوتا تھا۔

ہم پانچ بہن بھائی تھے۔ ایک بہن میری ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی بیاہی جا چکی تھی۔ دوسری بھی مدت پہلے اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔ اس کے بعد دو بھائی تھے اور آخری میں تھی۔

شاید میں بہت خوبصورت تھی۔ یا گھر میں سب سے چھوٹی۔ اس لئے والدین اور بہن بھائی سب ہی لاڈ پیار کرتے تھے۔ اتنا لاڈ۔ کہ اسے خطرناک بے تکلفی کی حد کہنا چاہیے میرے دونوں بھائیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ اور گھر کے وہی دو کمرے تھے۔ جن میں یہ شادی شدہ جوڑے میرا ماں باپ جو خود بھی عمر کی ان حدود میں بھی خاصہ رنگین مزاج تھا بستے تھے۔

میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کبھی بستر ایک کمرے میں ہوتا۔ کبھی دوسرے میں۔ کبھی اماں ابا کے پاس۔ اور یقین مانو ضیا کبھی کسی نے یہ سوچا بھی نہ تھا۔ کہ ایک جوان لڑکی کے بھی جذبات ہوتے ہیں۔ وہ بھی محسوسات رکھتی ہے اور جنس اس کے۔ لئے بھی کوئی تھرتھری پیدا کر دینے والی چیز ہے۔ بھائی جوان تھے بھابیاں جوان تھیں۔ جنسی تقاضے جوان تھے۔ محبت کا اظہار تو اکثر میرے سامنے ہی بے تکلفی سے ہوا کرتا۔ چھیڑ چھاڑ بھی ہوتی۔ میرے دل میں بھی گدگدی ہونے لگتی۔ اور شاید وقت سے بہت پہلے میرے جنسی جذبات بیدار ہو گئے۔

اور

یقین مانو جب میری شادی کی بات چیت میرے چچا زاد سے چلی تو میری خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ میری سوچوں کا محور محبت تھی نہ کوئی اور بات۔ صرف ایک چیز تھی اور وہ تھی جنس۔

میں دسویں کا امتحان دے نہ پائی تھی کہ منگنی کی رسم ادا کر دی گئی۔ میرا چچا زاد چھت پر ہی رہتا تھا۔ بڑا کڑیل جوان تھا۔ شادی جہیز کی تیاری کے لئے التوا میں ڈال دی گئی لیکن میری بے تابی جنون خیز ہوتی گئی۔ اور ایک دن سیڑھیوں سے اترتے ہوئے جب میرے منگیتر نے بجلی کی سرعت سے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر میرے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں کی والہانہ شدت سے پیار کر لیا۔ تو میں۔ میں زندگی کے اس عملی تجربے سے بے اختیار سی ہو گئی۔ کئی دن میرے ہوش و حواس پر نشہ سا طاری رہا اور میرا انگ انگ بھڑ

رہا۔ یہی تجربہ جی چاہا کہ بار بار دہرایا جائے۔ میرا منگیتر مجھے اپنے آہنی شکنجے میں لے میری بوٹی بوٹی نوچ لے۔ میری ہڈیاں توڑ دے۔ میرے اتنے پیار لے کہ میں بے سدھ ہو جاؤں۔

لیکن اس کے بعد اس کے تجربے کی نوبت نہ آئی۔ وہ نوکری کے سلسلہ میں دوسرے شہر چلا گیا۔

میری رگوں میں تیزی سے بہتا لہو سلگتا رہا۔ میں ساری ساری رات جاگتی رہتی۔ بھیا اور بھابی میرے اعصاب پر سوار رہتے۔ رات اک خوف سا بن کر میرے ذہن پر پھیل جاتی۔

میں حیران ہوں۔ کہ ان دنوں میں پھسل نہ گئی۔ کوئی غیر اخلاقی حرکت مجھ سے سرزد کیوں نہ ہوئی۔ جس تجربے کی توقع میں اپنے منگیتر سے کئے تھی۔ وہ کہیں اور کرنے کا کیوں نہ سوچا؟

شاید

شاید اسی لئے کہ ہمارا گھرانہ بڑا عزت تھا۔

یا

اس لئے کہ

مجھ میں ایسا کرنے کی جرأت ہی نہ تھی۔

بہر حال اخلاقی قدروں کی تربیت کہہ لو۔ یا جرأت کا فقدان۔ میرے جذبات انگیخت ہوتے رہے۔ اور میں گھٹ گھٹ کر برداشت کرتی رہی۔

آخر میری شادی ہو گئی۔

ہاں ضیا۔

میری پہلی شادی۔ اس وقت میری عمر کوئی سولہ سترہ برس تھی۔ لیکن جنس کے معاملہ میں پوری میچور تھی۔

شادی کیا ہوئی۔ جنسی طوفان پھٹ پڑا۔ میں اور میرا شوہر شاید دونوں ہی بھوکے تھے پیاسے تھے۔ دن دیکھا نہ رات۔ جنسی تسکین کے لئے ایک دوسرے کے لئے جیسے وقف ہوگئے۔

لیکن

میری بدقسمتی کہہ لو ضیا۔ کہ شادی کے صرف تیرہ ماہ بعد ہی میرے شوہر کی موت واقع ہوگئی۔

میں غم سے دیوانی ہوگئی۔ مجھ پہ مصائب کا آلام ٹوٹ پڑا۔ یہ نہیں کہ میں بیوہ ہوگئی تھی۔ اور میرے مالی وسائل اتنے نہ تھے۔ کہ گذر بسر ہوسکتی۔ نہیں۔ مجھے دکھ تھا۔ تو ہڈیاں توڑ دینے والے اور بوٹیاں نوچ نوچ لینے والے انسان کے بچھڑ جانے کا۔

میری باتیں تمہیں شاید عجیب لگ رہی ہیں ضیا۔ لیکن میں اپنے احساسات صحیح طور پر تمہیں بتا رہی ہوں۔

میری زندگی اب بیحد تلخ اور ویران ہوگئی تھی۔ ان دیکھی دیکھ چکی تھی اور دیکھ چکے کے بعد محرومی۔ تم سوچو تو سہی میرا کیا حال ہوگا۔

جنس اپنی جگہ بہت اہم شے ہے۔ یہ فطری تقاضا ہے۔ لیکن سمجھ نہیں آتی ہمارے ماحول اور معاشرے میں اسے کیوں اہمیت نہیں دی جاتی۔ اسے ہوا بنایا جاتا ہے۔ اس کا نام گوارا نہیں ہوتا۔ اسے بدمعاشی کا سمبل بنایا جاتا ہے۔ یہ سب ظاہرداری ہے تصنع ہے فریب ہے۔

کچھ دن گھر کی فضا سوگوار رہی۔ گھر کے ہر فرد نے مجھ سے ہمدردی جتائی۔ بھابیاں بھائیوں کی سیج سجانے کی بجائے مجھ سے لپٹ لپٹ کر سوئیں۔

لیکن

یہ سب وقتی باتیں تھیں۔

جنس اتنی ہی غیر اہم چیز ہوتی تو بھائی یا بھابیاں میرا برسوں نہ مہینوں تو ساتھ دیتیں لیکن ایسا ہونا ممکن ہی کہاں تھا۔ گھر کی فضا وہی ہوگئی۔ بھائی اور بھابیوں کے تعلقات میرے لئے چیلنج تھے۔

دھیان بٹانے کو میں نے ایف اے میں داخلہ لے لیا۔ پھر بی اے بھی کر لیا لیکن جذبات کی جنگ جاری رہی۔ تشنگی بڑھتی رہی۔ بھوک خوفناک ہوتی گئی۔ میں نے کچھ عرصہ کے لئے ملازمت بھی کی۔

والدین کے فوت ہونے کے بعد بھائیوں اور بھابیوں کا وطیرہ بھی کچھ بدل گیا۔ سسرال والے پہلے بیگانہ بن گئے تھے۔ کسی کو احساس تک نہیں تھا۔ کہ میں بھی جوان ہوں۔ میرے سینے میں بھی جذبات مچلتے تھے۔ اور مرد کی ضرورت کے بھرپور تقاضے میرا جینا بھی حرام کر رہے تھے۔

بس اپنے جذبات کی صحیح طور پر عکاسی کر رہی ہوں ضیا۔ یقین مانو ستائیس اٹھائیس برس کی عمر تک ساری کشمکش کے باوجود میں نے اپنے آپ کو گھٹن ہی کا شکار رکھا۔ کوئی جرم نہ کیا۔ کوئی گناہ سرزد نہ ہوا۔ کوئی غیر اخلاقی حرکت نہ کی۔ حالانکہ میرے اندر کی عورت۔ میرے ظاہری خول میں چھپی عورت۔ انتہائی جذباتی تھی۔ جنس کی طلبگار تھی۔ اس کے جذباتی تقاضے انتہائی بھرپور تھے۔ اس کے جذبات بھرپور تھے۔ وہ اپنا مصرف چاہتی تھی۔

بڑی شدت سے مصرف چاہتی تھی۔

انہی دنوں مجھے اپنی ایک دوست کی وساطت سے پتہ چلا۔ کہ ایک بچپن ساٹھ سالہ رئیس کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

جذبات کی سیری کا موقع مل رہا تھا۔ اپنی عمر اور حالات کی وجہ سے مجھے معلوم تھا کہ کوئی ہم عمر میرا ہاتھ تھامنے کو تیار نہ ہوگا۔ بیوگی کی چھاپ بھی مانع تھی سہیلیوں کی وساطت

سے دو ایک جگہ جو کوشش ہوئی تھی ناکام ہو چکی تھی۔ میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔
بھائیوں اور بھابیوں نے اعتراض تو کیا۔ لیکن میری دوست میری ایما پر مسلسل کوشش
کرتی رہی۔

بالآخر وہ کامیاب ہو گئی۔

اور میری شادی اپنی عمر سے دگنی عمر کے آدمی سے طے پا گئی

نکاح کے دن میرے بھائی بھابیاں رشتہ دار۔ اور سہیلیاں سبھی میری قسمت پر
افسوس کر رہے تھے۔ "صرف دولت ہی تو خوبی نہیں" سب کے لبوں پہ یہی الفاظ تھے

لیکن

میں خوش تھی۔

میں بے انتہا خوش تھی ضیا۔

میرے کردار کی کمزوری کو ذہن میں رکھ کر میری خوشی کا اندازہ تم خود ہی کر لو۔

شادی ہو گئی۔

میرا شریک زندگی شاید جنسی آسودگیاں سمیٹ سمیٹ کر تھک چکا تھا۔ عمر کے آ
حصے میں تھا۔ جہاں جنس ضرورت نہیں بنتی۔ یا شاید کوئی اور بات چند دنوں ہی میں
ہم جیسے میاں بیوی نہیں محض ساتھی تھے۔

میری آگ اور بھی بھڑک اٹھی تھی۔

میرا خون تپ رہا تھا۔

میری ہڈیاں چڑچڑا رہی تھیں۔

میری بوٹیاں پھڑک رہی تھیں۔

لیکن میرے شوہر کی بے حسی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں راتوں اس کی آغوش میں
رکھ کر جاگنا چاہتی اور وہ بستر پہ پڑتے ہی خراٹے لینے لگتا۔ میں نے اس کے پیار میں

جوشیلی شدت نہ پائی۔ اس کے ہونٹوں کا لمس ہمیشہ ٹھنڈا اور بے کیف رہا۔ اس کے بازوؤں
میں شاید اتنی طاقت ہی نہ تھی۔ کہ مجھے بھینچ کر بے بس کر سکتا۔

اور

پھر وہی ہوا۔

جواب ہو رہا ہے

میرے شوہر نے ایک خوبصورت بیوی کو تجارتی زینے کے طور پہ استعمال کرنا شروع
کر دیا اس نے یوں بے انتہا دولت کمائی ہے۔

میں نہیں جانتی وہ اتنا معصوم ہے۔ کہ میری سرگرمیوں سے لاعلم ہے۔

یا

اتنا بدھو ہے۔ کہ جانتا ہی نہیں۔ جنس طوفانی صورت بھی اختیار کر جاتی ہے۔

بہرحال۔

میں۔

ہاں ضیا

میں جنسی تسکین کے لیے بہت سوں کو استعمال کر چکی ہوں۔ میرا وطیرہ وہی ہے
جو تمہیں بتا چکی۔ مجھے کبھی تسکین نہیں ملی۔ کبھی آسودگی کا احساس نہیں ہوا۔ خلا ہمیشہ باقی رہا

لیکن

لیکن

ضیا جانے کیا بات ہے۔ آج یوں لگتا ہے۔

یوں لگتا ہے۔ جیسے برسوں کی پیاسی۔ لکڑی کی طرح اکڑی زبان تر ہو گئی ہے۔ اتنی
آسودگی میسر آئی ہے۔ کہ اور کچھ پانے کی آرزو رہی ہے نہ حسرت۔ میں ہر سال یہاں آتی ہوں
سال میں دو ایک بار غیر ممالک کا دورہ کرتی ہوں۔ ذہنی اور جسمانی آسودگی حاصل کرتی ہوں

پارے کا اضطراب مجھے پسند ہے جمود سے مجھے نفرت ہے۔ اسی لئے چند دن مل بیٹھنے کے بعد بچھڑ جاتی ہوں۔

تم میری عیاشانہ سرگرمیوں سے واقف ہو گئے ہو۔ مجھ سے نفرت بھی کر سکتے ہو۔ اور میری مجبوری کو دیکھتے ہوئے ہمدردی بھی۔ میں راہبہ نہیں ہوں۔ نہ ہی دیوداسی ہوں۔ حالانکہ میں جانتی ہوں۔ کہ یہ بھی تڑپتے ہوئے وجودوں کو چھپانے کے خوشنما لبادے ہیں۔

جنس کی ضرورت سے انکار کرنے والا دنیا کا جھوٹا انسان ہے۔

میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔

پورے خلوص اور پوری سچائی سے"

اب فیصلہ تم خود کر سکتے ہو۔ کہ قصور کس کا ہے۔؟

ان چھوٹے چھوٹے کمروں میں جوان بھائیوں کے بیباکانہ کھیلے جانے والے جنسی کھیل کا یا میری وقت سے پہلے بیدار ہو جانے والی جنسی بھوک کا۔ یا اس بوڑھے انسان کا جو خود تھکا ہارا ہی ہے۔

فیصلہ تم کرو۔ ضیا فیصلہ تم کرو۔"

خاتون نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ اور پھر اسکی لمبی لمبی سنہری انگلیوں پر پانی کی ننھی ننھی بوندیں لرزنے لگیں۔

ضیا بے حس و حرکت بیٹھا اسے صرف تکے جا رہا تھا۔ اور وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

خاتون رو رہی تھی۔ اور ضیا کا دل ہمدردی پیار اور عشق کے جذبات سے لبالب بھرے پیمانے کی طرح چھلک رہا تھا۔ خاتون انتہائی مظلوم لگ رہی تھی۔ بیچارگی کا موقع دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا قصور کیا تھا؟ شاید ضیا پوری ایمانداری سے اس سوال کا جواب اپنے ذہن کے گوشوں میں چھپا کرید رہا تھا۔

چند لمحے فضا بوجھل رہی۔ باہر ہوائیں سائیں سائیں کرتی رہیں۔ شاید پھر کہیں سے گھٹائیں امنڈ آئی تھیں۔ گھن گرج شروع ہو گئی تھی اور بجلیاں بڑے خوفناک تڑاکے پیدا کر رہی تھیں۔

خاتون نے خود ہی اپنا سر اٹھایا۔ تکیئے کے پاس پڑا رومال اٹھایا اور اپنی بھیگی آنکھیں پونچھنے لگی۔ وہ بے حد اداس ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے کی ساری چمک غائب تھی۔ گلیمر اور چارم کفن میں لپٹے مُردے کی طرح لگ رہا تھا۔ ضیا کو اپنی ساری روداد پوری سچائی اور خلوص سے سنا کر شاید وہ پچھتاوے کی طرف لوٹ رہی تھی۔ لاشعوری اور شعوری طور پر اسے توقع تھی۔ کہ ضیا اس کی سچائی اور خلوص سے متاثر ہو کر اس سے بے پناہ ہمدردی کا اظہار کرے گا لیکن

وہ تو جیسے پتھرا ہی گیا تھا۔ کھلی کھلی آنکھوں سے خاتون کو تکے جا رہا تھا۔ اور سانس غیر متوازن ہوئے جا رہے تھے۔

ایک گہرا اور بکھرا دینے والا مایوسی کا عکاس سانس لیتے ہوئے خاتون نے کرب زدہ نظروں سے ضیا کو دیکھا اور پھر بیڈ سے اٹھنے کو پاؤں نیچے لٹکا دیئے۔

"شہلا" ضیا نے انتہائی غیر متوقع طور پر اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا خاتون قطعاً جذباتی نہیں ہوئی۔

ضیا نے اسے قریب کرتے ہوئے اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لگا لیا۔

میں نہیں بتا سکتا شہلا کہ مجھے آپ کی روئداد سن کر کتنا دکھ ہوا ہے۔ کاش، کاش میں آپ سے پہلے ملا ہوتا۔ کم از کم چار سال پہلے۔ تاکہ جس دلدل میں آپکے حالات اور ماحول نے پھنسا دیا ہے اس سے آپ کو بچا سکتا ہے، بے دم ہو کر خاتون نے آنکھیں بند کر لیں اور سر ضیا کی چوڑی چھاتی سے ٹکا دیا۔ ضیا نے اس کے خوبصورت بالوں کو بے اختیار ہو ہو کر کئی بار پیار کر لیا۔

"شہلا" کئی لمحوں کے بعد ضیا نے آہستگی سے کہا۔

"ہوں" وہ اس سے الگ ہو کر بولی۔

"مجھے آپ سے پوری پوری ہمدردی ہے۔"

"شکریہ"

"لیکن"

"ہوں"

ضیا نے نیا سگریٹ سلگایا۔ اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "آپ بے شک حق بجانب ہیں، آپ تازہ دم ہیں۔ جوشیلی اور بھرپور محبت کا اظہار چاہتی ہیں۔ یہ بھی آپ کا حق ہے۔"

"ہوں۔ پھر" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بے دلی سے دھواں چھوڑتے

ہوئے ضیا کی طرف دکھ سے دیکھا۔

آپ نے جو روش اختیار کر رکھی ہے۔ وہ کسی طور مناسب نہیں۔"

"کیوں"

"نیکی بدی۔ گناہ و ثواب۔ ہمارے افعال کو ماپنے کے پیمانے ہیں شہلا"

"مجھے گناہ و ثواب سے ڈرانے کی کوشش نہ کرو ضیا" اس نے ادھ جلا سگریٹ خالی پیالی میں پھینکتے ہوئے کہا "میری روئداد سن کر بھی تم ایسا کہو تو تم میں اور دوسرے عام اجنبیوں میں جو میری زندگی میں اب تک آچکے کوئی فرق نہیں۔"

"آپ غلط سمجھیں شہلا"

"تو پھر کیا کہنا چاہتے ہو"

ضیا خاموش ہو گیا۔

شاید یہ کہنا چاہ رہے ہو گے" وہ اٹھ کر لباس درست کرتے ہوئے بولی "کہ میں اس آدمی سے طلاق لے کر کسی اور سے شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ جو میری جنسی مانگ پوری کر سکے۔"

ضیا سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولا "شاید۔ میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔

اس نے ہلکا سا دکھی قہقہہ لگایا۔ پھر ایک دم چپ ہو گئی۔ کئی لمحے جیسے صدیوں کا بوجھ اٹھائے رینگ گئے۔

ضیا پلنگ کے تکیئے سے ٹیک لگائے سر جھکائے الجھا الجھا بیٹھا رہا۔

اور وہ اسے نگاہیں اٹھا اٹھا کر لمحوں کے توقف سے بغور تکتی رہی۔

"ضیا" وہ ایک دم اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"جی"

"کیا تم مجھ سے شادی کر سکتے ہو؟"

ضیا اس انتہائی غیر متوقع سوال سے بری طرح بوکھلا گیا۔ اس نے خاتون کی طرف ہونقوں کی طرح دیکھا۔ ذہن میں اسی کا چہرہ لہرا گیا۔ آصفہ سارہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوگئیں وہ خاتون کے سوال کا جواب نہ دے سکا۔

اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر اپنی خوبصورت آنکھوں کی گھمبیر اداسی مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے بولی "گھبراؤ نہیں، میں ایسی کوئی بیوقوفی کرنے کو تیار نہیں۔"

ضیا نے کرب زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

میری ضرورت پوری ہوجاتی ہے، وہ انتہائی تلخی سے بولی، "میرے تاجر شوہر کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے۔ ہم سب انسان ضرورت کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ضرورتوں کی صورت جدا جدا ہے۔ لیکن ضرورت کے ہاتھوں بکنے کی حقیقت سے انکار احمقانہ بات ہے۔"

ضیا سمجھ نہ پا رہا تھا۔ کہ کیا بات نہ کرے۔ خاتون کی تسکین و ہمدردی کے لئے کونسا رُخ اختیار کرے۔

خاتون اپنے لمبے لمبے پالش شدہ ناخنوں کو بے معنی انداز میں دیکھتے ہوئے جانے کیا سوچنے لگی۔

خاموشی کو توڑنے کے لئے ضیا نے کہا "شہلا۔"

"ہوں"

"مجھے آپ سے بہت ہمدردی ہے"

اور مجھے۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔ "ہمدردی سے اتنی ہی نفرت۔"

وہ اٹھ کر کمرے میں بے تابی سے ٹہلنے لگی تھی۔ ٹین کی چھتوں پہ زوردار بارش پڑنے سے بلا کا شور تھا۔ لیکن کمرے کے اندر خاموشی تھی۔ دونوں کے وجود قریب قریب ہو کے باوجود ان کے اندر کے گہرے سناٹے ماحول پر اثر انداز ہو رہے تھے۔

"کاش آپ کے کوئی بچے ہوگئے ہوتے، کئی لمحوں کی بوجھل خاموشی کے بعد ضیا نے کہا خاتون چونکی۔ حیران نظروں سے ضیا کو دیکھا اور پھر بولی "وہ کیوں؟"

آپ کی سوچ کا انداز بدل جاتا۔ جس جنسی بھوک کا آپ کو ہمیشہ احساس رہتا ہے وہ ختم ہوسکتا تھا۔"

"اوں ہوں۔"

"میرا خیال ہے۔ ہوسکتا ہے غلط بھی ہو۔"

خاتون مسکرا کر چپ ہوگئی۔ پھر دھیرے سے بولی، "کبھی کبھی اس نہج پر میں بھی سوچتی ہوں۔ لیکن۔

"لیکن۔"

لیکن۔ ڈر جاتی ہوں"

کیوں

"اس لئے کہ کہیں میرے بچے میرے لئے سوال نہ بن جائیں؟"

"یعنی۔"

وہ ہنس پڑی اور دھیمے لہجے میں بولی "تم بہت معصوم ہو ضیا۔"

ضیا بولا اتنا معصوم بھی نہیں۔ لیکن آپ کی منطق واقعی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بچے سوال کیونکر بن جائیں گے؟"

"میری موجودہ طرز زندگی سے۔ ڈرتی ہوں کہیں بچوں کے چہرے ٹٹول ٹٹول کر بھی شناخت نہ کر پاؤں تو کیا ہوگا۔"

ضیا سنجیدگی سے بولا "اس کے لئے آپ کو اپنے شوہر پہ قناعت کرنا ہوگی۔"

"اگر شوہر ہی رہا۔ تو ناممکن۔"

اس نے اتنے اٹل اور مضبوط لہجے میں کہا۔ کہ ضیا ہراساں سا نظر آنے لگا۔ خاتون کو وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ نیا سگریٹ سلگایا اور اس موضوع پر کسی اور وقت تفصیل سے گفت وگو کر کے کسی فیصلے پہ پہنچنے کا سوچنے لگا۔

خاتون بھی شاید تھک چکی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی۔ کمبل درست کیا اور تکیئے پر سر رکھتے ہوئے بولی" بارش تھم چکی ہے۔"

"آپ کو نیند آنے لگی" ضیا نے گردن موڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں"

"سو جایئے"

"اور تم"

"اجازت دیں تو میں۔ بھی۔"

خاتون مسکرائی۔ کمبل سینے تک ڈالتے ہوئے بولی" بہتر ہے اب تم واپس چلے جاؤ دن اب نکلنے ہی والا ہوگا۔"

"ہاں"

"تو پھر جاؤ"

"جی نہیں چاہتا"

"بچہ مت بنو۔ اب جاؤ۔ مجھے واقعی نیند آنے لگی ہے"

ضیا نے وہیں رکنے پہ بچگانہ سا اصرار کیا۔ خاتون نے بڑے تحمل اور آرام سے اسے سمجھایا۔ ضیا اٹھا۔ خاتون بڑے پیار سے اسے واپس جانے پہ مجبور کرنے لگی تھوڑی دیر بعد وہ جانے کو تیار کھڑا تھا۔

خاتون نے اس کے خوبصورت وجیہہ اور باوقار پیکر کو بنظر تحسین دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں اداسی گھلنے لگی۔ بمشکل وہ آنسو روک پائی۔

"میں شام کو پھر آؤں گا۔ کہیں تفریح کے لئے نکل نہ جایئے گا" ضیا نے مسرور لہجے میں کہا۔

"نہیں ضیا۔ اب۔ تم یہاں نہیں آنا" وہ آہستگی سے بولی۔

"تو پھر کہاں آؤں" ضیا کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے بولا۔

کہیں بھی نہیں۔" اس نے رُخ موڑتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" وہ حیران ہوکر بولا۔

"بس" اداس سا جواب تھا۔

"نہیں شہلا۔ میں ضرور آؤں گا۔ ایک دو دن ہی میں اکتا گئیں آپ۔ مجھ سے" وہ بولا

"یہ بات نہیں" خاتون نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تو پھر۔" وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔

"بس" تم نہیں آنا" خاتون کی آواز بھر آگئی۔

وجہ۔؟ وہ اصرار کرنے لگا۔

"کچھ بھی نہیں۔ سمجھنا۔ کہ ہم نشان راہ تھے جو مٹ گئے" خاتون نے کروٹ بدل لی۔

میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا" وہ مضطرب ہوکر بولا۔

بیکار باتیں مت کرو" پرسکون سا جواب تھا۔

"شہلا۔ آپ بھی دلآزاری کی باتیں نہ کریں" وہ لڑ پڑنے کو تھا۔

"بہت اچھا" خاتون کے لبوں پہ مجروح تبسم بکھر گیا ویسے ہی لیٹے لیٹے بولی" بس اب تو جاؤ۔"

"پہلے میری طرف دیکھیں" وہ بچگانہ سی ضد سے بولا۔

خاتون نے اس کی طرف دیکھنے کی بجائے چہرہ کمبل میں چھپا لیا۔

ضیا تڑپ گیا۔

جلدی سے گھوم کر بیڈ کے دوسری طرف آیا اور پٹی پہ بیٹھتے ہوئے کمبل کھینچ لیا خاتون کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بے تابی سے بولا "یہ کیا؟"

خاتون کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور ہونٹ لرز رہے تھے۔

ضیا نے اس کا چہرہ دیکھا اور غیر اختیاری طور پہ جھکتے ہوئے اس کے ہونٹوں کی لرزشیں اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیں۔

وہ کچھ نہیں بولی۔

"میں شام ضرور آؤں گا" ضیا نے اس کے بالوں میں انگلیاں الجھاتے ہوئے کہا وہ پھر بھی کچھ نہ بولی۔

میرا جی بالکل جانے کو نہیں چاہ رہا شہلا۔ صرف آپ ہی کے اصرار پہ جا رہا ہوں اب آرام سے سو جائیے۔ شام کو کھل کر باتیں کریں گے۔"

وہ آنکھیں بند کیے رہی

"ساری باتیں۔ اپنی باتیں۔ مستقبل کی باتیں" ضیا اسے تھپتھپاتے ہوئے کسی خوش آئند خیال کے تحت مسکراتے ہوئے بولا۔

مستقبل کی باتیں!.... خاتون دھیرے سے مسکرائی۔ لیکن یوں لگا جیسے خاتون نہیں پختہ کاری ناتجربہ کاری پہ زہر خند ہو۔

"ہاں شہلا۔ مجھے تھوڑا سا سوچنے کا موقع چاہیے۔ ہو سکتا ہے میرا فیصلہ آپ کے حق میں ہو۔"

وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

بچوں کی سی باتیں نہ کرو ضیا" وہ ملاحت سے بولی "ایسا فیصلہ تم جذبات کی رو میں بہہ کر تو کر سکتے ہو۔ لیکن اس فیصلے کو قبول کرنے کے لیے ذہن کہاں سے لاؤ گے"

"میرا ذہن اتنا کچا بھی نہیں"

"صرف تمہارے ذہن ہی سے تو اس فیصلے کا واسطہ نہیں ہو گا۔ تمہارے والدین، عزیز دوست اور ہو سکتا ہے کوئی منگیتر"

ضیا الجھاؤ میں پڑ گیا۔ اس نے خاتون کے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیئے۔ لیکن اس کی باتوں کی سچائی اور حقیقتوں کی برہنگی دیکھتے ہوئے کچھ نہ کہہ سکا۔

خاتون مسکرائی۔ ضیا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے ملتی رہی۔ پھر گہرا سانس لیتے ہوئے بولی "الجھاؤ اور انتشار انسانی صلاحیتوں کو بیکار کر دیتے ہیں تم اطمینان سے جاؤ ضیا۔ ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ڈالو۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے نا سمجھنا۔ کہ ہم نشان راہ تھے جو مٹ گئے۔"

ضیا کا ناتجربہ کار ذہن بوکھلا گیا۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کہے کیا کرے۔ اس نے جھک کر خاتون کو پھر پیار کر لیا۔ اور سینے میں مچلتے پیار کے طوفان کو دباتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

وقت کے دھارے کو روک لینا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ یہ بہتا رہتا ہے۔ بہتا چلا جاتا ہے۔ زمان و مکان صبح و شام اس کی قید میں ہوتے ہیں۔ یہ خود کسی کی قید میں نہیں ہوتا۔ ضیا نے بھی وقت کے بہاؤ پہ بہنے کا ارادہ کر لیا۔ مستقبل کی سوچ سے اپنے حواس کو منتشر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

میں شام کو آؤں گا شہلا۔ پانچ چھ بجے کے درمیان۔ اچھا۔" اس نے کہا

خاتون کچھ نہیں بولی۔

خدا حافظ کہتے ہوئے وہ جانے کو مڑا۔

خاتون نے کمبل پھر چہرے پہ تان لیا۔

اور

جب ضیا کے قدموں کی چاپ دور سے دور ہوتی گئی تو خاتون کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بہتے دھاروں کی رفتار بھی طوفانی ہو گئی

وہ خود نہ سمجھ پا رہی تھی، کہ اسے کیا ہو رہا ہے۔ وہ کیوں رو رہی ہے۔ کیوں اداسیوں میں ڈوب رہی ہے۔

کسی اجنبی سے ملنے کا یہ تجربہ نیا تو نہیں تھا"

لیکن

یہ اجنبی !!!

محبت واقعی جنس اور جذبات سے الگ تھلگ ہی کوئی شے ہے۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود یہ جذبہ پوری سچائی اور خلوص سے بیدار ہو گیا تھا۔

گھر میں اتنے بہت سے لوگ آ گئے سامان اٹھایا رکھا گیا۔ کھٹ پٹ ہوئی لیکن ضیا، بے خبر پڑا سوتا رہا۔

منہ اندھیرے وہ ہوٹل سے آیا تھا۔ رمضو بابا نے رات بھر غائب رہنے کی تھی تو ہنس کر یہ کہدیا تھا کہ چند دوست مل گئے تھے برج کھیلنے میں رات بیت گئی۔

"مجھے جگانا نہیں خواہ کچھ ہو جائے" اس نے ایک پیالی چائے پی کر بستر میں گھستے ہوئے رمضو بابا سے ہنس کر کہہ دیا تھا۔

رمضو بابا نے واقعی اسے نہیں جگایا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب سعید معہ اہل خانہ کے واپس آ گیا تھا۔ آصفہ کے ساتھ اس کی ماموں زاد سنبلہ بھی آ گئی تھی اور چھوٹی چچی کا بھائی منصور بھی چند دن تفریحاً گزارنے آیا تھا۔ مما اور پپا بھی تھے، بڑی آپا کے دونوں بچے بھی۔ گھر میں خوب خوب شور ہو رہا تھا۔ لیکن ضیا، بے سدھ پڑا تھا۔

سعید نے پہلے تو اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن جب دو بھی بج گئے تو سعید ضیاء کے پلنگ کے قریب آیا۔

برابر والے کمرے میں رمضو کھانے کی میز سجا رہا تھا۔ جلدی سے قریب آیا اور

آہستگی سے بولا۔ "صاحب جی انھیں مت جگائیے۔"

"کیوں"۔

"صاحب نے کہا تھا مجھے مت جگانا خواہ کچھ ہو جاتے۔"

"کیوں رت جگا منا تا رہا ہے؟"۔

"دوستوں سے برج کھیلتے رہے اذانیں ہو چکی تھیں جب واپس آتے۔"

"روز جاتا تھا؟"

"نہیں صاحب آج رات ہی باہر رہے۔ اکتا گتے تھے اکیلے۔ ایک دن تو واپس چلے جانے کا اصرار کرنے لگے۔ وہ تو میں نے زبردستی روک لیا کہ گھر بار کی رکھوالی مجھ سے نہ ہو سکے گی۔"

سعید نے گھڑی دیکھی دو بج کر سترہ منٹ ہو چکے تھے۔ ضیاء کافی نیند نکال چکا تھا اور اب کھانے کا وقت بھی ہو رہا تھا۔ اُسے جگانے میں اب کوئی حرج نہیں تھا۔

رمضو کو کھانا لگانے کا کہہ کر ضیاء کے پلنگ پر جھکتے ہوتے سعید نے رضائی اس کے اوپر سے قدرے سرکائی۔

وہ تو جیسے نشہ پیتے مدہوش پڑا تھا۔

سعید نے اس کا کندھا ہلایا۔

"اوں۔ ہوں" کہہ کر ضیاء نے کروٹ بدل لی۔

سعید نے پھر اس کا کندھا ہلایا۔ ضیاء اُوں۔ آں کر کے پھر رضائی تاننے لگا۔

"اٹھو بھی اب۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔" سعید نے مسکرا کر ضیاء کا کندھا زور سے جھنجھوڑا۔ "اٹھو۔ کب سے آتے بیٹھے ہیں۔ اور جناب بیہوش پڑے ہیں۔"

دو تین بار کندھے نے جھٹکا کھایا۔ تو ضیاء نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں پھر

بند کیں حواس میں آنے میں چند ثانیے لگے۔

اور

جب سعید کو اس نے اپنے آپ پر جھکے پایا تو ایک دم اٹھ بیٹھا۔ "اوہ۔ آگئے جناب۔"

"ہاں صاحب۔ تمھیں کیا۔ مردار پڑے ہو۔ کب سے آتے بیٹھے ہیں۔"

"واقعی۔" ضیاء بستر میں بیٹھتے ہوتے بولا۔

سعید نے مصافحے کو ہاتھ بڑھایا۔ ضیاء پلنگ سے کودتے ہوتے اس سے لپٹ گیا۔

"توبہ حد کر دی تم نے۔ خوب سزا دی یہاں اکیلے رکھ کر۔"

"بور ہو گتے تھے۔"

"بالکل۔"

"اسی لیے رت جگے منانے شروع کر دیے۔"

ضیاء ایک لمحے کو لوکھلایا۔ لیکن جلد ہی بولا۔ "گھر اور کیا کرتا۔"

"تو برج کے رسیا ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔"

"لیکن آج جانے نہ پاؤ گے۔"

"کیوں؟"

"بری عادت ہے۔"

"اچھا ناصح صاحب۔ اپنی سناؤ۔ ہاں خالو جان کا تو پوچھا ہی نہیں کیسے ہیں اب۔"

"اچھے ہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ بال بال بچ گتے۔ ایکسیڈنٹ سیریس تھا۔"

ضیاء انگلیوں سے الجھے ہوئے بال درست کرنے لگا۔ اور سعید وہاں کی تفصیلات بتانے لگا۔

"چلو اب منہ ہاتھ دھو لو۔ کھانا تیار ہے۔ میرے ایک کزن بھی ساتھ آئے ہیں۔ اور ماموں زاد بہن بھی۔"

"اچھا تو کافی رش ہوگا گھر میں۔ ٹھیک ہے مجھے کوچ کرنے میں صرف تمہارا ہی انتظار تھا۔"

"بکو نہیں۔ جا کہاں سکتے ہو ابھی۔"

"نہیں سعید آج کل میں واپس جانا ہے۔ شانی کا خط آیا ہے امی شاید کراچی اپنے بھائی کے ہاں جانا چاہتی ہیں۔ میرا گھر پر ہونا ضروری ہے۔"

"دیکھیں گے۔ چلو گھسو غسل خانے میں۔"

سعید نے اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ضیاء غسل خانے میں چلا گیا۔ سعید سے اس نے سفید جھوٹ بولا تھا۔ یہاں سے کوچ کر کے وہ واپس تھوڑا ہی جانا چاہتا تھا اس نے تو شہلا کے ساتھ باقی ایام گزارنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ سعید سے جان کچھ اسی بہانے ہی تو چھڑائی جاسکتی تھی۔

منصور اچھا آدمی تھا۔ خوش لباس خوش مزاج۔ سنبلہ بھی موہنی سی لڑکی تھی ان نئے چہروں میں جاذبیت بھی تھی، اپنائیت بھی۔ لیکن ضیاء تو اپنی ذات کے اندر ہی محوسفر تھا۔ سنبلہ چھوڑ اسے تو آصفہ کے آنے سے بھی اب کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ معاملہ تو ذہن کی پرواز کا ہوتا ہے۔ جب پروازوں کی سمتیں ہی بدل جائیں تو ٹکراؤ کی صورت کہاں رہتی ہے۔ امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ مگر

آصفہ جو جانے سے پہلے ضیاء کے حواس پر بری طرح مسلط تھی۔ جس کی قربت دہکتی مہکتی تھی۔ اب ضیاء کی توجہ کا مرکز تھی نہ دزدیدہ نگاہی کا۔ شہلا کے

مقابلہ میں وہ بالکل ہی ناسمجھ سی بچی تھی۔ کچے ذہن کی عام سی لڑکی۔

ضیاء کو دیکھتے ہی اس کی نگاہیں سجدہ ریز ہوتی تھیں گالوں پر سرخیاں لہراتی تھیں اور لبوں پر مسکراہٹ ناچ اٹھتی تھی۔

ضیاء کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ عامیانہ سی حرکتیں محسوس ہوتی تھیں کوئی ٹھہراؤ۔ ٹھوس پن نہیں تھا۔ ضیاء تو خاتون سے دو ہی ملاقاتوں میں جیسے خام لوہے سے فولاد بن گیا تھا۔ سوچ بدل گئی تھی۔ فکر نے جلا پائی تھی۔ ذہن کا انداز ہی بدل گیا تھا۔

کھانے کے بعد سب نے گھومنے پھرنے کا پروگرام بنایا آصفہ اور سنبلہ مصر تھیں کہ گھوم پھر کر چائے کسی ہوٹل میں پی جاتے۔

لیکن سعید اور منصور مصر تھے کہ کسی گھنے درختوں سے ڈھکی ڈھلان پر جہاں قلقل کرتے پہاڑی چشمے بہہ رہے ہوں پکنک منائی جاتے۔ سنبلہ اور آصفہ چائے اور پکوڑے بنائیں۔ چپس تلیں اور مزے سے چائے پی جاتے۔

اس کے بعد رات کا کھانا منصور بہترین ہوٹل میں کھلاتے۔

سنبلہ اور آصفہ چائے بنانے پکوڑے تلنے اور چائے پیش کرنے کی ذمہ داری لینا نہیں چاہتی تھیں دونوں نے انکار کر دیا۔

"پکنک کل منائیں گے آج ہم تھکے ہوئے ہیں۔" آصفہ نے کہا۔

"تھکے ہوئے ہیں تو باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بستروں میں گھس کر آرام کرو۔" سعید نے کہا۔

"باہر کیوں نہ جائیں۔" سنبلہ بولی۔ "سیر کرنے تو آئے ہیں ہم۔"

"نوکری کرنے نہیں۔" آصفہ نے لقمہ دیا۔

چاروں میں کافی دیر بحث و تکرار ہوتی رہی۔ ضیاء اپنے آپ میں مگن تھا اسے

پکنک سے دلچسپی تھی نہ سیر و تفریح سے وہ تو پانچ بجے شہلا کے پاس جانے کا سوچ رہا تھا۔ ان لوگوں سے چھٹکارا پانے کی سبیل سوچ رہا تھا۔ سعید سے کیا کہے گا۔ آصفہ سے کس بہانے جان چھڑاتے گا؟

بحث و تکرار کسی نتیجے پر نہ پہنچی تو سعید نے ضیاء کی طرف دیکھا۔ "تم غیر جانبدار ہو کر بیٹھے ہو۔ کوئی فیصلہ کرو۔"

"ہیں مہمان جو ہوا۔" ضیاء نے کہا۔

"مہمان"؟ آصفہ نے ادائے ناز سے کہا۔ "بھلا کون سمجھتا ہے آپ کو مہمان کوئی سمجھے نہ سمجھے حقیقت، حقیقت ہوتی ہے۔" "کوئی بھئی"۔ ضیاء نے منصور سے کہا۔

"بات تو ٹھیک ہے۔" منصور بولا۔

"یہ تو اس گھر کا فرد ہے منصور۔" سعید نے بڑے مخلصانہ انداز میں ضیاء کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

سنبلہ شرمیلی سی ادا سے مسکراتے ہوئے بولی۔ "تو پھر آخری فیصلہ انہی پر چھوڑ دیجئے۔"

"اب کہو۔" سعید نے ضیاء سے پوچھا۔

ضیاء چند لمحے چپ رہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "بھئی بات یہ ہے کہ میں پانچ بجے تک آپ لوگوں کا ساتھ دے سکتا ہوں۔"

"کیوں"؟ آصفہ اور سعید نے بیک وقت کہا۔

"پانچ بجے مجھے اپنے ایک دوست کے جانا ہے۔" ضیاء جلدی سے کہا۔

"آج پھر رات بھر برج چلے گی۔ سعید نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"اں۔ نہیں نہیں بھئی۔ میں برج کا ایسا رسیا نہیں ہوں" ضیاء نے کہا۔

"جھوٹ نہ بولو۔" سعید نے ہنس کر کہا۔ "سچ سچ کہہ دو تو چھٹی دے دی جائے گی۔"

"بلکہ ساتھ بھی دیا جائے گا" جلدی سے منصور بولا۔

"تو گویا آپ بھی شوق فرماتے ہیں برج سے" سعید نے کہا۔

"جنون کی حد تک" منصور نے ضیا کی طرف خوشی سے ہاتھ بڑھایا۔

ضیا نے مریل انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور آہستگی سے بولا "مجھے تو خاص شوق نہیں رات بھر کھیلتے رہے۔ ہاں ہاں۔ یہ شوق تھوڑا ہی ہے" سعید مسکرایا۔

بس ختم ہو گیا شوق" ضیا نے جلدی سے کہا"

تو پھر پانچ بجے کی کیا بندش" سعید نے پوچھا۔

"وہ۔ وہ۔" ضیا کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے بات بنا ہی لی۔ "بات یہ ہے۔ کہ کل شام ایک عزیز مل گئے۔ ان کی بیگم رشتہ میں میری بہن ہیں۔ آج پانچ بجے انہوں نے ہی بلایا ہے۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں۔ میں بوریا بستر اٹھا کر انھیں کے ہاں رہوں۔"

آصفہ نے گھبرا کر ضیا کو دیکھا۔

"یہ ناممکن ہے" سعید نے فیصلہ کن انداز میں کہا "ایک رات ان کی خوشی کی خاطر بے شک وہاں گذار لو۔ لیکن رہو گے یہیں۔ سمجھے۔"

ضیا نے یونہی سر ہلا دیا۔

"ہاں بھئی ہم تو آج ہی آئے ہیں۔" منصور بولا۔ "آپکے دم سے رونق دوبالا ہو گی"

"ذرہ نوازی ہے۔ ضیا مسکرایا۔

باتیں ہوتی رہیں بالآخر فیصلہ یہی ہوا۔ کہ پکنک کا پروگرام آج ملتوی کر دیا جائے۔ چائے

ہوٹل میں پی کر صرف گھومنے پھرنے تک ہی تفریح کو محدود رکھا جائے۔

چار بجنے سے تھوڑی ہی دیر پہلے سب تیار ہو کر باہر نکلے۔ پچھلی عمودی چڑھائی سے اُوپر جانے کا تجربہ کیا گیا۔ آصفہ، سنبلا، سعید منصور اور ضیا بمشکل قدم جما جما کر آگے بڑھ رہے تھے۔ کبھی کوئی پیچھے رہ جاتا۔ کبھی کوئی بہت آگے نکل جاتا اور جہاں کہیں کسی کا پاؤں کسی ناہموار جگہ پہ پڑنے سے پھسل کر گرنے کی صورت پیدا ہوتی۔ بے تحاشا چیخیں گونج جاتیں۔

ایک دفعہ تو سنبلا کھڈ میں گرتے گرتے بچی۔ آصفہ نے کتنا راستہ ضیا کے بازو کو مضبوطی سے پکڑے پکڑے طے کیا۔ ذرا پاؤں لڑکھڑاتا۔ وہ چیخ کر ضیا کا بازو سختی سے پکڑ لیتی۔

چند دن پہلے اگر یہ موقع ہوتا۔ تو اللہ جانے ضیا کی کیا حالت ہوتی۔ لیکن آج تو وہ آصفہ کو یوں سنبھالا دیتے ہوئے تھا۔ جیسے وہ واقعی ننھی سی بچی تھی۔

اُوپر والی صاف و شفاف سڑک پر آ کر سب نے لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لیتے ایک دوسرے کو مسکرا مسکرا کر یوں دیکھا جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ پھر سانسوں کو ہموار کرنے میں بھی کئی ساعتیں لگیں۔

پھر سب باتیں کرتے چہل قدمی کرتے ہوئے سڑک پہ چلنے لگے۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ فیشن پریڈ میں شرکت کے لئے دوڑ لگ رہی تھی۔ کئی جوڑے، سہیلیوں کے جھنڈ، دوستوں کے جمگھٹے۔ سڑک اب بھری بھری نظر آ رہی تھی۔

"وہ۔ وہ" اچانک سعید باتیں کرتے کرتے سامنے سے آنے والے لوگوں کو دیکھ کر بولا۔

"کیا ہے ضیا نے پوچھا۔"

"آصفہ" سعید نے ضیا کی بجائے بہن کی طرف دیکھا "یہ سامنے سونیا نہیں آ رہی۔"

"کہاں! ہاں وہی ہے۔" آصفہ بولی۔

"ساتھ شاہد بھی ہے۔" سعید نے کہا

"ہاں وہی لگتا ہے" آصفہ بولی۔ سعید نے زیر لب کہا "اُلو کا پٹھا۔" آصفہ مسکرانے لگی۔

سنبلا ضیا اور منصور بھائی بہن کی گفت و گو سے سمجھ کچھ نہ پائے۔ کبھی سامنے سے آنے والوں اور کبھی ان دونوں کو دیکھنے لگے۔

"کس ذات شریف کو بے نقط سنائی جا رہی ہیں۔" سعید جانے کیا کیا بکے جا رہا تھا۔ کہ ضیا مسکرا کر بولا۔

"کوئی رقیب رُوسیاہ ہوگا" منصور نے یونہی ہنس کر کہہ دیا۔

"واقعی منصور بھائی" آصفہ ہنسی

"سچ۔" ضیا نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ اور ہاں۔" سعید نے چڑ کر کہا "بتایا ہوتا۔ تو اس چڑی مار کہ انسان کو مسل کے رکھ دیتے ہم۔"

آصفہ اور سنبلہ کھلکھلا کر چڑی مار کہ لفظ پہ ہنس دیں۔ ضیا جیسے گرانڈیل انسان کے سامنے دبلا پتلا شاہد واقعی چڑی مار کہ انسان لگتا تھا۔

پھر آصفہ ہنس ہنس کر سعید کو شوخی سے دیکھ دیکھ کر سب کو بتانے لگی کہ جس لڑکی کو سعید نے پسند کیا۔ اسے شاہد لے اڑا۔

"وہ ہے کون۔ کیسی ہے۔" منصور نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میری کلاس فیلو ہے۔ بہت خوب صورت ہے۔ لیکن ان کے کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی اس کی دوستی شاہد صاحب سے پکی ہو گئی۔"

"اوہو بہت افسوس کی بات ہے۔" ضیا نے کہا۔

سامنے سے آنے والے قریب آ گئے تھے۔ شاہد اور سونیا کے ساتھ دو تین نوجوان اور بھی تھے۔ تعارف کا مرحلہ طے ہوا۔ سونیا نے تینوں نوجوانوں کو اپنا کزن کہہ کر متعارف کرایا۔

سونیا کی تمام تر توجہ ضیا کی طرف مبذول ہو گئی۔ سب نے انکی نظروں کا نشانہ

محسوس کرتے ہوتے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ضیاء اس مختصر[illegible]
لڑکی کو دیکھنے لگا۔

"آپ کب آئے۔"

"کہاں ٹھہرے ہیں۔"

"کتنے دنوں کا پروگرام ہے۔"

دونوں طرف سے اسی قسم کے سوال و جواب ہو رہے تھے۔ ضیاء [illegible]
سا کھڑا تھا۔ سونیا کی نگاہوں کا والہانہ پن اسے اب کچھ کوفت دینے لگا تھا۔

"آپ بھی کراچی سے آئے ہیں؟" سونیا نے براہِ راست ضیاء سے پوچھا۔

"یہ ڈیل ڈول کراچی کا لگتا ہے؟" سعید نے ہاتھ سے ضیاء کی سراپا کی طر[illegible]
کرتے ہوئے کہا۔

"لگتے تو پٹھان ہیں۔ غالباً پشاور سے آئے ہیں۔" سونیا نے شوخ نظروں
کو دیکھا۔ گرے رنگ کے شلوار قمیض اور سٹیل گرے جیکٹ میں وہ واقعی پٹھان
تھا۔ چمڑے کے بھاری پشاوری چپل بھی تو پہن رکھے تھے۔

"قیافہ تو خوب لگایا آپ نے۔ لیکن غلط ہے۔" آصفہ نے کہا۔ "آپ لا[illegible]
رہنے والے ہیں۔"

"پتر پنج دریاواں دا۔" سعید نے ضیاء کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہو[illegible]
کر کہا۔

"شیر ببر۔" منصور ہنسا۔

اور پھر سنبلہ، آصفہ، منصور اور سعید کو جتنی پنجابی فلموں کے پتر کے [illegible]
نام یاد تھے باری باری لینے لگے۔ سڑک کے عین بیچوں بیچ رک گئے [illegible]

مذاق میں مشغول ہو گئے۔ ضیاء سب کو جھک جھک کر ان القابات پر نوازش
[illegible] کہنے لگا۔

سونیا کی نگاہیں اچھے خوب جانچ پرکھ رہی تھیں۔ آصفہ کو دل ہی دل میں برا
[illegible] رہا تھا۔ سونیا تو چاہنے ان کے ساتھ ہی واپس لوٹ جاتی۔ آصفہ نے دعوت
دی اور سب سے چلنے کا کہتے ہوئے معذرتانہ انداز میں بولی۔ "ہمیں ضروری جانا
[illegible] ہے، ملیں گے۔"

سب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے مخالف سمتوں میں چل دیے۔

سنبلہ اور آصفہ آگے آگے تھیں۔

سعید، منصور اور ضیاء کو سونیا کے متعلق بتانے لگا۔

"بہت واہیات لڑکی ہے۔" منصور بولا۔ "ویسے انداز قاتلانہ ضرور ہیں۔"
اونچے طبقے میں بڑا اثر و رسوخ رکھتی ہے۔ ضیاء کو خوب جانچ پرکھ رہی تھی۔" سعید
[illegible] پھر ضیاء کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "بچے بچ کے رہنا۔ پیچھا
چھوڑے گی نہیں۔"

"میرا کیا بگاڑے گی۔" ضیاء ہنسا۔ "بچ کے تم رہو کہ کراچی میں رہتے ہو۔"

"میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں یہ اجنبیوں کو پھنساتی ہے۔" سعید ہنسا۔

اور اجنبی کے حوالے سے ضیاء کی آنکھوں میں شہلا کا چہرہ لہرا گیا۔

کیا خبر سونیا بھی شہلا ہی طرح ضرورت کے ہاتھوں بکی ہوئی کوئی مسخ شدہ
شخصیت ہو۔ ضیاء نے سوچا۔

وہ سوچتا ہی چلا گیا۔

اسے شہلا کے ساتھ ساتھ سونیا سے بھی ہمدردی ہونے لگی۔ اس کا جی چاہنے

لگا کہ شہلا کی طرح سونیا کے متعلق بھی تفصیل سے سب کچھ معلوم کرے۔ اس کے خول کے اندر جھانک کر دیکھے۔

چائے کے دوران سبھی ہنستے مسکراتے رہتے۔ ضیاء بھی ساتھ دے رہا تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں شہلا اور سونیا کے پیکر متحرک رہے تھے۔

پانچ بجنے میں پندرہ منٹ تھے کہ اس نے سب دوستوں سے معذرت چاہی اور عزیزہ سے ملنے کے بہانے جدا ہو گیا۔

وہ سوتے ہوٹل جیسے ہواؤں کے دوش پر اڑتا چلا جا رہا تھا اس کے قدم بدمست شرابی کی طرح بہک رہے تھے اس کی آنکھوں میں ستاروں کی چمک تھی اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

خاتون کے عشق میں وہ اس حد تک ڈوب چکا تھا کہ انجام و عواقب سے بےخبر ہو گیا تھا۔ یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو رہی تھی کہ وہ کیا ہے اور کیا کر رہا ہے۔

ذہن میں لذتِ احساس کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔

وہ ہوٹل کی ڈھلان پر تیزی سے اتر کر برآمدے میں آیا اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح خاتون کے کمرے کی طرف بڑھا۔

لیکن

خاتون وہاں نہیں تھی۔

کمرہ خالی تھا اور کسی نئے مکین کا بند سامان وہاں پڑا تھا۔

وہ جا چکی تھی۔ ہوٹل کے ملازم نے اسے بتایا۔

ضیاء کو یوں لگا جیسے زمین اپنے محور سے ہٹ گئی ہو۔ آسمان ٹوٹ کر

زمین پر آن پڑا ہو۔ ہر چیز درہم برہم ہو گئی ہو۔ کائنات کی طنابیں ٹوٹ گئی ہوں اور ہر چیز اپنے آپ ہی سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئی ہو۔

کتنی ہی دیر وہ ستون سے لگا کھڑا رہا۔ ہوٹل کا ملازم جا چکا تھا۔

ضیاء کو یوں لگا۔ جیسے خاتون دھوئیں کا بادل تھی جسے مٹھی میں پکڑنے کی اس نے کوشش کی تھی۔

مٹھی کھلی تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

کچھ بھی نہیں۔

سوائے لذتِ احساس کے۔

ہم تو آئینے ہوتے ہیں. عکس بھی ہماری ہی وجہ سے کچھ حیثیت رکھتے ہیں
جب تک سلامت ہیں عکس بھی ٹھیک ٹھاک اور جب ٹوٹ پھوٹ جائیں تو عکس بھی
آڑھے ترچھے اور بے ہنگم سے ہو جاتے ہیں۔ ضیاء کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔

پہاڑ۔ پہاڑ کی رونقیں۔ دوستوں کی صحبت حتیٰ کہ آصفہ بھی تڑختے ہوئے آئینے
میں بے ہنگم اور بے قاعدہ نظر آنے لگی تھی۔ رات گزارنا مشکل ہو گیا۔ منہ سر لپیٹ کر
پڑا رہا۔ سعید، منصور جس نے بھی بلانے کی کوشش کی اسی سے الجھ گیا۔ مما، ڈیڈی نے
بھی اس کی طبیعت کا بوجھل پن محسوس کیا۔ اور آصفہ تو سہم ہی گئی۔ سونے سے
پہلے اس نے صبح واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

سب نے اسے روکنا چاہا۔ لیکن وہ رکا نہیں۔ علی الصبح وہاں سے گھر کے لیے
روانہ ہو گیا۔

کسی کو اس کے یک لخت پلٹنے کی سمجھ نہ آئی اس کی پریشانی محسوس سبھی کر رہے
تھے۔ لیکن کسی کو تو کیا اس نے تو سعید کو بھی کچھ نہیں بتایا اس نے کریدا وہ مسکرا کر
رہ گیا۔

بتاتا بھی کیا؟

ہم اپنے وجودوں کو عارضی سہاروں سے سنبھالا دینے کے عادی ہیں اسی لیے تو

ہم بے باک نہیں نڈر نہیں سچے نہیں۔ بات کرتے ہوتے ڈرتے ہیں۔ سچ کہتے ہوتے
جھینپتے ہیں۔ خوفزدہ رہتے ہیں کہ کہیں خوش نما عارضی سہاروں کے خول ان دھچکوں سے
بکھر نہ جائیں اور ہماری اصلی صورت سب کے سامنے نہ آجائے۔

مما ڈیڈی نے رک جانے کا اصرار کیا تو ضیاء نے مسکرا کر معذرت کر دی۔ سعید نے
بہت کریدا تو شانی کے خط کا ذکر کر دیا۔

سوٹ کیس میں کپڑے بند کر رہا تھا تو آصفہ آگئی۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے مجسم
سوال بن گئی۔ طبیعت کی اس اچانک تبدیلی کا دبے لفظوں میں ذکر کیا۔

"ایکا ایکی جانے کا پروگرام بنا لیا۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"جی ہاں" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

"کیوں؟" آصفہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوتے اداس لہجے میں بولی۔

"میں جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا" ضیاء چڑ گیا۔

آصفہ نے گھوم کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ضیاء اتنا کٹھور کیوں بن گیا تھا
ایسے تلخ لہجے میں کیوں باتیں کر رہا تھا۔ چڑ جانے کی نوبت کیوں آئی تھی وہ تو مجسم
خلوص و مروت تھا۔ چاہت اور محبت کی علامت تھا۔ اسے کیا ہو گیا تھا۔ کیا ہو
رہا تھا"

آصفہ ضیاء کی ذات کے اندر جھانکنا چاہتی تھی وہ کٹار دیکھنا چاہتی تھی جو ضیاء
کو من ہی من میں اس بری طرح کاٹ رہی تھی۔ مجروح کر رہی تھی۔ توڑ پھوڑ رہی تھی۔
دوستی اور پسندیدگی اسی بات کے متقاضی تھے۔

وہ چند لمحے ضیاء کو دیکھتی رہی۔ کچھ ملامت سے بولی۔ "آپ بہت پریشان لگ
رہے ہیں۔"

وہ پیشانی پر بل ڈال کے رہ گیا۔ اس وقت آصفہ کی ذات اسے گوفن دے رہی

وہ اپنے آپ میں جل رہا تھا۔تڑپ رہا تھا۔دکھ اور کرب کے احساس سے کچلا جا رہا تھا
اسے اس وقت تنہائی کی ضرورت تھی۔اس تنہائی کی جس میں اس کی اپنی ذات کا بھی
دخل نہ ہو۔

"کیا بات ہے ضیاء۔کیوں پریشان ہیں آپ بتائیں گے نہیں۔" آصفہ نے بڑے
پیار سے کہا۔

"اوہ۔خداوندا۔ ضیاء۔ کو جانے کیا ہوا۔سوٹ کیس غصے سے دور پھینکا اور
چیختے ہوئے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔"

"ضیاء" آصفہ ڈر گئی۔

"خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔" ضیاء بے چارگی سے بولا۔

آصفہ اس کی پریشانی محسوس کر کے دکھ گئی۔اس کی بات کا برا ماننے کی بجائے
سراپا شفقت بنتے ہوئے بولی۔"آپ یقیناً بہت پریشان ہیں۔ایسی حالت میں
آپ کو کبھی سفر کرنے نہ دوں گی اور سفر بھی بس سے۔"

"تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی۔" ضیاء جیسے پھٹ پڑا۔

آصفہ کانپ گئی۔چہرہ زرد پڑ گیا۔روہانسی ہو کر صرف اتنا کہہ سکی۔"تمہیں کیا ہو
رہا ہے۔ضیاء۔"

"جاؤ گی نہیں یہاں سے۔" ضیاء۔بدتمیزی پر اتر آیا۔خونخوار نظروں سے آصفہ کو
دیکھتے ہوئے چند قدم آگے بڑھا۔

آصفہ کا موڈ بگڑ گیا۔غصے سے آنکھیں شعلہ فشاں ہو گئیں۔لب بھینچ لیے
اور کانپتے ہوئے بولی۔"اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگے ہیں آپ۔ہونہہ۔"

اور

وہ

نفرت و حقارت سے ضیاء۔پر ایک جلتی ہوئی نگاہ ڈالی اور کمرے سے نکل گئی۔

ضیاء۔نے اپنا چکراتا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔کئی لمحے وہ ساکت و صامت
کھڑا رہا۔پھر بستر میں اوندھے منہ گر گیا۔

اسکی سوچ مفلوج تھی۔

اس کا ذہن جل رہا تھا۔

اور

اس کا دل خون ہو رہا تھا۔

آصفہ نے اس کی بیزاری کو شدت سے محسوس کیا تھا۔رکھائی کا رویہ اپنا کر
اس نے اپنی ذلت کا بدلہ لینے کی کوشش کی۔

کمرے سے باہر منصور اور سعید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ضیاء۔کی باتیں
کر رہے تھے۔

"کوئی ذاتی معاملہ ہی ہو سکتا ہے۔"

"جانے کسی رشتہ دار کے ہاں گئے تھے شام۔"

"وہیں کچھ گڑبڑ ہوئی۔"

"لگتا یہی ہے۔ضیاء۔تو کہہ رہا تھا۔رات وہ اسے روک لیں گے۔بلکہ وہ لوگ
چاہتے ہیں کہ اپنا بوریا بستر گول کر کے انہی کے پاس چلا آئے۔"

"لیکن یہ تو آدھ گھنٹے بعد ہی لوٹ آئے۔"

"ہاں رمضو نے یہی بتایا۔"

"مما بھی تو گھر پہ ہی تھیں۔"

وہ بتا رہی تھیں کہ ضیاء۔جب واپس آیا تو بڑی بری حالت تھی۔لڑکھڑاتے ہوئے
کمرے تک پہنچا۔رنگ بالکل سپید تھا۔آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔وہ تو ڈر ہی گئی تھیں

ان کی حالت دیکھ کر۔

"مجھ سے تو اس نے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔"

"لیکن اب تو ضرور چھپا رہے ہیں۔"

"کوئی انتہائی ذاتی قسم کی بات ہی ہو گی۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔"

"لیکن اسے ایسا ایکدم واپس تو نہیں جانا چاہیے۔ ہم لوگوں کا کیا قصور۔"

"کچھ بتائے تو مداوا بھی ہو۔"

"بالکل کچھ نہیں بتاتا۔"

"رات کا کھانا نہیں کھایا۔"

"نہ ہی صبح کا ناشتہ کیا ہے۔"

"اور اب مُصر ہے کہ اسی وقت واپس جاؤں گا۔"

"اچھے جگری دوست ہو تم۔ چلو سب کو نہ سہی تمہیں تو اعتماد میں اسے ضرور لینا چاہیے۔"

"مجھے تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کہ کیا بات ہے؟"

وہ باتیں کر رہے تھے کہ آصفہ کمرے سے نکلی۔ بپھری ہوئی۔ تلملاتی ہوئی۔

"کوئی بات نہیں یونہی اپنی اہمیت جتا رہے ہیں۔" وہ رکھائی سے اتنے زور سے بولی کہ ضیاء سن پاتے۔

"آصفہ!" سعید نے سرزنش کرتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

وہ زمین پر پاؤں سے ٹھوکر مار کر تنفر کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ آپ لوگوں نے بار بار پوچھ کر اسے سر چڑھا لیا ہے۔ وہ جا رہا ہے تو جانے دیں۔ کونسا قیامت ٹوٹ پڑے گی

اس کے چلے جانے سے

"آصفہ" سعید نے تلخ لہجے میں اسے ڈانٹا۔

"بڑا سمجھتا ہے کچھ اپنے آپ کو" آصفہ کے پندار کو ٹھیس لگی تھی۔ اس نے نفرت سے کہا۔

اور سعید اسے بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے نہ جاتا تو جانے وہ اور کیا کچھ کہہ ڈالتی۔

ضیاء نے اس کی باتیں سنیں۔ زخموں پر جیسے کسی نے پھاہا رکھنے کی بجائے مرچیں چھڑک دیں۔ اسے اپنے رویے پر ندامت بھی ہوئی۔ آصفہ سے بری طرح پیش آنے کا افسوس بھی ہوا۔

لیکن وہ مجبور تھا۔

سائے کے تعاقب میں وہ اس تیزی سے دوڑ پڑا تھا کہ گرد اگرد پھیلی مجسم چیزوں کا احساس رہا تھا نہ اہمیت۔

اس کے دل و دماغ پر تو صرف

اور

صرف! خاتون کے ساتھ گزری ہوئی نشاط کی گھڑیاں سوار تھیں یا اس کے بچھڑ جانے کا کربناک دکھ۔

وہ

واقعی اجنبیوں کی بھیڑ میں گم ہو گئی تھی۔ ضیاء سمجھ نہ پا رہا تھا کہ اسے کیسے اور کہاں ڈھونڈے گا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے خاتون کے بغیر وہ زندہ ہی نہ رہ سکے گا۔ کل تک خاتون اس احساس کو نہ چھو سکی تھی۔

لیکن۔

آج

آج خاتون اسکی پوری کائنات تھی۔ زندگی تھی۔ روح تھی۔

ہمارے وجودوں کے اندر جذبات کا بڑا ہی مستحکم وجود ہوتا ہے۔ ضیاء کا اپنا
وجود اس مضبوط و مستحکم وجود کے سامنے بھربھری مٹی بنتا جا رہا تھا۔

اور

پیشتر اس کے کہ جذبات کا وجود ننگا ہو کر ہر ایک کو نظر آنے لگے وہ یہاں سے
چلے جانا چاہتا تھا۔

اسی میں بہتری تھی۔

اور یہی مصلحت کا تقاضا تھا۔

ایک بجے کی بس سے اس نے واپسی کا پروگرام بنایا۔

مما پپا، منصور، اور سنبلہ اسے گھر سے باہر تک چھوڑنے آئے ان میں آصفہ نہ تھی
خفت سے سر جھکائے ہوتے وہ اندر آیا۔ آصفہ اپنے کمرے میں اجنبی اور بیگانہ
بنی بیٹھی تھی۔

مجھے معاف کرنا آصفہ۔ میں نے بڑے درشت لہجے میں تم سے باتیں کیں
دراصل۔ دراصل۔

وہ چند لمحے رکا اور پھر بولا "چلو جانے دو۔ برا نہیں ماننا۔ اس وقت میں شاید
اپنے آپ میں نہیں تھا۔"

"شکریہ۔" آصفہ نے مسکرا کر جس انداز سے کہا۔ ضیاء کو اچھی طرح محسوس ہوا کہ
وہ لگاؤ اور چاہت کے ہر بندھن کو کاٹ چکی ہے۔

سوچنے کا موقع تھا نہ وقت۔ وہ "خدا حافظ" کہتے ہوتے واپس مڑا۔ آصفہ نے
کوئی جواب نہ دیا۔

نوکر اس کا سوٹ کیس اٹھا کر آگے آگے جا رہا تھا اور وہ سعید کے ساتھ چپ چاپ
چل رہا تھا۔

"تمھیں ہوا کیا ہے دوست" سعید نے دردمندی سے ایک بار پھر پوچھا۔

"ضیاء کی آنکھیں شدت کرب سے پھٹ رہی تھیں۔ چہرہ بالکل سپید تھا ہونٹ
خشک تھے۔ گلا رندھا ہوا تھا۔ بے چارگی سے بولا۔ سعید بہتر ہے۔ تم بار بار نہ
ہی پوچھو۔"

"پھر بھی مجھے تشویش تو ہو رہی ہے۔"

"میں تمھارے خلوص اور محبت کے سامنے شرمسار ہوں۔"

"بات نہیں بتاؤ گے؟"

"نہیں۔"

سعید نے اس غیر مبہم نفی پر چونک کر ضیاء کو دیکھا۔

ضیاء بڑی کوشش اور ہمت سے مسکرایا "بس یہ سمجھ لو کہ مجھے سخت ذہنی صدمہ
پہنچا ہے۔ اتنا کہ میں خود حیران ہوں۔ زندہ کیسے رہا ہوں۔"

"صدمے کی نوعیت؟"

"میں بتا نہیں سکتا۔ مجھے نہ کریدو سعید۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ میرا دل بند
ہو جائے گا۔ مجھ سے ذرہ بھر بھی ہمدردی ہے یا پیار ہے تو اس بارہ میں اب
کچھ نہ پوچھنا۔"

"تمھاری مرضی۔"

"ہو سکتا ہے اس صدمے کو جھیل جاؤں تو میں سب کچھ تمھیں بتا بھی
دوں۔"

"شکریہ۔"

" ناراض نہ ہو دوست - میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں - مجھے تمھارے پیار اور خلوص کی پہلے سے بھی کہیں زیادہ ضرورت ہے۔"

" اچھی ضرورت ہے ؟ - ضرورت ہوتی تو یوں دامن چھڑا کر بھاگ نہ جاتے یہیں رک جاتے -

ضیاء نے گھبرا کر سر نفی کے انداز میں زور زور سے ہلایا -

" سعید میں یہاں رہا - تو ختم ہو جاؤں گا - میں یہاں سے فوراً چلا جانا چاہتا ہوں - فوراً -"

" جیسے تمھاری مرضی -"

" چند دنوں میں سنبھل گیا تو شاید پھر آجاؤں - فی الحال مجھے خوشی سے جانے کی اجازت دو - میرے لیے یہی بہتر ہے - یہی سودمند ہے -"

سعید کو مجبوراً چپ ہونا پڑا - ضیاء اکھڑا اکھڑا - پریشان پریشان واپس چلا گیا -

اکثر

جو ہم چاہتے ہیں -

وہ نہیں ہوتا

اور

جو نہیں چاہتے

وہ ہو جاتا ہے

اور ایسا ہونا ذہن کو منتشر کر دیتا ہے - ضیاء کا ذہن بھی منتشر ہو گیا تھا

" بھیا آپ کو کیا ہو گیا ہے "

" ایسے بدمزاج ہو گئے ہیں - کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں -"

" ہر وقت الجھے الجھے رہتے ہیں -"

" نوکری نہیں ملتی تو ہمارا کیا قصور -"

" بھوکوں تو نہیں مر رہے ہم لوگ مل ہی جائے گی نوکری بھی -"

" پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرنا چاہیے نا -"

ضیا جب سے واپس آیا تھا - شانی کے لئے دردِ سر بنا ہوا تھا - کبھی اس کا دماغ چاٹتی - کبھی ضیا کے سر چڑھتی - رابعہ بیگم بھی ضیا کی پریشانی اور ذہنی الجھاؤ محسوس کرتی تھیں - دبے دبے لفظوں میں پوچھا بھی تھا - ضیا نے جان چھڑانے کو بیروزگاری کی پریشانی بتلائی تھی - امی کے پاس ہمدردانہ تسلیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا -

ضیا مجسم تلاش بنا ہوا تھا - اونچے اونچے ہوٹلوں کے چکر کاٹنے میں اس نے کوتاہی نہیں کی تھی - کئی دفعہ ہوائی اڈے پر پہنچا تھا - سٹیشن پر گھومتا رہتا تھا - راہ چلتی شاپنگ کرتی - فنکشنوں میں شمولیت کے لئے گاڑیوں میں جاتی جن جن عورتوں پر اسے شہلا کا گمان ہوتا لپک کر ان تک جاتا -

لیکن

شہلا
تو گرفت سے نکلا ہوا لمحہ تھی۔
بھولا بسرا خیال تھی۔
حال سے کٹ کر بچھڑ جانے والا ماضی تھی۔

دکھ تو ضیا کو اس بات کا تھا کہ وہ اس کا اصل نام و مقام تک نہ جانتا تھا۔ اسے اپنے نام کے متعلق بھی یقین دلایا تھا۔ کہ یہ فرضی ہے۔

وہ ہر وقت خاتون ہی کے خیال میں ڈوبا رہتا۔ ملن کی حسین گھڑیوں کی سہانی سے لپٹا رہتا۔ خاتون کی قربت کا لذت بخش احساس اس کے اعصاب پر مسلط رہ

جس عورت کے لئے وہ اخلاق کی حدوں سے بھی گزر گیا تھا۔

جس کے لئے اس کے دل میں ہمدردی کے سوتے ابل پڑے تھے۔

جو زمانے بھر میں واحد مظلوم ہستی نظر آتی تھی۔ جس کے زخموں پر اس نے پھایا ر تھا۔ جس کے غم اس نے اپنے سینے میں سمیٹ لینے تھے۔

وہ

وہ

ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئی تھی۔ کبھی واپس نہ آنے کے لئے جا چکی تھی۔

کاش وہ خاتون سے نہ ملا ہوتا۔ اس کا دکھ نہ دیکھا ہوتا۔ اس کی مجبوری نہ محسوس ہوتی۔ اور اگر ملا بھی تھا۔ تو خاتون کے اصولوں پہ ہی عمل پیرا ہوتا۔

اجنبی بن کر ملتا۔
اجنبی بن کر رہتا۔
اور
اجنبی بن کر ہی بچھڑ جاتا۔

دکھ کرب اور کوفت کے ان لمحات سے دوچار تو نہ ہوتا۔ وقتی نشاط حاصل کر کے۔ سرور و کیف میں ڈوب کر جب خاتون سے جدا ہوتا۔ تو ذہن میں صرف لذت احساس ہی رہتی۔ سوچا تو اس نے یہی تھا۔

لیکن

ایسا نہیں ہوا تھا۔

بعض اوقات ہم اپنی شناخت بھی تو نہیں کر پاتے۔ ضیا بھی ملن کے لمحوں میں اپنی شناخت نہ کر پایا تھا۔ احساس تو بچھڑ جانے کے بعد اسے اب ہو رہا تھا۔ جب وہ بکھر بکھر رہا تھا۔ اجڑا اجڑا گیا تھا۔

کئی شب و روز گذر گئے۔ وہ جذبات کے شکنجے پر چڑھا رہا۔ جھوٹی سچی باتیں کر کے اس کو بہلاوے دیتا رہا۔

شانی کو پھسلاتا رہا۔

دن گذرتے چلے گئے۔

وقت بہت بڑا طبیب ہے۔ زخموں پر پھاہا رکھ ہی دیتا ہے۔ اور انسانی فطرت بھی تو عجیب و غریب ہے۔ پارے کی طرح مضطرب رہتی ہے۔ ایک مقام پہ قیام ہی نہیں ہوتا۔

یہ بھی اچھی ہی بات ہے ورنہ دنیا میں انسان بات بات پہ مرجاتے۔ نازک مزاج انسان کو خدا نے جھیل جانے کی قوت بھی فراخدلی سے ودیعت کر دی ہے۔

ضیا بھی جذباتی جھٹکوں سے نکل کر سنبھلا۔ موازنے اور مقابلے کی صلاحیت عود آئی۔ دلجمعی سے خاتون کے متعلق سوچا۔ سکون سے اس کے معاملے کی جانچ پڑتال کی اپنی اخلاقی لغزش کا خیال کیا۔ تو اسے یوں لگا جیسے وہ دلدل میں پھنس رہا تھا۔ اپنے سے عمر میں کئی سال بڑی جہاندیدہ۔ پختہ ذہن عیاش عورت کے لئے یوں دیوانہ بن جانا

اسے مضحکہ خیز لگنے لگا۔

وہ ایسا تو نہ تھا۔ اخلاق و کردار کی عظمتوں کا قائل تھا۔ جنس حیوانی جذبہ تھا وہ تو انسان تھا۔ مگر بندھے اصولوں کا قائل۔ حد بندیوں کا علمبردار۔ معاشرے کی لگائی ہوئی قیود سے بغاوت کا اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس خوبصورت عورت نے اسے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنی نظروں میں آپ ہی سبک ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو خوب لعن طعن کی۔ اپنے آپ پہ تمسخر سے ہنسا۔

وہ جوں جوں اس بارے میں سوچتا گیا۔ اس کے دیوانہ پن میں کمی آتی گئی۔ اب وہ اک موڑ پہ آکر ٹھہر گیا تھا۔ کبھی کبھی برملا وہ اس خاتون کو برا بھلا کہنے لگتا۔ ملامت کرنے لگتا۔ اس سے نفرت کی کوشش میں لگ جاتا۔

لیکن

ناداں تھا۔ یہ سب فرار کے طریق تھے۔ وہ جانتا تھا۔ کہ خاتون کا وجود اب بھی اس کے لئے کھلا چیلنج ہے۔ اس سے ملنے کی خواہش اسے پانے کی تمنا اور اس کی قربت میں لٹ جانے کی آرزو دائم و قائم تھی۔

جو کچھ بھی تھا۔ اس نے اب اپنے آپ پر ظاہرداری کا لبادہ اچھی طرح ڈال لیا تھا۔ دوستوں سے ملنا۔ گھر میں شانی سے گپ شپ لگانا اور امی سے پیار کی باتیں کرنا پھر سے معمول بنا لیا تھا۔ زندگی الجھاؤ سلگاؤ کے باوجود اپنے متعین راستے پر پھر سے چلنے لگی تھی۔

ہاں

کبھی کبھی دبے طرح اداس اب بھی ہو جاتا۔ اسے اپنے اندر ہی اندر کوئی شے ٹوٹ پھوٹ کر بکھرتی محسوس ہوتی۔ پہلو میں درد بھی اٹھتا۔ جو کسی وقت ناقابل برداشت بھی ہو جاتا۔ لیکن یہ ساری وارداتیں اس کی ذات کے پنجر پہ ہوتی تھیں۔ انھیں اظہار کی

راہ اس نے کبھی نہ دی تھی۔

انہی دنوں ناصر ماموں کے خط پھر سے رابعہ بیگم کے نام آیا۔ جس میں سارہ کی سالگرہ کی تقریب میں ان سب کو شرکت کی پر زور دعوت دی تھی۔

رابعہ بیگم کی راہ میں اب تو کوئی چیز بھی مانع نہ تھی۔ کئی دفعہ ضیا کے سامنے انہوں نے سارہ کا ذکر چھیڑا تھا۔ اپنی دیرینہ خواہش ظاہر کی تھی۔

ضیا نے اگر کسی بات کا اقرار نہیں کیا تھا۔ تو انکار کی صورت بھی پیدا نہ ہوئی تھی ماں بیٹی کے لئے یہی بات وجہ تسکین تھی۔ اور اسی لئے رابعہ بیگم ہنسی خوشی کراچی جانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئی تھیں۔

سارہ کے لئے رابعہ بیگم نے شوخ اور نخ رنگ کا سوٹ خریدا اور دوپٹے پر گوٹے طلے اور سلمے کا کام کروایا۔ اس کے پس پردہ جو خواہش تھی۔ اسی کام ہی کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔

جس شام رابعہ بیگم نے روانہ ہونا تھا۔ شانی وہ دوپٹہ امی کے بکس سے نکال لائی۔ ضیا بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ شانی نے دونوں ہاتھوں پہ دوپٹہ پھیلا کر اس سے پوچھا۔

"کیسا ہے بھیا"

"مجھے کیا پتہ"

"اچھا لگتا ہے"

"خوبصورت ہے"

وہ ہنس پڑی۔ اور دوپٹے کو پیار سے دیکھتے ہوئے امی سے کہنے لگی "بھیا کو اچھا لگا ہے دوپٹہ۔ امی اچھا کریں ساتھ انگوٹھی بھی لے جائیں۔ ایک دفعہ ہی سارا کام ختم کر آئیں۔"

"کیا مطلب!" ضیا نے کہا۔

"اب مطلب بھی سمجھانا پڑے گا؟"

"بالکل"

"آپ سمجھے نہیں"

"نہیں"

"ہائے اللہ"

"یہ کیا بات ہوئی"

"امی آپ ذرا سمجھائیں انھیں۔"

"شانی ہنس رہی تھی۔ رابعہ بیگم بھی مسکرانے لگیں۔ ضیا دونوں کو مسرور نظروں سے دیکھنے لگا۔ رابعہ بیگم شانو سے دوپٹہ لے کر تہہ کر کے اندر بکس میں رکھنے چلی گئیں۔

"بھیا"

"ہاں"

"امی صرف سالگرہ پر ہی تو نہیں جا رہیں"

"تو اور"

"ایک مشن اور بھی ہے"

"وہی سارہ کا بچپن کے رشتے کا۔ پرانا۔ ناکارہ مشن۔"

"ہاں بھیا۔ لیکن ناکارہ نہ کہیں"

"توبہ حد ہو گی۔ اللہ جانے یہ محترمہ آپ ماں بیٹی کے اعصاب پر کیوں سوار ہیں"

"اس لئے کہ انھیں اس گھر کی بہو بننا ہے۔"

"ہونھ"

"ہونھ نہیں بھیا۔ اب تو یہ حقیقت ہے"

"مجھے تو آپ لوگوں کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ جس لڑکی کو دیکھا ہے نہ بھالا۔ اس کی شکل صورت کا پتہ ہے نہ خیالات کا علم۔ پھر بھی آپ دونوں اسے مجھ پر مسلط کرنے کا سوچتی ہیں۔ اور پھر اسی صورت میں جب کہ میری نوکری ہے نہ کوئی اور ذریعہ معاش"

"مل ہی جائے گی نوکری"

ماموں اس رشتے سے ایک بار انکار بھی تو کر چکے ہیں۔ اتنی بڑی تحقیر کے بعد بھی امی جانے کیا سوچ کر وہاں مجھے پھنسانے کے درپے ہیں۔"

ضیا نے سنجیدگی سے کہا۔ تو شانی بھی چپ ہو گئی۔ چند لمحوں بعد جب وہ امی کے پاس کمرے میں بیٹھی تھی۔ اللہ اللہ کر کے تو ناصر سے صلح ہوئی تھی۔ ملنے ملانے کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جڑنے لگا تھا۔ دنیا امید پہ ہی تو قائم ہے۔ انہیں بھی دریں حالات امید لگ گئی تھی۔ اپنی اور امی بی کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کا موقعہ وہ کسی صورت کھونا نہیں چاہتی تھیں۔

جانے سے پہلے انھوں نے اکیلے میں ضیا کو اچھا خاصا لیکچر پلایا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے ان کی باتیں سنتا رہا۔

"ضیا،" انھوں نے لمبی چوڑی تمہید کے بعد کہا۔

"جی"

"ایک بات پوچھوں"

"وہ ماں کا منہ دیکھنے لگا۔"

"سچ بتا دینا۔"

"جی کیا"

"کیا تمہاری نظر میں کوئی اور لڑکی ہے؟"

"جی ؟"

میرا مطلب ہے کہیں اور۔ کسی اور لڑکی سے تم اپنے مستقبل کو وابستہ تو نہیں کر چکے"

وہ کچھ نہیں بولا۔

"ہے کوئی لڑکی تمہاری نظر میں۔"

"لڑکی!

"ہاں"

ضیا کی نگاہوں میں نرم وگداز مکمل عورت کا سراپا گھوم گیا۔ شہلا پوری تمکنت اور شان سے اس کے مطلع ذہن پر طلوع ہوئی۔

وہ کھو گیا

"بتاتے کیوں نہیں۔ کیا کسی لڑکی سے معاملہ طے کر چکے ہو"

"لڑکی! ضیا نے زیر لب کہا۔ اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں اداسیاں گھلنے لگیں

اس نے آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلا دیا۔

بس تو پھر اب تم چپ رہو۔ میں جانوں اور میرا کام۔ سارہ میری بہو ضرور بنے گی انشاء اللہ بنے گی۔"

امی خوش ہوگئیں۔ اور خوشی خوشی کراچی کے لئے روانہ ہوگئیں ضیا پر کئی دن چپ کی کہر چھائی رہی۔ اور شہلا کسک بن کر دل میں کروٹیں لیتی رہی۔ امی کے سامنے سارہ کے حق میں چپ رہ کر اسے یوں لگ رہا تھا۔ اس نے شہلا کی ذات اس کے وجود اور اس کی محبت کو ذبح کر ڈالا ہے۔

یہ احساس ہر دم دل میں نشتر چبھونے لگا۔ شہلا سے ذہنی بندھن توڑنے کی کوشش بیکار ہوگئی۔ درد بڑھتا گیا۔ جنوں میں شدت آتی گئی۔ تذبذب اور کشمکش

نے اسے کئی دن بے حال رکھا۔ اس کی حالت جالے میں پھنسی مکڑی کی سی تھی نکلنے کی کوشش میں زیادہ پھنسنے کی صورت بنتی جاتی تھی۔

ٹی وی پر ایک غیر دلچسپ سا پروگرام ہو رہا تھا۔ ضیا اور شانو سیٹ کھولے بیٹھے تھے
وقت گذاری کے لئے دیکھ کم اور باتیں زیادہ کر رہے تھے۔ بے لاگ تبصرہ ہو رہا تھا۔ اور
پروگرام پیش کرنے والوں کو کوسنے دیئے جا رہے تھے۔

"ہم بھی عجب بیوقوف ہیں بھیا"

"کیوں"

"اتنا بور ہو رہے ہیں دیکھ دیکھ کر۔ بند ہی کیوں نہیں کر دیتے ٹی وی"

"ٹی وی بند کر دیا تو اور بھی بور ہوں گے۔ صالح اور شائستہ آجائے تو اچھا ہی تھا"

"ہاں جی۔ آپ کو رات گئے باہر گھومنے کی چھٹی مل جاتی"

"اور کیا۔ خدا قسم میں تو آج ہی تنگ آ گیا ہوں۔ امی جانے کتنے دنوں بعد آئیں۔
کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا شانو بی۔ میں یوں قید ہو کر نہیں رہ سکتا"

"تو اکیلی میں بھی نہیں رہ سکتی بھیا جی۔ امی جب تک آنہ جائیں۔ آپ کو یہ ڈیوٹی
قہر درویش بر جان درویش نبھانی ہی ہوگی"

"مشکل"

"سارا دن تو باہر ہی رہتے ہیں۔ کیا حرج ہے جو چند دن سرِ شام ہی گھر آنا پڑے گا"

"پہلے تھوڑی بدمزہ زندگی ہے۔ جو یوں قید ہو کر اور بھی اجیرن کر لوں۔ شام دوستوں

ں کچھ اچھا وقت کٹ جاتا ہے"

"اچھا جی؟"

"ہوں۔ ویسے امی نے خواہ مخواہ ہی پروگرام بنا لیا"

"امی نے تھوڑا بنایا۔ ماموں کے خط آ رہے تھے۔ اور پھر سارہ کی سالگرہ بھی تو ہے"

"پہلی سالگرہ تو نہیں۔ امی کے بغیر آج تک سترہ اٹھارہ سالگرہ منائی جا ہی چکی ہیں"

"اب تو اور بات ہے نا۔ کیا سمجھے جناب"

"مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

"کیوں"

"بس"

"تو امی کو جانے دیتے۔ روک لیتے سختی سے"

"وہ رکنے والی تھیں"

"تو یوں کہیں کہ آپ کا اپنا دل بھی تھوڑا تھوڑا راضی تھا۔"

شانو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ضیا بھی مسکرانے لگا۔

"شانو" وہ کچھ کہنے کو تھا۔ کہ باہر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون" ضیا نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک لمبی ہانک لگائی۔

دروازہ پھر کھٹکا۔

"اے بھائی کون ہے" ضیا نے کرسی میں براجمان ہوتے ہی پوچھا۔

"بھیا باہر جا کر پتہ کریں نا" شانو بولی۔ دروازہ مسلسل کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔

"کون بیوقوف ہے" ضیا بڑبڑاتے ہوئے اٹھا۔ پاؤں میں چپل ڈالے اور انھیں
گھسیٹتا ہوا ڈیوڑھی کی طرف گیا۔

"کون ہے" ضیا نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا۔ جواب کی بجائے دروازہ

پوری قوت سے کھٹکایا گیا۔

ضیا جھلا گیا۔ اور سختی سے پوچھا "کون ہے۔ بہرے تو نہیں۔ بتاتے کیوں نہیں"

"تمیز سے پوچھیں تو بتائیں بھی" باہر سے جواب ملا۔

کان آواز آشنا تھے۔ لیکن ضیا پہلے لمحے یقین نہ کر پایا۔ جلدی سے دروازہ کھولا دوسرے لمحے وہ خوشی سے لمبی سی چیخ مارتے ہوئے سعید سے بغلگیر تھا۔

"اوہ۔ تم۔ تم۔" وہ بے یقینی سے سعید کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر بولا۔

"جی ہاں میں۔ یعنی سعید۔" سعید بھی مسرت سے بولا"

"آؤ آؤ" ضیا نے اس کے ہاتھ سے بیگ لیتے ہوئے کہا سعید اندر آگیا۔ ضیا نے دروازہ بند کیا اور اسے ساتھ لے کر صحن میں آگیا۔

"شانو۔ اے شانو۔ دیکھو تو کون آیا ہے" ضیا نے دلی خوشی سے کہا۔

شانو لپک کر باہر آئی۔ "ارے سعید بھائی۔ سلام سعید بھائی۔"

"جیتی رہو" سعید نے شفقت سے کہا۔

"آپ اکیلے ہی آئے۔"

"اور کون آتا ساتھ"

"آصفہ باجی۔"

"تم کبھی آئی ہو ہمارے ہاں۔ جو آصفہ آئے"

"ہائے بھائی جان۔ آصفہ باجی کو بھی لاتے ساتھ"

سعید مسکرانے لگا۔

تینوں ڈرائینگ روم میں آگئے شانو چند لمحے سب کا حال احوال پوچھتی رہی

"تم کہاں سے ٹپک پڑے" ضیا نے سعید کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے پیار سے پوچھا

"کیوں ناگوار گزرا میرا آنا" سعید نے مسکرا کر پوچھا۔

"بڑا خوشگوار۔ اس لئے کہ میں بہت بور ہو رہا تھا۔" ضیا زور دے کر بولا۔

ضیا نے امی کے ماموں کے ہاں جانے اور اپنے گھر میں مقید ہونے کی بات بڑے مضحکہ خیز انداز میں بتائی۔ سعید اور شانو ہنسنے لگے۔

"اچھا بھئی۔ کھانا وانا۔" ضیا نے سعید سے کہا۔

"کھانا میں کھا چکا ہوں چائے ضرور پیونگا۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔

چلو شانی اچھی سی چائے بنا دو۔ اور سعید کے لئے میرے کمرے میں بستر بھی لگ جائے۔ ہوں۔ ٹھیک۔"

شانو سر دھیرے سے ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ ضیا سعید کے سامنے آبیٹھا۔

کیسے آنا ہوا۔"

یار عجب مہمل سوال کرتے ہو۔ میں پہلے کبھی نہیں آیا۔"

"تو اپنے کام سے آئے ہو"

نہیں صرف تمہارا پتہ کرنے۔"

"کیوں"

"پہاڑ سے جس حالت میں تم فرار ہوئے تھے۔ مجھے بڑی تشویش تھی۔"

"اوہ۔"

ضیا کے مسکراتے چہرے پر جیسے تاریکی کے سائے لہرا گئے۔

"سوچا کراچی جانے سے پہلے تمہارا پتہ کرتا جاؤں"

"واپس جا رہے ہو۔"

"ہاں"

"آنٹی وغیرہ"

"وہ پنڈی ہیں۔ صبح نو بجے کی فلائٹ سے کراچی جا رہی ہیں۔ میں ادھر آگیا۔
صبح یہاں سے کراچی چلا جاؤں گا۔"

سعید اپنے پروگرام کا بتانے لگا۔ آصفہ اور مما ڈیڈی کے ساتھ تھیں۔ سنبلہ اور منصور چند
دن ہوئے جا چکے تھے۔ اور بھی کچھ عزیز آئے تھے۔ انھیں گاڑی سے واپس بھجوا کر
یہاں آیا تھا۔ باتوں باتوں میں وہ ضیا سے مری سے یوں بھاگ آنے کی وجہ بھی پوچھ

ضیا پھیکی پھیکی بے رنگ سی مسکراہٹ ہونٹوں پہ لیے سعید کو ٹالنے کی کوشش
کرنے لگا۔

"کچھ تو ہوا تھا" سعید نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

ضیا نے آہستگی سے سر نفی کے انداز میں ہلایا۔

اب تو حواس درست ہیں۔" سعید ہنسا۔" پھر بھی چھپانے کی کوشش کر رہے
"کوئی ایسی بات ہی نہیں۔ مجھے تو خود سمجھ نہیں آتا۔ کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اس د
میں نے آصفہ سے بھی بڑی بدتمیزی کی۔ خیال آتا ہے تو سخت متاسف ہوتا ہوں
سعید ہنس پڑا۔" آصفہ تمہارے نام سے بھی الرجک ہے۔"

"ہونا چاہیے۔"

خیر چھوڑو اسے۔ شکر کرو تم آ گئے تھے اس دن۔ ورنہ بعید نہ تھا۔ آصفہ تم سے کہ
زیادہ بدتمیزی پہ اتر آتی۔ توبہ کرو۔ اس نے کبھی کسی کی گھرکی تک برداشت نہیں کی
تو اس سے الجھ پڑے تھے۔"

ضیا نادم سا ہو کر بولا۔" دراصل میں بہت پریشان تھا۔ وہی تو میں پوچھ رہا ہ
ضیا۔ یقین مانو گرمی میں ٹرین کا سفر محض اسی لیے کر کے آیا ہوں۔ کہ تمہاری خیر خبر لیتا جا

"بہت بہت شکریہ۔ ویسے میں اب بالکل نارمل ہوں۔" ضیا ہنس کر بولا۔

شانو چائے لے آئی۔

شانو چائے لے آئی۔

تینوں نے مل کر پی۔ شانو بار بار آصفہ کے متعلق پوچھ رہی تھی۔

تمہارے بھیا۔ اس سے لڑ کر آئے تھے۔ اب وہ شاید کبھی بھی تمہارے ہاں نہ آئے"
سعید نے سچی سچی بات کہہ دی۔

ہائے اللہ۔ یہ بات ہے" شانو نے حیران ہو کر ضیا کو دیکھا۔ وہ کچھ اور کہنے کو تھی کہ
ضیا نے بات بدلنے کی غرض سے کہا" بستر لگا دیا۔"

نہیں ابھی تو چائے ہی بنائی ہے۔"

"لگا دو نا۔"

"ابھی لگا آتی ہوں"

شانو اٹھ کر چلی گئی۔

رات دونوں دوست دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سعید بار بار ضیا سے مری کے
پریشان کن واقعے کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

ضیا کیا بتاتا۔

اس نے بہت کریدا۔ زیادہ اشتیاق ظاہر کیا تو صرف اسی قدر کہا" اک عجیب وغریب
ادثہ پیش آیا تھا۔ یہ حادثہ اب تک مجھ پر اثر انداز ہے۔ چاہتا ہوں اسے بھول جاؤں
ن بھول نہیں پاتا۔ اس کا سر ہے نہ پیر۔ ابتدا ہے نہ انتہا۔ ایک عورت ملی تھی۔ اور
ہشہ کے لیے بچھڑ گئی۔ اس سے زیادہ نہ مجھے پتہ ہے نہ تمہیں بتلا سکتا ہوں۔"

سعید ہنستے ہوئے بولا" تو گویا عشق کا چکر تھا۔"

جو نام چاہے دے لو۔ میں خود بھی تعین نہیں کر پایا۔ کہ کیا چکر تھا۔"

"عجیب بات ہے"

"بس وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ دوسرے دن میں اسے ملنے گیا۔ تو وہ جا چکی تھی۔"

"کون تھی ؟"

یہ پتہ ہوتا تو رونا کس بات کا تھا"

"واقعی ؟"

ہاں سعید۔ میں نہیں جانتا وہ کون تھی۔ اس کا نام کیا تھا۔ وہ کہاں سے آئی تھی۔
لیکن مجھے اعتراف ہے۔ کہ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ بہت اچھی تھی۔ نہایت سلجھی
ہوئی باتیں کرتی تھی۔ بہت پختہ ذہن تھا اس کا مجھے۔ مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی
لیکن۔ وہ چلی گئی۔

خیر چھوڑو اسے۔ وہ تو اب اک گذرے ہوئے لمحے کے سوا کچھ نہیں۔ ہاں مجھے افسوس
ہے کہ میں اس پریشانی کی وجہ سے آپ سب کے خلوص کو اتنی بدتمیزی سے ٹھکرا کر آیا۔
وہ متاسف اور نادم نظر آنے لگا۔ سعید نے باتوں کا رُخ حالات حاضرہ کی طرف
موڑ دیا۔

صبح ضیا سعید کو ہوائی اڈے پر چھوڑنے گیا۔ تو جہاں سعید کو الوداع کہنا مقصود تھا
وہاں آصفہ سے بھی معذرت کرنے کا خیال ذہن میں تھا۔
جہاز کچھ دیر رکا۔ مما ڈیڈی حسب معمول خلوص سے ملے۔ آصفہ نے کسی خفگی کا
مظاہرہ نہ کیا بے تعلق سی رہی۔ ضیا نے خود ہی بڑے ملتجی انداز میں معذرت کی۔ وہ
شاید اس سلسلے میں کسی بات کے لئے تیار نہ تھی اس معذرت کا کوئی جواب نہ دیا۔
ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ ہاں۔ ضیا نے معذرت کر کے اپنے ذہن کا بوجھ ضرور ہلکا کر لیا۔

"زدبی آپا"

"ہوں"

"پھر کہیں جانے کی تیاری ہے"

"ہاں دو ہفتے کا پروگرام ہے۔ شکیل کی شادی ہے۔ منو کی منگنی اور۔

"لیکن میری سالگرہ۔"

کوشش کروں گی۔ جب تلک واپس آجاؤں"

"اگر نہ آسکیں تو۔"

"تو بھی کیا فرق پڑے گا۔ بر تھ ڈے ہو جائے گی"

"زدبی آپا"

وقت رکتا تھوڑا ہی ہے سارہ۔ اور شکر کی بھی یہی بات ہے۔ کہ رکتا نہیں۔ ورنہ
ورنہ۔ اذیت کے لمحے اٹک جایا کرتے۔ تو زندگی حرام ہو جاتی۔"

ہائے اللہ زدبی آپا۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میرا مطلب یہ تو نہیں۔ زدبی آپا۔"

"کیوں"

میں جو کہنا چاہ رہی ہوں۔ آپ اس طرف تو آتی ہی نہیں ہیں۔"

بر سالگرہ ہی کا تو کہہ رہی ہو۔"

"ہاں"

"پھر"

"میں یہ سالگرہ گھر پہ منانا چاہتی ہوں"

"تو کیا ہرج ہے"

"لیکن آپ۔ نہ ہوتیں۔ تو بندوبست کیسے ہوگا"

"تمہارے پپا ہر کام میں ماہر ہیں۔ کرلیں گے۔ ویسے گھر پہ کرنے کی کوئی خاص وجہ؟"

زوبی نے ساڑھی تہہ کرکے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے اچانک گردن موڑ کر سارہ کی طرف دیکھا۔ سارہ نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلادیا۔

"میں بھی تو سنوں" زوبی آپا سیدھی ہوتے ہوئے بولیں۔

"ہے ایک بات" سارہ نے شرمیلی ادا سے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر زوبی کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔

"کوئی چکر ہے،" زوبی ہنسی اور شفقت سے سارہ کی پیشانی چوم لی۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا"

"چند دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔"

"کیا؟"

زوبی نے سارہ کی ٹھوڑی کو چھوا اور مسکراتے ہوئے بولی "تیرے تیور جداگانہ۔"

سارہ ہنس پڑی۔

"سچی بات، ہے نا"

"ہاں"

"کون ہے وہ"

"شاہد۔"

"کون شاہد"

"سونیا کو آپ جانتی ہیں نا"

"وہ۔ ہاں۔ سونیا۔"

"اس کا کزن ہے۔"

زوبی مسکراتے مسکراتے اچانک چپ ہوگئی۔ سونیا اور اس کے کردار سے وہ ناواقف نہ تھی۔ جس طبقے میں سونیا کی رسائی تھی۔ وہاں زوبی کی بھی پہنچ تھی۔ ہوٹل کلب کونسی جگہ تھی، جہاں سونیا کے چرچے نہ تھے۔ ابھی کل رات کے ڈنر میں مسٹر ناہد سونیا کے متعلق بہت کچھ بتا رہے تھے۔ دوستی کو اس نے کاروبار بنا رکھا تھا۔ اس کاروبار میں وہ روز بروز چمک رہی تھی۔

زوبی کی سوچوں سے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سارہ بڑی سادگی سے اسے شاہد کے متعلق بتا رہی تھی۔ رومان میں دونوں جس حد تک آگے جاچکے تھے۔ وہ بڑی سچائی سے زوبی آپا کو سنا رہی تھی۔

"میں سالگرہ اسی لئے گھر پہ کرنا چاہتی ہوں زوبی آپا۔ کہ شاہد آپ سے اور پپا سے کھل سکے۔ چائے کے بعد جب سب مہمان رخصت ہوجائیں تو آپ اسے روک لیں۔ زوبی آپا آپ پھر سب کچھ پپا سے کہہ سکتی ہیں۔"

"ہوں"

"آپ شاہد سے مل کر بہت خوش ہونگی۔ بڑا سویٹ ہے۔"

"سونیا کا کزن ہے یا دوست"

"مجھے ٹھیک پتہ نہیں۔ سونیا کزن ہی کہتی ہے"

"اور شاہد"

"وہ بھی یہی کہتا ہے۔"

"ہوں"

"پھر زوبی آپا؟"

"کیا"

"اپنا پروگرام آپ ملتوی نہیں کر سکتیں۔"

زوبی چند لمحے سوچ میں پڑ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ سر ہلاتے ہوئے بولی "نہیں۔ جانا بہت ضروری ہے۔"

"تو پھر کیا کروں"

"میری واپسی کا انتظار"

"اتنے دن!"

"بے صبر نہ بنو۔ یہ معاملے منٹوں میں نپٹانے کے نہیں ہوتے۔"

"شاہد سے اب صبر نہیں ہو سکتا۔ وہ جلد از جلد پروپوز کرنا چاہتا ہے"

"تو پھر سالگرہ کا انتظار کیوں۔ کل ہی اسے گھر پہ بلا لو"

سارہ کی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے۔ ہونٹ کھل اٹھے "سچ زوبی آپا"

"سچ۔"

"چائے پہ بلاؤں۔"

"چائے پہ بلا لو۔ خواہ کھانے پر۔ ملنا ہی ہے۔"

"آپ کتنی اچھی ہیں زوبی آپا" سارہ نے چٹ سے زوبی کے گال پہ پیار کر لیا۔ "میں آج ہی اسے فون کرتی ہوں۔ کہ رات کھانا ہمارے ساتھ کھائے"

"ٹھیک ہے"

پھر ساری باتیں آپ خود ہی کر لیں گی نا۔ پپا سے بھی کہدیں گی نا"

"بالکل۔ بالکل۔ تم فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ایک نظر اسے دیکھ تو لوں

پہلے۔ کہ اس پیاری پیاری سارہ کے وہ قابل ہے بھی کہ نہیں۔"

زوبی نے سنجیدگی سے چھیڑا۔

"وہ۔ وہ بہت اچھا ہے زوبی آپا۔ بہت اچھا ہے۔"

"ہوگا۔ ہر ایک بات ہے۔ کہ اس کی کزن اچھی نہیں۔"

"کون؟ سونیا۔"

"ہاں"

"لوگ یونہی بیچاری کو بدنام کرتے ہیں زوبی آپا۔ میں نے تو اس میں کوئی برائی نہیں دیکھی"

"اس لئے کہ تم خود بری نہیں ہو۔"

"نہیں زوبی آپا۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے"

"اچھا۔ بھئی۔ مان لیتے ہیں تمہاری بات۔ شاہد سے ملاقات ہو جائے تو پھر کچھ کہا جا سکے گا"

زوبی پھر اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ الماری سے کپڑے نکال نکال کر وہ چرمی بکس میں رکھنے لگی۔

سارہ کے ذہن سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ وہ کھڑکی سے پردہ ہٹاتے ہوئے باہر چمن میں کھیلتے۔ مالی اور خانساماں کے بچوں کو دیکھنے لگی۔

کئی لمحے گزر گئے۔ زوبی نے خوبصورت سا ہلکا نیلا بکس بند کر کے ایک طرف رکھ دیا اور بڑے سے کالے بیگ میں ضرورت کی اور چھوٹی موٹی چیزیں رکھنے لگی۔

"زوبی آپا" سارہ پلٹ کر وہیں کھڑے کھڑے بولی۔

"ہوں"

"پتہ ہے۔ میں نے ساری بات آپ کو بتا دی"

زوبی کے تیزی سے حرکت کرتے ہاتھ رک گئے۔ اور وہ مستفسرانہ نظروں سے سارہ

کو دیکھنے لگی۔

"بات یہ ہے زوبی آپا۔ کہ لاہور سے میری پھپھو آ رہی ہیں۔"

"کب"

"بس انہی دنوں پپا نے آپکو بتایا نہیں۔"

"شاید کچھ سرسری سا ذکر کر گیا تھا۔"

"وہ آ رہی ہیں۔ اور۔"

"اور کیا؟"

سارہ ہنس پڑی۔

"کچھ بتاؤ بھی۔ زوبی قالین پر گھٹنے کے بل بیگ لئے لئے بولی۔ سارہ مسکراتے ہوئے قریب آ گئی۔ اور تمسخرانہ انداز میں بولی۔ ان کے ایک بیٹا جی بھی ہیں۔ بقول پپا بہت خوبرو۔ بہت عقلمند۔ بہت لائق۔ بہت یہ بہت وہ۔"

وہ پھر کھکھلا کر ہنس پڑی۔

زوبی بھی مسکرانے لگی "، خیر مجھ سے تو تمہارے پپا نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔"

"مجھے جو اٹھتے بیٹھتے لیکچر دیتے رہتے ہیں۔ پتہ ہے ان کا مطلب کیا ہے؟"

"ظاہر ہی ہے۔"

"اسی لئے میں نے آپ کو شاہد کے متعلق پہلے سے بتا دیا ہے۔ اب کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے زوبی آپا۔ سمجھ گئیں نا آپ۔"

"گڑبڑ سے کیا مطلب؟"

سارہ نے زوبی آپا کو اپنے بچپن کے طے شدہ رشتے۔ اپنی امی کی ناپسندیدگی اور اختر سے نباہ کرنے کی خواہش سب باتیں بتا دیں۔

"تم نے اپنی پھوپھی کے بیٹے کو دیکھا ہے کبھی؟"

سارہ نے بُرا سا منہ بنایا۔ نو دس سال پہلے دیکھا تھا۔ جانے کیوں مجھے اس سے شروع ہی سے چڑ ہے۔ شاید اس لئے کہ امی مرحومہ کو وہ پسند نہ تھا۔"

"ہوں"

"اب پپا کی مرضی لگتا ہے کچھ کچھ ادھر کی ہو رہی ہے" سارہ شوخی سے بولی" لیکن میں نے آپ سے کہہ دیا ہے۔ شاہد کے سوا مجھے کوئی بھی قبول نہیں۔ خواہ اس میں زمانے بھر کی تو خوبیاں ہوں۔"

"تو معاملہ ان حدوں کو چھو چکا ہے" زوبی آپا ہنسیں۔

"مذاق نہیں۔ واقعی ان حدوں کو چھو چکا ہے" سارہ بالکل سنجیدہ ہو گئی۔" مجھے لگتا ہے پھپھو اسی سلسلے میں یہاں آ رہی ہیں۔ ورنہ نو دس سال سے ہمارا ان سے تعلق تھا نہ واسطہ کبھی خط تک تو آیا گیا نہیں تھا۔ اب اچانک ہی پپا کو بہن کی یاد آ گئی۔ اور بہن کو بھی پپا پر ایسا پیار آ گیا۔ کہ ملنے چلی آ رہی ہیں"

زوبی سارہ کی باتیں سنتے ہوئے اپنا کام کرنے لگی۔ آج کافی دنوں کے بعد سارہ اس کے کمرے میں آئی تھی۔ اور خلاف معمول خلاف توقع دونوں گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔

"اگر پھپھو یا پپا نے ایسی کوئی بات شروع کی۔ تو آپ کو میری طرف سے انکار کرنا ہوگا زوبی آپا۔"

زوبی ہنس دی۔ پیش از مرگ واویلا۔"

"نہیں جی۔ مجھے پپا کی باتوں سے پتہ چلتا ہے۔ اسی لئے تو آپ کو ساری باتیں بتا دیں"

"اچھا بھئی۔ شاہد سے مل لوں۔ پھر۔"

"ضرور۔ ضرور"

"تمہاری پھپھو سے تو شاید ملاقات نہ ہو سکے۔"

"تو آپ بہت دنوں کے لئے جا رہی ہیں"

"غالباً دو ہفتے کے لئے۔"

"کیا خبر پھپھو آپ کے آنے تک یہیں رہیں"

اچھی بات ہے۔ میں بھی مل لوں گی۔ ویسے تمہارے پپا نے اس سلسلہ میں مجھ سے کبھی بھی کوئی بات نہیں کی۔"

"شاید اب کریں۔"

"شاید"

دونوں باتوں میں مشغول تھیں۔ سارہ ہر پھر کر شاہد کی باتیں کر رہی تھی۔ اپنے پھپھو زادے سے وہ جس حد تک متنفر تھی۔ اس کا احساس زوبی کو اس باتوں سے بخوبی ہو رہا تھا

سارہ نے زوبی سے پکا پکا وعدہ لے لیا کہ وہ شاہد کے حق میں پپا کو فوراً ہموار کر لیں گی۔ اور پھپھو کے آنے سے پہلے ہی ساری بات پکی کر لیں گی۔

زوبی کی شاہد سے پہلی ملاقات تکلفاتی نوعیت کی تھی۔ وہ اس کی شخصیت کا پر تو صحیح طور پر دیکھ نہ پائی۔ شاہد جانتا تھا کہ زوبی نے پرکھنے کے لئے اس کو مدعو کیا ہے۔ اس لئے بہت کچھ لئے دیئے رہا۔ بڑا مہذب بڑا شائستہ کم گو اور ہنس مکھ نظر آنے کی شعوری کوشش کرتا رہا۔ اور جب اصلیت پر شعوری کوشش سے لبادہ ڈالا جائے۔ تو ظاہر ہے ہر خامی ہر برائی اور ہر کمزوری پوری پوری طرح ڈھانپ لی جاتی ہے۔

زوبی کو بظاہر وہ اچھا انسان لگا۔ لیکن اس کی دور رس اور تجربہ کار نگاہوں میں وہ پوری طرح جچا نہیں۔ اس کے کردار کے متعلق پوری طرح چھان بین کی ضرورت تھی۔ زوبی کو اپنی مصروفیات تھیں۔ اسے کل چلے جانا تھا۔ واپسی پر ہی تحقیق و تجسس کے سلسلہ میں کوئی قدم اٹھایا جا سکتا تھا۔

لیکن

سارہ زبردستی زوبی کی مہر تصدیق اس معاملے پر ثبت کروانا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا۔ پھپھو آ رہی ہیں۔ ان کی آمد پپا کے لئے بڑی خوشی کا باعث تھی۔ وہ شاہد کے حق میں میدان ہموار کر لینا چاہتی تھی۔ پھپھو زادے سے بچنے اور اپنی پسند پپا سے منوانے کا یہی وقت تھا۔

زوبی نے چاہا۔ کہ واپسی پر آ کر پوری طرح چھان بین کر کے کوئی آخری فیصلہ کرے گی

تو سارہ بگڑنے لگی۔ اس نے منت سماجت سے اصرار بھی کیا کہ جانے سے پہلے زوبی شاہد
کے متعلق پپا سے سب کچھ ضرور کہدے۔

زوبی نے وعدہ کرلیا اور اسی شام جب وہ لان میں بیٹھی تھی۔ ناصر اتفاق ہی سے گھر
آیا تھا۔ زوبی نے چائے لان ہی میں منگوالی۔

"تم آج رات جارہی ہو" ناصر نے پوچھا۔

"ہاں" زوبی نے مسکرا کر اپنے معمر شوہر کی طرف دیکھا۔

وہ چپ ہوگیا۔

"اعتراض تو نہیں آپ کو" وہ شوخی سے بولی۔

ناصر نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے سگار ہونٹوں میں دبالیا۔

دونوں چائے پیتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ دونوں میاں بیوی سے
کہیں زیادہ کاروباری ساتھی لگ رہے تھے۔

باتوں باتوں میں شاہد کا تذکرہ ہونے لگا۔

"آپ اُسے جانتے ہیں"

"نہیں"

"کیسا لڑکا ہے"

"بظاہر اچھا ہی لگتا ہے"

"تو پھر کیا خیال ہے"

"کیا مطلب؟"

"سارہ کے لیئے موزوں رہے گا۔"

ناصر نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر سگار کے کئی کش لیتے ہوئے کڑوا کسیلا دھواں نگل
نگل کر اگلنے لگا۔

"سارہ اور شاہد دونوں دوست ہیں۔" زوبی نے سنجیدگی سے کہا "آپ شاہد کے متعلق
اچھی طرح اطمینان کرلیں۔ تو۔"

"زوبی۔ سارہ کے لیئے میں نے کچھ اور سوچا ہے۔" ناصر نے بڑے اطمینان سے زوبی
کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

زوبی کے لبوں پہ ہلکا سا تبسم بکھر گیا "شاید۔ آپ اپنے بھانجے۔"

"ہاں۔ لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا" جلدی سے ناصر نے پوچھا۔

"بس۔ چل گیا پتہ۔"

"سارہ نے بتایا ہوگا"

"ہاں۔"

میری بڑی خواہش ہے۔ کہ میں سارہ کو اپنی بہن کی بہو بناؤں۔ اپنا بچہ ہے۔ اپنا خون
ہے۔" ناصر گھر کے رشتے کی اہمیت اور افادیت بتانے لگا۔

زوبی خاموشی سے سنتی رہی۔ پھر آہستگی سے بولی "آپ کو بیٹی کی خوشی کا بھی تو احساس
ہونا چاہیے۔ سارہ کو تو اس لڑکے سے چڑ ہے۔ وہ تو اس کا نام سننا بھی گوارہ نہیں کرتی"

"مرحومہ شاہدہ کا کیا دھرا ہے سب اسے اس رشتے سے خدا واسطے کا بیر تھا۔"

"میں سن چکی ہوں سب۔ اب عقلمندی اور مصلحت یہی ہے کہ بچی کا عندیہ معلوم کرکے
نظر انداز نہ کیا جائے۔ آپ نے جب تمام عمر بہن بھائیوں سے میل ملاپ نہیں رکھا۔ سارہ
نے پھپھو کو دیکھا ہے نہ پھپھوزادے کو۔ آپ توقع ہی کیوں رکھتے ہیں۔ کہ وہ محض آپ کی
خوشنودی کے لیئے یہ رشتہ قبول کرے گی۔"

پھر زوبی نے سارہ کے دوٹوک فیصلے کے متعلق ناصر کو سب کچھ بتا دیا۔

ناصر سوچ میں پڑ گیا۔

زوبی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میدان سارہ کے حق میں ہموار کرنے لگی۔ ناصر کبھی

سر اثبات اور کبھی نفی میں ہلاتے ہوئے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے ماتھے کی لکیریں اور واضح ہوگئیں، چہرے کی معمر شگفتگی غائب ہوگئی۔ ویران سپاٹ اور بوڑھا چہرہ کچھ بھیانک سا لگنے لگا۔

دیکھیں گے "ناصر نے بالآخر اٹھتے ہوئے کہا"، رابعہ آرہی ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو گا ہی۔"

زوبی نے جاتے جاتے بھی سارہ کی پسند کا ذکر کرتے ہوئے ناصر کو سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی تلقین کی۔

رابعہ بیگم کی آمد ناصر کے لئے خوشی کا باعث تھی۔ بہن بھائی کا برسوں بعد ملنا بھی رقت انگیز تھا۔ رابعہ بیگم تو بھائی کے گلے لگ کر بے اختیار ہو کر روتی رہیں۔ ناصر بھی دلگیر ہوا۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ اور سارہ کو جانے کیا ہوا خوب خوب روئی۔

رابعہ بیگم کیا آئیں شفقتوں کے در ہی کھل گئے۔ سارہ پیار سے ترسی ہوئی تھی پھپھو کی شفقت سے بڑی متاثر و مغلوب ہوئی۔ رابعہ بیگم کے لئے الگ کمرہ کھلوایا گیا تھا۔ لیکن وہ پیار و اصرار سے پھپھو کا بستر اپنے کمرے میں اٹھا لائی۔

وہ رابعہ بیگم کی میٹھی میٹھی باتیں سنتی۔ ان کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول جاتی گالوں پر پیار کر لیتی ان کے سینے میں منہ چھپا لیتی اسے بڑا ہی لطف ملتا۔

پھپھو کے کام کرنے میں بھی اسے لطف ملتا۔ سعادت مند اور فرمانبردار بچی کیطرح وہ ان کے حکم کی منتظر رہتی۔ ان کے کپڑے استری کرتی۔ ان کے بالوں میں پیار سے کنگھی کرتی۔

یوں سارہ کے پیار کی بھوک مٹتی تھی۔

لیکن

جہاں اس کی بھوک مٹتی تھی۔ وہاں رابعہ بیگم کی طلب زور دار ہوتی جاتی تھی ایسا پیار۔ اتنی سعادتمند اور فرمانبردار بچی کو بہو بنا لینے کے خیال ہی سے مسحور ہو

ضیا کا ذکر چھیڑ دیتیں۔

کس کس رنگ کس کس ڈھنگ سے انہوں نے ضیا کی شخصیت کا اثر سارہ پر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔

ضیا کے مردانہ حسن و وجاہت کے قصے سنائے۔ اس کی قابلیت کے گن گائے اس کی شرافت کی قسم دی۔ لیکن سارہ پر کوئی اثر ہی نہ ہوا اکثر وہ اس کے ذکر سے چڑ جاتی۔ برا سا منہ بنا لیتی۔ جان بوجھ کر موضوع کسی اور رُخ پھیر دیتی۔

پھپھو سے جتنا پیار کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھپھو زادے سے اتنی ہی الرجک ہوتی جا رہی تھی۔

اور سالگرہ کے دن جب فنکشن دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔ رابعہ بیگم اور ناصر دونوں خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ دونوں کا جوڑ سارہ کو بے طرح کھٹکا تھا۔ کہیں پپا اپنا فیصلہ پھپھو کے گوش گذار ہی نہ کر دیں۔

اس خیال کے پیش نظر اس دن اس نے شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر پپا سے شاہد کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔

پھپھو مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے امی کا پیار پھر سے مل گیا۔ لیکن پپا۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ جو وہ چاہتی ہیں ہو جائے میں شاہد کے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔

ضیا کو میں جانتی ہوں۔

نہ ہی جاننے کی خواہش ہے۔

مجھے اس سے نفرت ہے۔

ناصر کچھ کہہ نہ پایا تھا۔ سارہ بچی نہ تھی۔ جو ٹوک دیتا۔ ڈانٹ دیتا اور اپنا فیصلہ اس پر مسلط کر دیتا۔

بات رابعہ بیگم سے بھی مخفی نہ رہی۔ دکھ اور صدمہ انھیں بھی تھا۔ لیکن ناصر کا کیا
قصور۔ قصور تو مرنے والی کا تھا۔ جو بیٹی کا ذہن ضیا کے بارے میں مسموم کر گئی تھی

کراچی سے آنے والی خیبر میل کچھ لیٹ تھی۔ ضیا اور شانی امی کو لینے وقت پر سٹیشن پہنچ گئے تھے۔ رابعہ بیگم آج کراچی سے واپس آ رہی تھیں۔ جس خاص مشن پر وہ گئی تھیں۔ اس کے نتیجے کا شانی کو بے صبری سے انتظار تھا۔ ضیا تو جیسے اس معاملے میں بالکل ہی بے حس تھا۔ خوشی تھی نہ غم۔ امی کے جانے سے پہلے دو تین بار وہ اس سلسلہ میں الجھا بھی تھا۔ لیکن امی اپنی بات کی پکی تھیں۔ ضیا پر خفگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ اور پیار و محبت سے سمجھایا بھی تھا۔

"تقدیر کے معاملے ہوتے ہیں بیٹا رشتہ ہونا ہوا۔ تو میرا کراچی جانا بہانہ ہی بن جائے گا۔ نہ ہوا۔ تو لاکھ سر توڑ کوشش کرنے پر بھی نہ ہو گا۔ مجھے صرف اپنی تسلی کے لئے ناصر کا عندیہ معلوم کر لینے دو۔ اور پھر جب تمہیں کسی اور لڑکی کی لگن بھی نہیں۔ تو میرے جانے پر اعتراض بھی نہ کرو۔ میں جانوں اور میرا بھائی۔"

ضیا چپ ہو گیا تھا۔ اس کی اپنی ذہنی حالت عجیب سی تھی۔ سایوں کو پکڑنے کی حماقت کر رہا تھا۔ سراب کو پکڑ رہا تھا۔ ان ہونی کے ہو جانے کی توقع کئے تھا۔ اب وقت نے اسے سنبھالا دے دیا تھا۔ اور زمانے کی دریدہ دہنی کا خوف بھی۔ شہلا اب کبھی نہ ملنے کے لئے بچھڑ چکی تھی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود دل کا کوئی گوشہ دھیرے دھیرے سلگتا رہتا تھا۔ لہو بوند بوند ٹپکتا رہتا تھا۔ مجروح دل میں درد ہی درد لبا تھا۔

یہ درد و کوفت و لذت، کا جانگسل احساس بن گیا تھا۔

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں۔ اور نہ ہی ضیا کو اپنے آپ سے اعتراف کرتے ہوئے کوئی باک تھا۔ کہ شہلا اس کی زندگی کی خوبصورت ترین سچائی ہے۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ پیار محبت اور عشق کے جذبات سینے میں اس کے نام کے ساتھ تھرکتے رہتے ہیں۔

وہ اسے کبھی ملے یا نہ ملے۔

حاصل ہو یا نہ ہو

یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی۔

شانی بڑی بے تابی بے صبری سے امی کا انتظار کر رہی تھی۔ سارہ کیسی ہو گی؟ وہ نہ صرف خود سوچ رہی تھی۔ بلکہ بار بار ضیا سے بھی پوچھ رہی تھی۔ ضیا کبھی جھنجھلا جاتا اور کبھی اس کی باتوں کے بے تکے پن پر مسکرا دیتا۔

بہت خوبصورت ہو گی،" شانی نے قیافہ لگاتے ہوئے کہا" اس کی شکل کچھ کچھ مجھے یاد ہے"

" ہو گی،" ضیا نے کہا۔

شانی اس کے خیالی پیکر کا نقشہ الفاظ میں کھینچنے لگی۔

ضیا کے ذہن میں شہلا کا وجود لہرانے لگا۔ وہ جتنا مکمل اور جہاں سوز حسن دیکھ چکا تھا۔ نگاہوں میں سیری تھی۔ جذبات میں پختگی۔ تشنہ لبی کی نوبت کہاں سے آتی جو شانی کی باتوں سے محظوظ ہوتا۔

حسن حسین پیکر میں تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ حسن تو اپنی نگاہوں میں ہوتا ہے۔ نگاہیں یہ حسن جب کسی پیکر میں انڈیل دیں تو وہ حسین بن جاتا ہے۔ ہر محب کے لیے اپنا محبوب حسین ہے۔ خواہ دوسروں کے لیے وہ ذات کتنی معمولی کیوں نہ ہو۔ محب کے

کے سینے میں جذبات عشق جب ابلتے ہیں۔ تو نگاہوں میں حسن بن کر پھیل جاتے ہیں یہ حسن جب محبوب کے پیکر میں منتقل ہوتا ہے تو اس کا وجود دیوتا بن جاتا ہے۔ دنیا کی ہر شے سے عظیم ہو جاتا ہے۔ ہر چیز سے خوبصورت نظر آنے لگتا ہے۔

ضیا کی نگاہوں کا حسن شہلا کے پیکر میں ڈھل چکا تھا۔ اتر چکا تھا۔ گھل چکا تھا اب دنیا کی حسین سے حسین لڑکی بھی اس کی نگاہوں میں وہ مقام نہ بنا سکتی تھی۔

ضیا کی نگاہوں کے زاویے صرف شہلا کی ذات پر مرتکز ہو چکے تھے۔

" اللہ جانے کم بخت گاڑی کب آئے گی،" شانی نے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا جس طرف سے گاڑی متوقع تھی۔

" بیس منٹ لیٹ ہے،" ضیا نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا" دس منٹ گزر چکے باقی دس ہیں۔"

سٹیشن پر بھیڑ بھاڑ کافی ہو چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر مسافروں قلیوں اور سامان کی ریل پیل تھی۔ خوانچے والے۔ سگریٹ فروش سبھی گاڑی کے انتظار میں تھے سٹالوں پر لوگ کھڑے اخبار رسالوں کو الٹ پلٹ کرتے وقت گزار رہے تھے۔ چائے کوک فنٹا سیون اپ پی رہے تھے۔ بچے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ مائیں انھیں پکڑ پکڑ کر ایک جگہ بٹھانا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کے وجود میں جیسے پارہ بھرا تھا ایک جگہ ٹھہرنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

شور شار اور ہنگامہ بڑھتا جا رہا تھا۔ شانی سفید چادر میں اپنا سارا جسم لپیٹے ضیا کے برابر کھڑی تھی۔

ضیا نے کئی سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔ امی کا انتظار اسے بھی تھا۔ لیکن شانی جیسی کیفیت نہ تھی۔

" کم بخت کو آج ہی لیٹ ہونا تھا" وہ بڑبڑائی۔

”صرف بیس منٹ لیٹ ہے۔ شکر کرو گھنٹہ دو گھنٹہ نہیں۔“

” واقعی ۔ ورنہ ۔“

” ورنہ کیا ہوگا۔“

” مجھے اس کا جتنا انتظار ہے نا آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔“

” سوچنے کی ضرورت بھی نہیں ۔“

” ہائے اللہ۔ بھائی جان ۔ آپ بس ایسی باتیں نہ کریں ۔ اللہ کرے ماموں نے ہاں کر دی ہو۔“

” تو کیا ہوگا “

” کیا ہوگا۔ اللہ قسم یہ بات ہوئی ۔ تو آپ سے ڈرونگی نہیں ۔ یہیں لڈی ڈالنا شروع کر دوں گی ۔“

” بہت خوشی ہے تجھے ۔“

” اپنے بھیا کے بیاہ رچانے کی کس بہن کو خوشی نہیں ہوتی “

” اور تو اور ہے ۔ تو ہے بھی خاص الخاص بہن “

بالکل ۔ کیوں نہیں ۔“

ضیا نے سگریٹ کے دو تین کش لے کر آخری ٹکڑا زمین پر پھینک کر پاؤں سے مسل دیا ۔ وہ شانی کی باتوں پہ مسکرا رہا تھا ۔ ہاں اس کی آنکھیں اداس تھیں ۔

” بھائی جان “

” ہوں “

” اگر “

” ہوں “

” خدانخواستہ “

” ہوں “

” ماموں جان نے ۔“

” ہوں “

” اللہ نہ کرے ۔“

” ہوں ۔“

” انکار کر دیا ۔“

” آپ سے ڈرونگی نہیں ۔ یہیں گاڑی کے نیچے سر دے کر شہید ہو جاؤں گی “ ضیا نے مسکراتے ہوئے شانی کی نقل اتاری ۔

” شانی ہنس پڑی “ کبھی آپ نے میرے دل کی بات “

” چل ہٹ پگلی ۔ اس معاملے کو اتنی اہمیت نہ دے ۔“

شانی کچھ کہنے ہی والی تھی ۔ کہ لاؤڈ سپیکر پہ گاڑی کی آمد کا اعلان ہونے لگا ۔ ہلچل میں اضافہ ہوگیا ۔ بھاگم بھاگ قلی آئے ۔ کسی نے سامان اٹھایا کسی نے اٹھوایا ۔ بچوں کی انگلیاں پکڑے پکڑے مائیں کھڑی ہوگئیں ۔ مسافر جلدی جلدی قلیوں کے قدموں سے قدم ملاتے ہوئے ادھر سے اُدھر جانے آنے لگے ۔ خوانچہ فروش آگے بڑھے ۔ چھابڑی والوں نے صدائیں لگانا شروع کر دیں ۔ اخبار رسالے والے آگے کو ہو گئے ۔

شور و غل میں گاڑی کی کھڑ کھڑ اور کھٹ کھٹا کھٹ بھی بڑے اہتمام سے شامل ہوئی افراتفری سی پڑ گئی ۔ ضیا اور شانی قدرے پیچھے ہٹ گئے ۔ بوگیاں پہلے خاصی تغلر سے پھر آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے جانے لگیں ۔ گاڑی رکتے ہی جیسے طوفان پھٹ پڑا ۔ گاڑی نے یہاں تقریباً تیس منٹ رکنا تھا ۔ لیکن بھاگ دوڑ اس طرح ہو رہی تھی ۔ کہ رکتے ہی چل پڑے گی گاڑی ۔ تھرڈ اور سیکنڈ کلاس میں تو طوفان بدتمیزی بپا تھا ۔ اندر والے باہر آنے کی کوشش میں دھینگا مشتی کر رہے تھے ۔ اور باہر سے اندر جانے والے

ٹوٹے پڑتے تھے ۔ کمپارٹمنٹوں کے دروازوں میں لوگ پھنس کر رہ گئے تھے ۔

" وہ امی "، شانی اے سی کے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوشی سے چیخی ۔

ضیا نے بھی ادھر دیکھا ۔ واقعی دروازے میں امی کھڑی تھیں ۔

شانی کا ہاتھ پکڑ کر وہ بھیڑ میں راستہ بناتا اس کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا ۔ امی نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا ۔ وہ ہاتھ ہلا رہی تھیں ۔

شانی لپک کر گاڑی میں چڑھ گئی ۔ اس کے گلے میں باہیں ڈال کر خوشی سے جھول کر ان کے گال پر پیار کر لیا ۔ امی نے اس کا ماتھا چوم لیا ۔

" اداس تو نہیں ہو گئی تھیں "

" بہت زیادہ امی "

" جھوٹ کہتی ہے "، ضیا نے ماں کو سلام کرنے کے بعد کہا ۔

اس نے دعائیں دیں ۔

" سامان " ضیا نے پوچھا

قلی کو بلاؤ ۔ میں بتاتی ہوں "

ضیا نے قریب کھڑے قلی کو اشارہ کیا ۔ وہ اندر چلا گیا ۔ تھوڑی دیر بعد امی قلی کے ساتھ کمپارٹمنٹ سے باہر آ گئیں ۔ شانو ان کے ساتھ ساتھ تھی ۔

سفر کیسا رہا امی ۔ کوئی تکلیف تو نہ ہوئی "، ضیا نے امی کے ہاتھ سے بیگ پکڑتے ہوئے کہا ۔

" واہ جی ۔ اے سی میں آئی ہیں ۔ تکلیف کیا ہوئی ہو گی "، شانی نے امی کی جگہ جواب دیا زر کو خوب آگ لگائی امی نے "، شانی نے مسکرا کر ضیا سے کہا ۔" ہم تو سیکنڈ کے ڈبے دیکھ رہے تھے ۔ ماموں جان پر رعب ڈالنا مقصود ہو گا ۔ ہیں نا امی " شانی بولے جا رہی امی چپ چپ تھیں ۔ اور ضیا اس چپ میں مشن کی ناکامی کے عکس لرزتے دیکھ رہا تھا

" ناصر ہی نے سیٹ تک کروا دی تھی "، امی نے شانی کی باتوں کے جواب میں صرف اتنا کہا ۔ اور پھر قلی کے ساتھ ساتھ آگے آگے جانے لگیں "

" ہوں "، شانی نے آنکھیں شوخی سے گھمائیں ۔

" کیوں " ضیا نے پوچھا ۔

" لگتا ہے کام بن گیا "

" کونسا ؟ "

" آپ کا "

ضیا نے نفی میں سر ہلا دیا

" بن گیا صاحب بن گیا "

" نہیں "

" آپ غلط کہہ رہے ہیں میرا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا "

" میں کہتا ہوں ۔ سر پر کھڑے پٹڑی پہ ۔"

" اللہ نہ کرے "

" مان لے "

" پوچھوں امی سے "

کیا ضرورت ہے ۔ گھر پہنچ کر پتہ چل ہی جائے گا "

امی اللہ جانے ان کی باتیں سن ہی رہی تھیں ۔ یا دانستہ نہ سننے کا حیلہ کر رہی تھیں قلی کے پیچھے چپ چاپ چلے جا رہی تھیں ۔

ان کے انداز ۔ اور ان کی تھکی ہوئی خاموشی میں ضیا کو مشن کی ناکامی کی لرزشیں صاف طور پر محسوس ہو رہی تھیں ۔

"خطرہ زبردست ہے"

"مل گیا"

"نہیں"

بیوقوف ہو تم۔ اب ایسی کوئی بات نہیں۔ سب تمہارا وہم ہے"۔

"شاید یہی ہو"

"ہے بھئی بالکل ہے۔ ورنہ بات ختم ہو چکی۔ زوبی آپا تو یہاں تھی نہیں۔ سارہ خود ہی پپا کے سامنے اعتراف کر لیا تھا"

ہاں سارہ نے مجھے ساری بات بتائی ہے۔

"پھر تمہیں یقین کرنا چاہیے"

"جانے کیوں یقین آتا بھی ہے اور نہیں بھی"

"بظاہر تو کوئی وجہ نہیں"

سارہ اپنی پھوپھی کی تعریفیں بہت کرتی ہے"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے خون کا رشتہ ہے۔ اور پھر اسکی اپنی امی بھی تو نہ پھوپھی سے حقیقی پیار ملا ہو گا"

"اپنے دام میں صیاد خود ہی آ گیا نا"

"کیا مطلب ؟"

میرے ذہنی خوف کی وجہ بھی تو یہی ہے۔ پھوپھی سے حقیقی پیار ملا تو سارہ کی زبان پر تذکرہ ہی انہی کا رہتا ہے۔ کہیں جو پھوپھی زادے کا حقیقی پیار مل گیا تو۔"

"اسے چھوڑو شاہد اتنی دور کی نہ سوچو۔"

"کیسے نہ سوچوں"

"تو پھر پہنچا دو اپنا پیغام اس کے ڈیڈی تک۔

"یہ کار خیر تم ہی کر سکتی ہو"

"نہیں بھئی۔ تم اپنی امی کو بھیجو۔"

شاہد چپ ہو گیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا "امی کو یہ رشتہ منظور نہیں"

سونیا چونک کر اچھل پڑی۔ لمبی سی حیرت زدہ چیخ اس کے منہ سے نکلی "کیوں"

بھئی تم جانتی تو ہو۔ ہم متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ یہ جو بورژوائی کا ظاہری خول میں نے چڑھا رکھا ہے امی اس سے نہ صرف بدکتی ہیں۔ بلکہ چڑتی بھی ہیں۔ طبقاتی اونچ نیچ کی وہ قائل ہیں۔

سونیا چند لمحے چپ ہو گئی۔ پھر تمسخرانہ ہنسی "ایسے خیالات کے لوگ ایک ہی مرکز پہ جمع رہتے ہیں۔ ترقی کر پاتے ہیں۔ نہ عروج۔ ہونہہ۔"

شاہد برا نہ منانا۔ تمہاری امی عقلمند خاتون نہیں۔"

شاہد کو قدرے برا لگا۔ لیکن کچھ نہیں بولا۔ سونیا مسکراتے ہوئے بولی "انہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ بلکہ اپنی قسمت پہ نازاں کہ لاکھوں کروڑوں کی واحد وارث لڑکی ان کی بہو بننے پہ آمادہ ہے۔

تمہاری ہماری سوچ سے امی کی سوچ کا انداز جداگانہ ہے۔ اور مجھے سمجھ نہیں آتا کہ سوچ صحیح کس کی ہے"

"تذبذب کے مقام پر ہو۔"

"مجھے اعتراف ہے"

"تو چھوڑ دو پیچھا سارہ کا"

"یہ بھی ممکن نہیں"

"کیوں سچ مچ ہی اس کے عشق میں گرفتار ہو چکے ہو۔"

سونیا کا چبھتا طنز شاہد نے بری طرح محسوس کیا۔ پھر آہستگی سے بولا" شاید یہ بات بھی صحیح ہو۔ لیکن اصل بات تو یہ ہے۔

"کہ۔"

کہ جس قسم کی عادات میں اپنا چکا ہوں ۔ ان سے نبرد آزما صرف اسی صورت ہوا جاسکتا ہے۔ کہ شادی سارہ ہی سے ہو۔ مجھے پیسے کی ضرورت ہے۔ بے حساب پیسے کی۔

"تو پھر امی کو قائل کر لو۔"

شاہد کمرے میں ادھر ادھر بے تابی سے ٹہلنے لگا۔ پھر رک کر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا امی نہیں مانتیں۔ وہ تو متوسط گھرانے کی کسی شریف کم گو اور خدمت گذار لڑکی سے میرا ناطہ جوڑنا چاہتی ہیں۔"

سونیا ہنس کر بولی" کیوں کسی معصوم اور شریف لڑکی کو تمہارے پلے باندھ کر اس کی زندگی برباد کرنے کے درپے ہیں۔"

شاہد چپ رہا۔ سونیا نے قدرے رک کر کہا۔

کیا تمہارے متعلق وہ کچھ نہیں جانتیں۔"

ہو سکتا ہے۔ میری خوبیوں کا انھیں علم نہ ہی ہو"

"ہوں" سونیا مسکرائی اور پھر انگلیوں پر شاہد کی خوبیاں گنتے ہوئے بولی" شراب۔ جو ریس۔ کلب ہوٹل۔ لڑکیاں۔ کبھی کبھی حشیش۔ اور سونیا۔"

میں اپنی ہر خامی سے آگاہ ہوں محترمہ۔" شاہد نے اس کی کمر کے گرد بازوؤں کا گھیرا ڈالتے ہوئے کہا" اسی لئے تو سارہ سے شادی ضروری ہے۔"

"پھر امی کو ہر صورت مناؤ۔ اور جلد از جلد پیغام بھجوا دو۔ کہیں واقعی پھپھو کا پیار سارہ کو جیت لے۔"

"یہی دھڑکا تو مجھے لگا ہے سونیا" اس نے سونیا کو بازوؤں کی گرفت میں سختی سے جکڑتے ہوئے کہا" اس میں ہم دونوں کو ہی خسارہ لگے گا۔"

"بات تو تم سچ کہتے ہو" سونیا اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی" موٹی اسامی ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ ویسے بھی معصوم سی لڑکی ہے۔ موم کی گڑیا۔ جس سانچے میں ڈھالو ڈھل جائے گی۔"

"ہاتھ آگئی جب نا۔"

خیر تا خیر تمہاری طرف سے۔ ایسی ویسی بات ہوتی تو سارہ اپنے باپ سے تمہارے متعلق کھل کر کہہ کیونکہ سکتی تھی۔"

وہ تو اس نے سالگرہ کے دن ہی کہہ دیا تھا۔ کچھ اس کی زوبی آپا جانے سے پہلے بتا گئی تھیں۔

"اس کے باپ کا رد عمل کیا ہے۔"

شاہد چند لمحے چپ رہا۔ پھر پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا" بیٹی کے معاملے میں وہ کچھ بول تو نہیں سکا۔ لیکن جہاں تک میرے تجزیے اور اندازے کا تعلق ہے اسے بھی ناگوار گزرا ہے۔ بہن اور بھانجا اسے مجھ سے یقیناً زیادہ عزیز ہوگا۔"

"ہوں"

"ویسے بھی سنا ہے لڑکا بہت خوبصورت ہے۔ تعلیمیافتہ ہے۔ پی سی ایس کا امتحان پاس کر چکا ہے۔ ظاہر ہے آج نہ کل۔ اچھی ملازمت بھی مل جائے گی۔ کلاس ون

افسر بنے گا۔"

سونیا کچھ سوچتی رہی۔ اور شاہد بے تابی سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر سونیا بولی" فکر میں دبلے ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم سارہ کو اپنی محبت اور عشق کا احساس دلاتے رہو۔ کام بن ہی جائے گا"

وہ تو کر ہی رہا ہوں۔ لیکن۔"

لیکن کیا۔"

وہ اپنی پھپھو سے بہت متاثر ہے"

بھئی یہ الگ بات ہے۔ کہا ہے نا خون کا رشتہ ہے۔ بچھڑی ہوئی پھوپھی ملی ہے چونکہ ماں بھی نہیں اس لئے قدرتی بات ہے کہ وہ پھپھو سے متاثر ہو۔"

مجھے نیک شگون نہیں لگتا،" شاہد بولا" ذہن الجھا ہوتا ہے۔ تو سارہ سے بھی الجھ پڑتا ہوں۔"

یہ سراسر حماقت ہے"

ابھی کل ہی بات ہے۔ وہ پنجابی گانوں کے ٹیپ سن رہی تھی۔ پنجابی گانوں سے اس کی رغبت ہو سکتا ہے نئی نہ ہو لیکن مجھے یہی لگا کہ وہ اب پنجابی سے دلچسپی محض اس لئے لینے لگی ہے۔ کہ پھوپھی سے بہت متاثر ہے"

بات وزنی تھی۔

لیکن

سونیا اسے شاہد کی حماقت کہہ کر ہنس پڑی۔

شاہد سنجیدہ تھا۔

پھر

دونوں کتنی دیر تک سر جوڑے صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ سارہ سونے کی چڑیا

اسے ہر صورت پھانسے رکھنا تھا۔ اس کے ہاتھ سے نکلنے سے دونوں ہی کو نقصان تھا شاہد اور سونیا میں اس سلسلے میں باقاعدہ طور پر لین دین کا معاہدہ ہو چکا تھا۔

ضیاء لاوے کی طرح اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس کی انا کو ٹھیس لگی تھی۔ وہ تو اپنی انا کے سلسلے میں بے حد حساس اور حد درجہ محتاط تھا۔ اسے بڑی چاہت، بڑی عقیدت اور بڑی محبّت سے سنبھال کر رکھتا تھا۔ بڑی سے بڑی زیادتی برداشت کر جاتا۔ لیکن انا کی معمولی سے معمولی چوٹ سہارنا اس کے لئے ذہنی کرب کا اذیّت دہ عمل تھا۔

کراچی سے کوئی مژدہ جانفزا بے شک نہ لائی تھیں۔ یہ تو ان کی خاموشی اور الجھی الجھی چپ سے اس نے سٹیشن پر ہی اندازہ کر لیا تھا۔ لیکن جواب دینے کا انداز اتنا تمسخرانہ ہوگا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اپنی شکل و صورت پر نازاں نہ سہی۔ پھر بھی اپنی مردانہ وجاہت اور وقار کا اسے اچھی طرح احساس تھا۔ کردار کی جو خوبیاں بھی شخصیت پر حاوی ہو سکتی ہیں ان سے بھی بے خبر نہ تھا۔ پاپی سی ایس کی کشش اور اس کا وزن بھی اسے معلوم تھا۔

لیکن

امّی کی باتوں سے اس نے اندازہ کیا تھا کہ ماموں کی خواہش کو خود سارہ نے رد کیا ہے۔ اور وہ اپنے ذہن میں اس کے لئے جذباتِ تنفر بھی رکھتی ہے۔

امی شاید کھل کر نہ بتاتیں۔ میکے کی باتوں کا انہوں نے کبھی اشتہار تھوڑا ہی دیا تھا۔ اس دن تو غصّے میں آ کر ساری باتیں بتا دی تھیں۔ عزّتِ نفس جو مجروح ہوئی تھی۔ جواب بھائی

کی طرف سے ملتا۔ تو شاید بُرا بھی نہ لگتا۔ خود لڑکی نے صاف طور سے انکار کر دیا تھا۔ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اسے اَن دیکھے ضیاء سے ہمدردی ہے نہ اُنس۔ بلکہ اس کے ذہن میں ضیاء کے لئے تہہ در تہہ نفرت ہی نفرت جمی ہے۔

امّی نے لاکھ اپنے بیٹے کے قصیدے پڑھے تھے۔ اس کے اوصاف کے گن گائے تھے۔ اچھے اچھے گھرانوں سے آنے والے پیغاموں کو محض سارہ کے لئے ٹھکرا دینے کی باتیں بتائی تھیں۔ لیکن اپنا مطلب حل نہ کر سکی تھیں۔

شانی کو تو جیسے ذہنی دھچکا لگا تھا۔ ضیاء بھیّا تو اس کے لئے دنیا کا عظیم ترین خوب صورت ترین، شریف ترین اور جانے کیا کیا ترین انسان تھا۔ سارہ کے بنا دیکھے ٹھکرا دینے پر اتنا جھنجلائی کہ رو پڑی۔ غصّے میں خوب بُرا بھلا کہا۔

"حُور پری جیسے وہی تو رہ گئی ہے۔"

"اس سے خوب صورت لڑکیاں ہمیں مل سکتی ہیں۔"

"ہمارا بھیّا لاکھوں میں ایک ہے۔"

"اشارہ کروں تو لوگ رشتہ دے دیں۔"

"امیر ہو گی تو اپنے گھر۔"

وہ غصّے میں جانے کیا کیا کہے جاتی۔

امّی بھی کبھی اس کا ساتھ دیتیں۔ اور کبھی خون جوش مارتا۔ عزتِ نفس بلبلاتی۔ اماں بی کے ناطے کا احساس ستاتا تو افسردہ ہو جاتیں اور دبے دبے لفظوں میں بھتیجی کی حمایت کرنے لگتیں۔

"بچی بے چاری کا کیا قصور۔ ماں ہی اس کے ذہن میں زہر بو گئی تھی وہ تو اتنی پیاری ہے کہ جی چاہتا ہے صدقے واری ہو جاؤں۔ مجھ سے بھی بڑی محبّت سے پیش آتی تھی۔ کتنی کتنی دیر میری گود میں سر رکھ کر لیٹے رہتی۔ ہر طرح سے میرا خیال رکھتی تھی۔"

کئی دن گھر میں یہی تذکرہ رہا۔ مایوس کن جواب پانے کے باوجود سارہ کی محبت اور اپنائیت کے رویئے سے امّی کے دل میں امید کی ننھی سی رمق زندہ تھی۔ سارہ کو بہو بنانے کا خیال ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ پھر بھی کرچی کرچی جمع کر کے جوڑنے کی آرزو نہیں ٹوٹی تھی۔ اب تو اسے دیکھ بھی آئی تھیں اور اس کی محبت اور ممتا کی تشنگی کو بھی محسوس کیا تھا۔

شاہد کے متعلق انہیں تھوڑا بہت معلوم تو تھا۔ ان کے ہوتے وہ اس سے کھلم کھلا ملتی تھی۔ وہ ایک بار موٹر میں اکیلی اس کے ساتھ بھی گئی تھی۔ شاہد اکثر شام کو جب ناصر کلب جاتا سارہ سے ملنے آجاتا۔ رابعہ بیگم بچہ نہ تھیں۔ جو سمجھ نہ پاتیں۔ سارہ نے انکار کے وقت شاہد کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا۔ نہ ہی اپنے مستقبل کے چناؤ کی نشاندہی کی تھی۔ پھر بھی آثار صاف بتلاتے تھے۔ ہر چیز غیر مبہم اور واضح تھی۔

لیکن

انہوں نے شاہد کے متعلق شانی کو کچھ بتایا نہ ضیا کو۔

شاید

اس لئے کہ اب تک دل ہی دل میں وہ پُر امید تھیں اور نہیں چاہتی کہ ضیا یا شانی کے دل میں سارہ کے متعلق ابھی سے غلط سلط باتیں بیٹھ جائیں۔

اتفاق ہی کی بات تھی۔ جو اس رات ان کے منہ سے شاہد کا نام نکل گیا بے خیالی میں وہ اس کا نام لے کر اسے کوسنے لگی تھیں۔

"شاہد کون ہے امی؟" پاس بیٹھی شانی نے امی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

ضیاء بھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ماں کی طرف گھوم گیا۔ شاہد کا جس انداز سے ذکر ہوا تھا چونکا دینے والا تھا۔

"یہ شاہد صاحب کون ہیں امّی" ضیا بہت کچھ سمجھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ

نے بڑے دنوں بعد اس ذات شریف کا تذکرہ کیا۔"

امّی پشیمان تو ہوئیں۔ لیکن جل کر بولیں۔ "اللہ جانے کون ہے۔ مجھے کوئی لفنگا ہی لگتا تھا۔"

"لفنگا کیسے؟" ضیا نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تو اور کیا۔" امی سے جواب نہ بن پڑا "اس لڑکے کی نیت خدا پاک کی قسم اچھی نہیں۔ محض ناصر کی دولت کے لئے۔"

"امی وہ ہے کون۔ کیسا ہے۔ کوئی امیر کبیر آدمی ہوگا۔ شکل وصورت کیسی ہے۔ سارہ اسے پسند کرتی ہوگی۔ ناصر ماموں کو پتہ ہے کیا؟" شانی نے ایک ہی سانس میں ٹکے بے ٹکے کئی سوال کر ڈالے۔ وہ امّی کے پاس صحن میں بچھے تخت پر بیٹھی کالج کا کام کر رہی تھی۔ امی اس کی قمیص میں کاج بنا رہی تھیں۔ اور قریب ہی کرسی میں تقریباً لیٹا ضیاء اخبار دیکھ رہا تھا۔

شاہد کے ذکر پر وہ چونکا تھا۔ اور اسے قیافہ لگانے میں دیر نہ لگی تھی کہ سارہ اور شاہد رومانوی دھاگوں میں بندھے ہیں۔ سارہ کے انکار کی وجہ کا اب کوئی جواز بھی نظر آ گیا تھا۔

شانی کے انداز پر وہ مسکرایا۔ اور دھیرے سے بولا۔ "تو یہ بات تھی۔ ہوں" "بات وات کیا ہوگی۔" امی جلدی سے بولیں۔ "مجھے تو لگتا ہے۔ یہ لڑکا سارہ کے پیچھے نہیں ناصر کی دولت کے پیچھے پڑا ہے۔"

شانی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آنکھیں گھمائیں۔ اور ضیا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اخبار تخت پر پھینکتے ہوئے آگے کو جھک کر بولا "آپ کتنی بھولی ہیں امّی"

"بھولی نہیں زمانہ شناس ہوں بیٹے۔۔۔ شاہد کچھ اچھے کردار کا نہیں لگتا۔"

"صرف اس لئے کہ وہ آپ سے آپ کی بھتیجی ہتھیائے گیا۔"

"نہیں۔۔۔"

"یہی بات ہے امی۔۔۔ ورنہ ہو سکتا ہے وہ شریف آدمی ہی ہو اور خلوص دل سے سارہ کو پسند کرتا ہو۔۔۔ اور سارہ اسے۔"

"پسند کرنے کی اس میں بات ہی کوئی نہیں۔"

"کیوں ــــ بدشکل ہے کیا۔" شانی نے دل چسپی سے پوچھا۔ "بندر لگتا ہے یا بن مانس۔"

ضیاء کھلکھلا کر ہنس پڑا اور رابعہ بیگم بھی مسکرانے لگیں۔ بیٹی کے سر پر ہلکا سا تھپڑ لگاتے ہوئے بولیں "چپ رہنا سیکھ شانو۔ ہر وقت اُلٹی سیدھی ہی ہانکتے جاتی ہو۔" میرا مطلب اُس کی شکل سے نہیں تھا۔"

"تو اور ــــ؟"

"اخلاق و کردار بھی اچھے نہیں ہیں۔ شکل بس واجبی سی ہے۔"

"ہائے اللہ ــــ" شانی سنجیدگی سے بولی۔ "کبھی سارہ میرے بھیّا کو دیکھتی تو ــــ"

"یہی تو میں کہتی ہوں۔" شانی کی بات جیسے رابعہ نے چھین لی۔

"امی۔" ضیاء ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔

"کیوں بیٹے۔" ــــ رابعہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ضیا کے چہرے سے غصّے کا پیچ و تاب عیاں تھا۔

"آپ کو سارہ کا خیال دل سے اسی وقت نکال دینا چاہئے تھا۔ جب مرحومہ ممانی نے جواب دیا تھا۔ آپ موہوم امیدوں کا سہارا لئے رہیں ــــ کراچی گئیں ــــ اتنی سُبکی ہوئی ہتک آمیز جواب ملا۔ لیکن آپ نے اب تک آس لگا رکھی ہے ــــ" وہ کرسی سے اُٹھ کر صحن میں بے تابی سے ٹہلنے لگا۔

رابعہ بیگم خفیف سی ہو کر تیزی سے سوئی چلانے لگیں۔

"آپ چاہتی کیا ہیں ــــ" ضیاء ان کے قریب آ کر غصّے سے بولا۔ وہ کچھ نہیں بولیں۔

ضیاء چند لمحے ہونٹ سختی سے بھینچے کھڑا رہا۔ پھر آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے رُک رُک کر بولا۔ "آئندہ میں سارہ کا نام سننا گوارہ نہیں کروں گا۔ میں نے آپ کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ اسی لئے ہتک تک خاموشی سے سہہ لی تھی۔ لیکن اب ــــ"

"وہ صحن میں ٹہلتے ہوئے بولا ــــ" اب آپ اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دیں۔ شاید اب آپ یہ چاہتی ہیں کہ بس کراچی جاؤں ــــ سارہ سے ملوں۔ اسے اپنے یوسف ثانی ہونے کا احساس دلاؤں اور شاہد سے جھگڑا کر میدان اپنے حق میں ہموار کر لوں ــــ"

شانی دم بخود بیٹھی تھی۔ ضیاء کا سرخ چہرہ اور انگارہ انگارہ آنکھیں دیکھ کر اسے لگ رہا تھا ــــ!

رابعہ بیگم بھی کترائی کترائی کاج کئے جا رہی تھیں۔

"امی ــــ" وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں کشکول نہیں ہوں۔ کہ سارہ اس میں خیراتی سکے کی طرح ڈال دی جائے۔"

"ہائے ہائے پگلے۔" رابعہ بیگم نے ہنسنے کی کوشش کی۔ "کیسی باتیں کر رہا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں بھائی جان۔" شانی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اچھا بھئی ــــ ہو گئی نا بات ــــ تم لوگ راضی نہیں تو مجھے کیا" ــــ رابعہ بیگم یونہی بات کرنے کی غرض سے بولیں ــــ اور پھر شانی کو کاج دکھانے لگیں۔

ضیاء چند لمحے اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔

پھر

اخبار اٹھائی اور سامنے والے کمرے میں چلا گیا۔

ماں بیٹی دیر تک سر جوڑے باتوں میں مشغول رہیں۔ ضیا کے دو ٹوک فیصلے سے رابعہ بیگم کی سوچوں کے مزید پھیلنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔

شاید اس بات کا انہیں افسوس بھی تھا۔ لیکن بیٹے کے تیور و انداز بتا رہے تھے کہ زبردستی نہ کی جا سکے گی۔

زبردستی کی بظاہر گنجائش بھی کہاں نکلتی تھی۔ سارہ کی طرف سے جواب حوصلہ شکن تھا۔

موہوم امیدیں بسا اوقات نہیں لے ڈوبتی ہیں ــــ!

خوب صورتی اور نفاست سے آراستہ خواب گاہ میں دھیمی دھیمی روشنیاں سلگ رہی تھیں۔ خوابناک سا گھمبیر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ زوبی شب خوابی کے لباس میں شاندار بیڈ پر لیٹی تھی۔ اس کے خوب صورت اور حسین چہرے پر تفکرات کے سائے پھیل رہے تھے اور وہ بار بار مضطربانہ کروٹیں بدل رہی تھی۔

وہ سوچوں میں گم تھی!

آج کا واقعہ اس کے ذہن میں شدت کی تلخی پیدا کر رہا تھا۔ اس واقعے کا تعلق گو اس کی ذات سے نہ تھا۔ لیکن سارہ کے واسطے سے وہ بے تعلق بھی نہ تھی۔ سارہ سے اس کا ناطہ برائے نام ہی تھا۔ ایک دوسرے سے بیگانگی کی حد تک بے تعلقی اس گھر کے مکینوں کا شیوہ بنی ہوئی تھی۔ لیکن جانے کیوں؟ پچھلے چند مہینوں سے زوبی سارہ کے لئے اپنے دل میں پیار کا جذبہ محسوس کرنے لگی تھی۔

سارہ نے شاہد کے متعلق زوبی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ خلوص سے اسے چاہ رہی تھی۔ اپنا مستقبل شاہد سے وابستہ کرنے کا عزم تھا۔ اسکی چاہت اور محبّت میں کجی تھی نہ دھوکہ ــــــ زوبی سارہ ہی کے ایما پر شاہد سے ملی تھی۔

اس کی نظریں جہاندیدہ تھیں یا تجربہ کار۔ شاہد کے کردار کے کئی پرت اُن دیکھے ہی اس کی حساس طبیعت نے دیکھ اور محسوس کر لئے تھے۔ سونیا سے اس کا تعلق بھی اسے کھٹکا تھا۔

لیکن سارہ کی خوشنودی اور بیگانگی کے جذبے سے مغلوب ہو کر اس نے شاہد کے حق میں رائے دی تھی۔ سارہ کو بھی مطمئن کر دیا تھا۔ اور ناصر سے بھی یہی کہا تھا۔

ناصر زمانے کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ عزیزوں رشتہ داروں سے کٹ کر زندگی گذاری تھی۔ تو اِن کی لگن کچھ تشنگی کی حد تک بڑھ گئی تھی۔ رابعہ بیگم کے خط

کا بہانہ ہی تھا تجدیدِ تعلقات کا۔ زوبی نے شاہد کے متعلق سب کچھ بتایا تھا۔ پھر بھی رابعہ بیگم کو بلا بھیجا تھا۔ اور دل سے چاہا تھا کہ پرانے ناطے پھر سے جڑ جائیں۔

زوبی سے ناصر نے کھل کر اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا لیکن زوبی نے شاہد کی طرفداری کی تھی

"جوان بچوں پر اب جبر کا زمانہ کہاں ہے۔ پھر شاہد معقول آدمی ہے۔ سارہ اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

ناصر نے رابعہ بیگم کے آنے پر جس محبّت اور اپنائیت کا مظاہرہ کیا تھا سارہ نے اسے خطرے کی علامت سمجھا تھا۔ اور شاید اسی لئے صاف طور پر باپ سے خود بھی ساری بات کہہ دی تھی۔ ضیاء کے متعلق یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اسے اس اَن دیکھے آدمی سے غیر محسوس سی نفرت بلکہ کراہت کا احساس ہوتا ہے۔

ناصر چُپ ہو گیا تھا۔ بات رابعہ بیگم تک بھی پہنچی تھی۔ نوشتہ تقدیر سمجھ کر ناصر نے صبر کر لیا۔

شاہد اور سارہ کے میل جول میں اب کوئی رکاوٹ تھی نہ رخنہ اندازی وہ بے رنک ٹوک آنے لگا تھا۔ اور سارہ بھی ناصر کی با دلِ نخواستہ دی ہوئی اجازت سے اس کے ساتھ کبھی کلب اور کبھی پکچر جانے لگی تھی۔ کبھی کبھی زوبی بھی دونوں کا ساتھ دیتی۔

یونہی۔

بلا ارادہ۔

محض اپنا وقت گذارنے کے لئے۔

لیکن خُدا جانے کیسے اور کیونکر زوبی کے اندر کی عورت کے ممتا کے سوتے از خود بہنے لگے تھے۔ سارہ کے دل میں اپنائیت کا احساس جاگنے لگا تھا۔

شاید زوبی کے اندر کی عورت جسے حالات نے تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ اب بیدار ہو گئی

تھی۔ اور ظاہری عورت بھربھری مٹی بن کر جھڑتی جا رہی تھی۔

یہ حقیقت تھی۔

اور

اگر حقیقت نہ ہوتی آج کا واقعہ اس کے لئے ذہنی کشمکش کا باعث نہ بنتا۔

رات کلب میں ڈنر تھا۔ زوبی اپنی دوست مسز زیدی کے ساتھ ڈنر میں شریک تھی۔ ہال میں روشنیوں کا غبار پھیلا تھا۔ دھیمی دھیمی آرکسٹرا کی تانیں ماحول کو بڑا پُرسکون اور خوشگوار بنا رہی تھیں۔ لوگ میزوں کے گرد بیٹھے تھے۔ کئی جوڑے تھے۔ کئی دوستوں کے گروپ تھے کئی جانے انجانے چہرے ایک دوسرے کے مدِمقابل بیٹھے تھے۔

کوئی پی رہا تھا۔

کوئی پلا رہا تھا۔

اور

کوئی پینے پلانے سے احتراز کرتے ہوئے صرف باتوں پر اکتفا کئے ہوئے تھا۔

بڑا ہی خوب صورت حسین اور دل فریب ماحول تھا۔

کہ

اچانک برابر کے بار سے شور سا سنائی دیا۔ گنگناتی ہوئی خاموشی کے سینے پر اس شور کی خراشیں پڑیں تو ہال میں بیٹھے لوگ ادھر ہی متوجہ ہو گئے۔

"کیا ہُوا۔؟"

"کون بک رہا ہے؟"

"کوئی بہک گیا ہے۔"

"ضرورت سے زیادہ پی لی ہو گی۔"

"آداب کا کچھ خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔"

"کوئی آوارہ ہے"۔

"لوفر۔"

"لفنگا۔"

جلتے جلتے جملے کہے جا رہے تھے۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر بار کی طرف جا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہال سے بیشتر لوگ اُٹھ کر بار کے باہر جمع ہو گئے تھے۔ اور اندر دھینگا مشتی ہو رہی تھی کئی بوتلیں ٹوٹ گئی تھیں۔ پیمانے کرچی کرچی ہو گئے تھے اور جھگڑے کی آواز تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" مسز زیدی گھبرا گئی۔

"بار میں کسی کی لڑائی ہو رہی ہے شاید" زوبی نے کہا۔

"بیوقوف لوگ جانے یہاں کیا لینے آجاتے ہیں" مسز زیدی بولی۔

"ہوں"۔ زوبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی تمام تر توجہ آوازوں کی طرف تھی۔

کلب کا ایک ملازم ادھر سے گزرا تو زوبی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔!

"بھئی یہ کیا ہو رہا ہے"

"ایک صاحب ضرورت سے زیادہ پی گئے ہیں" ملازم طنزیہ ہنسا۔

"اسے نکال باہر کیوں نہیں کرتے ــــ سب کو ہراساں کر دیا ہے کم بخت نے"

"یہی مشکل ہے مادام ـــ وہ خود جاتا ہے نہ لڑکی کو جانے دیتا ہے۔ میرے خیال میں مینجر کو اطلاع مل گئی ہے۔ وہ اگر خود ہی نپٹ لیں گے۔ ہم لوگوں کے تو قابو میں نہیں آرہا۔ بہت سا نقصان بھی کر دیا ہے اس نے"

"بہت سی قیمتی بوتلیں توڑ ڈالی ہیں"۔ پاس سے گزرنے والا ایک شخص بولا۔

"بات بڑھ گئی ہے" ملازم نے اس آدمی سے کہا۔ "پولیس کو بلانا چاہیئے"

"میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔" وہ بولا۔

"ایسے لوگوں کے داخلے پر پابندی ہونا چاہئے۔"

"پتہ کیا چلتا ہے۔ اچھا بھلا آدمی ہے۔ ساتھ مس سونیا ہے۔"

سونیا کے نام پر زوبی چونک گئی۔ اس رسوائے زمانہ لڑکی کے متعلق سارہ نے یہ بتایا تھا کہ وہ شاہد کی کزن ہے اور اسی کی وساطت سے دونوں میں دوستی ہوئی ہے۔

زمانہ شناس ذہن ایک دم چونکا۔ زوبی کو تجسس ہوا۔ سونیا کے ساتھ کہیں شاہد ہی تو نہیں۔

اس سوچ کے سوچتے ہی وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور مسز زیدی سے لمحاتی معذرت کرتے ہوئے تیزی سے باہر نکلی۔

اس کا رخ بار کی جانب تھا۔

اور

جب اس نے مینجر اور دیگر ملازمین سے الجھنے اور ہاتھا پائی کرنے والے شخص پر پہلی نگاہ ڈالی۔

تو ٹھنڈی سرد سی سنسناتی ہوئی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

بلاشبہ

وہ

شاہد ہی تھا۔"

"وہ ساتھ سونیا تھی۔ جس کا لباس کئی جگہ سے مسکا ہوا تھا۔ اور جس کی ساڑھی کا پلو شاہد نے سختی سے پکڑ رکھا تھا۔"

"لوگ اس واردات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کئی شاہد کو اچھی طرح سے جاننے والے تھے۔ دبے دبے الفاظ میں باتیں اور تمسخر اڑا رہے تھے۔"

"اب ضرورت سے زیادہ ہی پینے لگا ہے۔" ایک صاحب کہہ رہے تھے۔

"اس تباہی کی طرف اسے سونیا ہی لائی ہے۔" دوسرے کے منہ سے نکل رہا تھا۔

"دونوں حصے دار جو ہوئے۔" پہلا بولا۔

"کس بات کے۔" دوسرا تجسس سے بولا۔

"کسی سیٹھ کی لڑکی کو پھانس رکھا ہے دونوں نے۔ سونیا کے کاروبار کا تمہیں علم نہیں؟"

"ہے ___" وہ بولا۔

"حصہ پتی خوب رکھتی ہے۔" اس نے دبی زبان سے اسے گالی دی۔

"عیاشی بھی کرتی ہے اور مال بھی لیتی ہے۔"

"وہ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔"

اور

زوبی کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اندھیرے میں روشنی کے پردے اتر رہے ہیں۔ شاہد کا اصل روپ اس کے سامنے تھا۔ اس کا ننگا کردار وہ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ کانوں سے سن رہی تھی۔

یہ واقعہ معمولی نوعیت کا نہیں تھا جسے وہ درگذر کر دیتی۔ وہ بے شک سارہ کی ماں نہیں تھی۔ اور سوتیلے پن کا تقاضا بھی شاید یہی تھا۔ کہ وہ اس بات کو صفر سے ضرب دے کر مطمئن ہو کر سو جاتی۔

لیکن

اس اندر کی عورت نے تو ان دنوں جیسے اس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ سارہ کے لئے جذبات بیدار ہو رہے تھے۔ ممتا سلگ رہی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود وہ اسے اس نئی افتاد سے آگاہ کرنا چاہ رہی تھی۔

لیکن

کیا سارہ کا خلوص محبت اور پیار یہ بات مان لے گا۔ اسے ذہنی دھچکہ تو نہیں لگے، وہ بوکھلا کر کوئی سنگین حرکت تو نہ کر بیٹھے گی۔

زوبی بے چینی سے نرم اور ویلیوٹ کے بیڈ پر کروٹیں بدلتی۔ ملگجے اجالوں میں یہی باتیں سوچ رہی تھی۔

اسے پتہ نہیں چل رہا تھا

کہ

کیا کرنا چاہیے

ناکامی سے کہیں زیادہ اذیت ناک ناکامی کا خوف ہوتا ہے۔ یوں ہی جیسے موت سے زیادہ تکلیف دہ موت کا خوف۔ موت بذات خود اتنی تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتی تو ہر انسان اتنی آسانی سے مر کیوں جاتا۔

سارہ بھی جب تک تذبذب اور کشمکش کے عالم میں رہی۔ ناکامی کا بھیانک اور روح فرسا احساس اسے اپنی لپیٹ میں لئے رہا۔ وہ کانپ کانپ گئی اس پر یوں مردنی چھائی رہی اور رو رو کر اس نے بُرا حال کر لیا۔

زوبی نے اسے ملائمت سے سمجھایا تھا۔ کئی دنوں کی جذباتی کشمکش کے بعد اس نے سارہ کو شاہد کے کردار کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔

نہیں زوبی آپا۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ شاہد ایسا نہیں ہے۔" سارہ اندر ہی اندر کانپ گئی تھی۔

" ایسا شاید نہیں ہو گا۔ لیکن سونیا کے متعلق تم کچھ نہیں جانتیں۔ ؟"

صرف اتنا جانتی ہوں۔ کہ وہ شاہد کی مخلص دوست اور کزن ہے"

"وہ مخلص دوست ہے نہ کزن۔ صرف کاروباری رابطہ ہے دونوں کا"

"جی"

" ہاں سارہ۔ تم بہت سادہ ہو۔ سادہ شریف اور معصوم"

اور پھر

زوبی نے سونیا کے متعلق اسے بہت کچھ بتاتا۔ اتنا کچھ کہ باور کرنے کی سارہ میں ہمت تھی نہ قوت۔ کبھی آنکھیں پھاڑے زوبی آپا کو تکنے لگی۔ کبھی منفی انداز میں سر دائیں بائیں ہلا کر ان بیان کی تردید کی اور کبھی سر جھکا کر جیسے تسلیم و رضا کی خو کا اظہار کر دیا۔

اعتماد کی اساس پر کھڑا حال و مستقبل کا ڈھانچہ اتنی جلدی متزلزل کہاں ہو سکتا ہے سارہ سونیا کے بارے میں سب کچھ سن کر تیقین کی حدود تک پہنچ بھی جاتی۔ تب بھی شاہد کے متعلق صرف زوبی آپا کا کہہ دینا ہی کافی نہ تھا۔ وہ تو اس کی ہر حس پر قبضہ کئے ہوئے تھا۔ اس قبضہ کو توڑنے کے لئے زوبی آپا کی عرق ریزنہ کاوش درکار تھی۔ زوبی سارہ کو اس بد قماش انسان سے بچانے کا عزم کر چکی تھی۔ گو وہ خود اتنی عمر رسیدہ تو نہ تھی لیکن دو سال اس کے لئے تجربات کی بھٹی بن کر گذر رہے تھے۔ اس عمر میں بھی اس نے اتنا کچھ سیکھ لیا تھا جس کے لئے بعض اوقات طویل سے طویل عمر بھی لمحہ حقیر ہوتی ہے۔

نام کو تو وہ سوتیلی ماں تھی۔ سوتیلا پن جو ازل سے شاید ابد تک، دہکتا ہوا انگارہ بن کر عورت کے اس روپ سے لپٹا رہے گا۔ لیکن زوبی نے کبھی سارہ سے یہ جلن محسوس نہ کی تھی۔ اس میں اس کے نظریات کا کوئی عمل دخل تھا۔ یا گھر کی بیگانہ فضا کا۔

اس کا تعلق جب سارہ سے محض برائے نام تھا۔ تو جلن اور سوتیلا پن محسوس بھی کیونکر کرتی، ہر کوئی اپنا اپنا جادہ راہ سنبھالے تھے۔ اپنے اپنے دائرے میں گھومتے تھے۔ اپنی اپنی ذات کے سفر میں تنہا تھے۔ اس لئے روائتی جذبوں کی جنگ ان کے یہاں تھی ہی نہیں

کئی دن سارہ پریشان رہی۔ زوبی اسے سمجھاتی رہی۔ لیکن سارہ کوئی بات سمجھنے کو تیار نہ ہوتی تو بات بھی تھی۔ وہ ذہنی طور پر تیار ہی نہ ہو پاتی۔ کہ شاہد کے متعلق ایسی باتیں سن سکے۔

ایک دن تو اس نے ادب و لحاظ ملحوظ رکھے بغیر زوبی آپا سے تلخ لہجے میں کہا" میں

آپ کی باتیں بالکل نہیں مان سکتی۔ بلکہ میں یہ تک کہنے کو تیار ہوں کہ آپ مجھے اچھا جیون ساتھی ملتے دیکھ کر خوش نہیں۔ آپ کے اندر کوئی انتقامی حس ہے جو آپ کو ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے لیکن محترمہ۔ آپ کو اگر عمر رسیدہ دولت مند کے پلے باندھ دیا گیا۔ تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ اپنے بدلے میں آپ شاید میرا حق چھیننا چاہتی ہیں۔

زوبی آپا غصے میں آنے کی بجائے مسکرا دی تھیں۔ سارہ کے غصے سے کانپتے وجود کو انہوں نے بازوؤں میں تھام لیا تھا۔ اور پھر بڑے پیار سے اسکی پیشانی چوم کر کہا تھا۔

" یہ تمہاری سوچ اتنی کجروی پہ کیوں اتر آئی۔ میں تمہارے بھلے کی بات کر رہی ہوں"

سارہ کچھ کچھ شرمندہ ہو گئی تھی۔

ہم سب خود غرض ہیں سارہ۔ اسمیں کوئی شک نہیں۔ ہم وہ نہیں ہوتے جو بظاہر نظر آتے ہیں۔ ہمارے اندر وہ انسان بڑے طمطراق سے بیٹھا ہوتا ہے جو جنگلی ہے۔ وحشی ہے۔ تہذیب ناآشنا ہے۔ جو کسی اصول کو نہیں مانتا۔ کسی قانون سے آگاہ نہیں۔ جو آزاد ہے اور آزادی کا حق آزادی ہی سے استعمال کرتا ہے۔ جو وہی کہتا ہے جو حق سمجھتا ہے۔ بے شک وہی سچا اصلی اور صحیح انسان ہے۔

زوبی کا فلسفہ سارہ کی سمجھ میں نہ آیا تو وہ پوری آنکھیں کھولے اسے تکنے گئی۔ زوبی مسکرائی اور دھیرے دھیرے بولی" شاید میرے اندر کا جنگلی انسان بھی تم سے انتقام لینے کے لئے واویلا کر رہا ہو۔ لیکن سارہ۔ تمہیں یہ اعتراف ضرور کرنا پڑے گا۔ کہ ہم اپنے اندر کے اس انسان کی چیخ و پکار چاہے وہ کتنی سچی ہی کیوں نہ ہو دبا دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یوں کہو کہ شکر ہے کہ یہ انسان اندر ہی اندر واویلا کرتا ہے۔ اس کی خارجی چیخ سرے سے ہے ہی نہیں ورنہ اللہ جانے کیا کیا قیامتیں ٹوٹتیں۔"

سارہ سر جھکائے نیلی مخملیں کرسی پہ دھنسی بیٹھی رہی۔ اور کمرے کے دبیز قالین پر بے آواز قدم رکھتے زوبی آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے مسکرائی "یقین مانو سارہ۔ میں نے تمہیں

جو کچھ بتایا ہے۔ اس میں گہرے اندر کے انسان کی چیخ و پکار کا کوئی دخل نہیں"

سارہ پھر بھی آنکھیں بند کیئے پڑی رہی۔

تم باشعور لڑکی ہو۔ ناسمجھ بے وقوف اور ناعاقبت اندیش بھی نہیں ہو۔ محبت اٹل حقیقت ضرور ہے۔ لیکن اسے سوچ و فکر سے جدا کر دینا زندگی کی بہت بڑی حماقت ہے"

زوبی آپا" سارہ بے دم سی ہوگئی

تم اپنے طور پہ تحقیق و جستجو کر سکتی ہو۔ اچھائی کا کوئی تو معیار تمہارے سامنے ہوگا اگر شاہد اس پہ پورا اترے تو خوشی کی بات ہے۔ اگر نہ اتر سکے تو میری مخلصانہ رائے یہی ہوگی کہ بڑھتے قدموں کو روک لینا"

زوبی آپا کی یہ بات سارہ کے دل لگی۔

"آپ نے صحیح کہا ہے زوبی آپا۔ میں شاہد کے بارے میں خود بھی تحقیقات کروں گی۔"

"ضرور" زوبی سامنے والے صوفے پہ نیم دراز ہوگئی۔

پھر دونوں اپنے اپنے طور پہ تحقیق میں لگ گئیں۔ زوبی آپا کا حلقہ احباب خاصہ وسیع تھا۔ معلومات میں حیرت انگیز اور حوصلہ شکن اضافہ چند دنوں ہی میں ہوگیا۔

رپورٹ کچھ سارہ کو بھی امید افزا نہ ملی تھی۔ اس لیئے وہ چپ چپ نظر آتی تھی، ہر وقت کھوئی کھوئی پریشان پریشان رہنے لگی تھی۔

شاہد صرف شراب ہی کا رسیا نہیں تھا۔ ایسی بات ہوتی تو شاید اونچے طبقے کی ایک خوبی کہہ کر اسے درگزر کر دیا جاتا۔ لیکن زوبی کی نظروں میں تو اس کی اور بھی بہت سی خوبیاں آگئی تھیں۔ وہ اس کا کھلاڑی تھا۔ برج اور فلاس میں خاصہ نام و مقام رکھتا تھا۔ اور اب تو حشیش کا عادی بھی ہو رہا تھا۔

اس دن اتفاق ہی کی بات تھی۔ جو زوبی سارہ کو بھی ڈنر پہ ہوٹل ساتھ لے گئی۔ زوبی کی دوست مسز شاکرہ عمران کی شادی کی پانچویں سالگرہ کا فنکشن تھا۔

ہال کے بغلی کمرے میں تاش کی محفل سجی تھی۔ فلاش کھیلا جا رہا تھا۔ اور شاہد شہر کے نامی گرامی جوئے بازوں کی کمپنی میں ہار جیت کا کھیل بڑے جوش و خروش سے کھیل رہا تھا۔

شاہد کی موجودگی کے متعلق زوبی کے ایک قریبی ملنے والے نے اسے اشارہ بتلا دیا۔ موقع سے استفادہ کرنا ضروری تھا۔ جب زوبی سارہ کو دکھانے ادھر لے گئی۔ تو شاہد اردگرد سے بے خبر ہوش و حواس تک سے بیگانہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ آج تقدیر کے چکر میں آیا تھا۔ ہار مقدر ہو رہی تھی۔ کئی بازیاں ہار چکا تھا۔ جوں جوں ہارتا شکست اور آتش زیر پا کرتی اور وہ پہلے سے زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے بازی لگا دیتا۔

سارہ کی عجیب و غریب ذہنی حالت تھی۔ کبھی تو اس کا جی چاہتا آگے بڑھ کر شاہد کا منہ نوچ لے۔ اس کا گریبان تار تار کر ڈالے اس کے منہ پہ تھوک دے۔

اس نے جلوت اور خلوت میں کتنی بار اسے ٹٹولا تھا۔ کتنی بار کھل کر پوچھا تھا۔ کتنی منت سماجت کی تھی۔

لیکن

اپنی خامیوں کو برملا مان لینے کا جگرا ہر ایک کا تو نہیں ہوتا۔ اتنی اخلاقی جرأت تو ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ سارہ کو مطمئن کرنے کے لیئے شاہد نے بے دریغ قسمیں کھائی تھیں۔ اس کے وہمے مٹانے کو اپنے آپ کو انتہائی سادہ لوح شریف النفس اور پاکبازنہ بنانے کی ہر ممکن سعی کی تھی ابھی کل ہی کی تو بات تھی۔ شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ ہوائیں آوارہ سی ہو رہی تھیں آسمان پہ ہلکے ہلکے بادل تیر رہے تھے۔ چمن کے شجر پودے اور پھول بدمست شرابی کی طرح ہواؤں کی چھیڑ سے لپک رہے تھے۔ سارہ اپنے آپ میں ڈوبی سبز مخملیں گھاس کے فرش کو ہولے ہولے قدموں تلے روند رہی تھی۔ کہ شاہد اسے لینے آگیا تھا۔

دور ہی سے دیکھ کر بشاش لہجے میں ہاتھ ہلاتے ہوئے پکارا تھا۔ اور پھر تیزی سے اس کی جانب بڑھ آیا تھا۔ جیسے مقناطیسی کشش کھینچ لائی ہو۔ اس نے لپک کر سارہ کو بازو سے

تھامنا چاہا تھا۔

لیکن

سارہ کچھ تو عادت سے مجبور اور کچھ حالات کی پیدا شدہ صورت سے خائف تھی۔ فوراً پیچھے ہٹ گئی تھی۔

شاہد کو ناگوار تو گذرا تھا لیکن مصلحت مسکرانے میں تھی "اللہ جانے یہ سختی کب معاف ہوگی۔ اس نے ہنس کر ذو معنی انداز میں کہا تھا۔

کیا سوچ رہے ہو" سارہ نے ٹھوس لہجے میں کہا تھا۔ چاہو تو معافی ہو سکتی ہے۔ تاخیر تمہاری طرف سے ہی ہے۔"

شاہد اس کے اندازِ تکلم سے ٹھٹکا تھا۔

"ناراض ہو گیا ؟" اس نے فوراً کہا تھا۔

سارہ صرف اسے تکے گئی تھی۔

"لگتا ہے میرے کسی دشمن نے لگائی بجھائی کر کے تمہارے ذہن میں شک کی آگ لگا رکھی ہے۔"

"تم چاہو تو اس شک کو دور کر کے آگ بجھا سکتے ہو۔"

"کیا کروں۔"

"خلوص اور سچائی سے میری باتوں کا جواب دو۔"

ایک بار نہیں کئی بار دے چکا ہوں۔"

تو کیا یقین کر لوں۔ کہ تم شراب نہیں پیتے۔ جوئے سے ریس سے۔ کلب سے برج سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں۔ حشیش بھی نہیں استعمال کرتے" سونیا سے تمہارے تعلقات صرف دوستانہ ہیں۔

"مجھے یقین دلانے کے لیے اثبات میں کتنی بار سر ہلانا ہوگا"

"سنجیدگی سے جواب دو شاہد"

تم مجھے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہو۔ اور میں تمہاری قسم کھا کر بارہا تمہیں ان وسوسوں سے نکالنے کی کوشش کر چکا ہوں۔"

سارہ نے شاہد کی آنکھوں میں جھانک کر بے نقاب سچائی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی لیکن شاہد رُخ پھیر کر درخت کی جھولتی شاخوں کو ہاتھ میں پکڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

سارہ سچ اور جھوٹ کے بین بین ڈولتی رہی تھی۔

لیکن آج جھوٹ کا پول کھل کر سامنے آگیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے سچائی کی کرچیاں کرچیاں بکھرتی دیکھ لی تھیں۔

دکھ اور صدمے اور رنج سے وہ نڈھال ہو کر زوبی آپا کے کندھے سے لگ کر سسک اٹھی تھی۔

لیکن

ساری جذباتیت اور کمزوری کے باوجود شاہد کے لئے اس کے دل میں نفرت کا ریلہ امڈ آیا تھا۔ ایسا تنومند ریلا جو اس کے لطیف لطیف محسوسات اور گداز گداز کیف زا دھڑکنوں کو بہالے گیا تھا۔

اور

پھر تیسرے دن جب وہ شاہد سے ملی تو سر تاپا بدلی ہوئی تھی۔ لاش کو دفن کر دینے کے بعد والا سکون اس پر طاری تھا۔

شاہد سے یہ اس کی آخری ملاقات تھی۔ اس نے شاہد کو کچھ کہنے کا موقع دیا تھا نہ صفائی کا وقت۔ کھڑے کھڑے گھر سے نکل جانے کا حکم دے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے تعلقات منقطع کر لئے تھے۔

اس کا دامن آلودہ نہیں تھا۔ جو اس کو مستقبل میں شاہد کی طرف سے کسی کیچڑ کے اچھلے

جانے کا خوف ہوتا۔ اس کے دامن میں تو محبت کے پھولوں کی مہک ہی مہک تھی۔ پاکیزہ، پرسرور اور پراسرار سی مہک۔

یہ مہک سٹراند بھی بن سکتی ہے اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ یہ اچانک اور غیر متوقع طور پہ احساس ہوا تھا۔ جو صدمے کا باعث بھی تھا۔ اور دکھ اور رنج کا بھی۔

کئی دن وہ حواس باختہ سی رہی۔ زوبی آپا نے ناصر سے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ ناصر کی توجیے امید بر آئی تھی۔ ایک طرف زوبی کا احسان مند۔ تو دوسری طرف سارہ کے لئے بھی دردمندی کے خزانے کھول دئے تھے۔ بیٹی کو مدتوں بعد اتنا بھرپور پیار دیا کہ وہ یہ صدمہ جھیل جانے کے لئے ذہنی اور جسمانی طور پہ اپنے آپ کو قابل پانے لگی۔ انسان سے زیادہ سخت جان واقعی کوئی شے نہیں۔ ہم جن باتوں کا تصور کر کے بھی لرز اٹھتے ہیں۔ وہ باتیں جب ہم پر وارد ہوتی ہیں تو سہہ بھی جاتے ہیں۔ جن جانکاہ صدموں کے تصور ہی سے مر مر جاتے ہیں۔ ان کے جھیل جانے کے باوجود زندہ رہتے ہیں۔ ٹوٹ پھوٹ کر بھی نہیں بکھرتے۔ ریزہ ریزہ ہو کر بھی صحیح و سالم نظر آتے ہیں۔

شاید

یہی

معراج انسانیت ہے۔

" بھیا "

" ہوں "

" یہ اتنی ڈھیر ساری کتابیں پھر سے پڑھیں گے "

" ہاں "

" ہائے اللہ "

" کیوں۔ بری بات ہے کیا "

" بری بات تو نہیں۔ بڑی ہمت ضرور ہے۔"

تو پھر کیا کروں۔ اس طرح تو نوکری ملنے سے رہی۔"

عجیب زمانہ ہے مقابلے کا امتحان پاس کر کے بھی نوکری نہیں مل رہی۔"

" بھئی کچھ اچھی پوزیشن جو نہیں آئی تھی۔ اب سینکڑوں لوگ امتحان پاس کرنے لگیں تو اوّل درجے کی نوکریاں کہاں سے ڈھیروں آجائیں۔ اب میں پوری لگن سے محنت کر کے پھر امتحان دونگا۔ اوّل دوم یا حد سوم پوزیشن لوں گا۔"

انشاء اللہ۔

" انشاء اللہ۔ پھر دیکھنا نوکری کیسے ملتی ہے۔ ایکدم اے سی بن جاؤں گا"

" پھر تو بہت اچھی بات ہے۔"

"اب آئی سمجھ میں۔"

"لیکن بھیا"

"اچھا محترمہ شانو صاحبہ ۔ باتیں بند ۔ اور تشریف لے جائیے کمرے میں سے ۔ مجھے"

"توبہ بھیا۔ تین گھنٹے سے متواتر پڑھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر باتیں کرلیں نا۔"

"شانو۔ تیری باتیں کبھی ختم بھی ہوں گی ۔ ؟"

تھوڑی دیر اور ۔ بھیا۔ بڑے مزے مزے کی خبریں ہیں میرے پاس"

"شانی نے میز پر بیٹھتے ہوئے شوخی سے آنکھوں کو گھماتے ہوئے مسکرا کر ضیا کو دیکھا"

ضیا نے کتاب میز پر پھینک دی اور کرسی قدرے پیچھے گھسیٹ کر بولا۔ "فرمائیے جناب پٹاری میں کیا کیا ہے۔ نئی تازہ خبر کونسی ہے۔"

"بتا دوں"

"ہاں"

"ماموں آرہے ہیں۔"

"ناصر ماموں"

"ہاں"

"تو میں کیا کروں۔"

"ساتھ پتہ ہے کون آرہا ہے"

"کون" ممانی ہو گی"

"نہیں جی"

"تو اور"

"محترمہ سارہ صاحبہ"

"سارہ ۔ ؟!!"

"ہاں بھیا۔"

"تجھے کس نے بتایا"

"ماموں جان کا خط آیا ہے۔"

"کب"

"آج ہی"

"مجھے تو دکھایا نہیں۔"

"آپ گھر پہ تھے ہی کب ۔ ؟ جب آئے۔ تو کمرے میں گھسے بیٹھے رہے۔ بتاتی کب؟"

"یہ نزول کس سلسلہ میں ہے"

پتہ نہیں۔ لکھا تو کچھ نہیں۔ صرف یہی لکھا ہے۔ کہ میں دو دن کے لئے ضروری کاروباری کام سے آرہا ہوں۔ ساتھ سارہ بھی ہو گی۔"

"ہوں"

"میں تو اس سے بات تک نہ کروں گی۔ بڑی آئی ۔ ہونہہ ۔ اس طرح انکار کر کے اب بھلا کس منہ سے یہاں آرہی ہے۔"

ضیا کچھ نہیں بولا۔ شانی کی بات وزنی اور معقول تھی۔ "کہیں یہ امی ہی کی دعوت کا نتیجہ نہ ہو۔" اس کے زیرک ذہن نے سوچا۔ "جو کام وہ مجھے کراچی بھیج کر کرنا چاہتی تھیں وہ سارہ کو یہاں بلا کر بھی تو سرانجام دینے کی توقع کی جا سکتی ہے۔" "آپ بھی اسے منہ نہ لگائیے گا بھیا۔" شانو نے معصومیت سے کہا۔ ضیا مسکرانے لگا۔ سادہ سی شانو پر اسے بڑا پیار آیا۔

"میں تو منہ لگاؤں یا نہ لگاؤں۔ تو اس سے آتے ہی دوستی ضرور کرے گی۔ اتنا میں جانتا ہوں۔"

"نہیں جی۔ کبھی بھی نہیں۔ امی کی لاڈلی۔ امی ہی کے سنگ دو دن گزارے گی۔"

"امی جبھی آج بہت خوش تھیں۔"

"اور کیا بھیا۔ اللہ جانے سارہ میں انھیں کیا نظر آتا ہے۔"

"اس کا پس منظر بہت روپہلا ہے شانو بی۔ امی کیا۔ آج کے دور کی شاید ہر ماں ایسے پس منظر پہ ریجھ جاتی ہے۔"

"ہونہہ۔"

شانو سارہ سے دبی دبی نفرت کا کھلم کھلا اظہار کرنے لگی۔ ضیا اس کی باتوں کو سنی ان سنی کر رہا تھا۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے سوچوں کے مراحل سے گذر رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی جو بچپن سے اس سے منسوب تھی۔ مدتوں بعد اس کے سامنے آ رہی تھی۔ گدگداہٹ کا غیر محسوس سا احساس سینے میں کروٹیں لینے لگا تھا۔ لیکن یہ لڑکی دیکھے بنا اسے مسترد کر چکی تھی۔ رقابت کے شعلوں سے ضیا کو اپنا سینہ جلتا ہوا محسوس ہوا۔ متضاد خیالات سے وہ بوکھلا گیا۔

وہ اس نہج پر کیوں سوچنے لگا تھا۔ سارہ آ رہی تھی تو آئے اس کی بلا سے۔ وہ اُسے قطعاً لفٹ نہیں دے گا۔ بلکہ اپنی سلگتی ہوئی انا کا بدلہ لینے کے لئے اس سے سرد بیگانہ اور کوفت دینے والا رویہ اختیار کرے گا۔

شانو باتیں کرتی رہی۔ اور اس کے ذہن میں پلان بننے بگڑنے اور پھر سے بننے لگے۔

"وہ آ کب رہے ہیں" ضیا نے ٹھوس بلکہ کرخت آواز میں پوچھا۔

شانو نے جلدی جلدی انگلیوں پر دن گنے۔ سولہ سترہ اٹھارہ انیس بیس اکیس اکیس کو آ رہے ہیں۔ آج سے ٹھیک چھٹے دن۔ شام پانچ بجے۔"

"پلین سے آئیں گے۔"

"تو اور کیا گاڑی سے"

"ہوں"

"ہوائی اڈے پر انھیں لینے جانا تو آپ کو پڑے گا ہی۔ لیکن بالکل ریزرو رہئے گا ہاں"

"ضروری تھوڑا ہی ہے۔ کہ میں ہی لینے جاؤں۔"

"میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ شاید امی بھی چلیں۔"

"تو پورے اعزاز کے ساتھ ان لوگوں کو خوش آمدید کہا جائے گا۔"

"بھئی یہ تو کرنا پڑے گا ہی۔"

ضیا ہنس پڑا۔ "ہوئے ہوئے تجھے تو سب کچھ ہی کرنا پڑے گا۔ لیکن میری طرف سے سب کو صفر سے ضرب۔"

شانی بھی ہنس پڑی۔

ناصر اور سارہ کی آمد کا مژدہ جانفزا اماں کے لئے ہزارہا خوشیوں اور امید کا پیغامبر تھا انھیں تو سمجھ ہی نہ آ رہا تھا۔ کہ کیا کریں۔ کچھ یوں بھی امیر کبیر بھائی آ رہا تھا۔ اس محل نما جہازی سائز کوٹھی دیکھ آئی تھیں۔ کہاں جدید ترین سامان آرائش سے آراستہ کوٹھی۔ اور کہاں ان کا چھوٹا سا ڈیڑھ منزلہ یہ گھر۔ چھ دن گھر کی صفائی اور اسے سجانے بنانے ہی میں گزر گئے۔ اُوپر والے دونوں کمرے انہوں نے باپ بیٹی کے لئے صاف کر دیئے۔ چھوٹی موٹی کئی نئی چیزیں خرید لائیں۔ نئے بستر نکلوائے۔ پردے دھلوائے۔ اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی کہ مہمانوں کے شان شایاں کمرے ترتیب پا سکیں۔ سہولت کی ہر چیز انہوں نے اپنی طرف سے مہیا کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔

ضیا ان کی سرگرمی اور ان تھک کام سے چڑتا رہا الجھتا رہا۔ مذاق مذاق میں بہت کچھ کہتا بھی رہا۔ لیکن امی کی لگن میں کمی نہ آئی۔ الجھنے اور باتیں بنانے پر کبھی کبھی امی کی ڈانٹ بھی پڑ گئی۔

چھ دن گذر گئے۔ ان کے گذرنے کا انتظار جہاں امی کو تھا۔ شانو بھی اس سے انحراف نہ کر سکتی تھی۔ اور ضیا بھی اگر اپنے اندر جھانک کر ایمانداری سے تجزیے کی جرأت کرتا تو انتظار کی چبھن کا احساس اسے بھی ہوتا۔ انتظار کی نوعیت جیسی بھی تھی ویسے انتظار اُسے بھی تھا۔

وہ اوائل اکتوبر کی ایک نکھری سی شام تھی۔ سورج ڈھلتے ہی فضائیں خوشگوار سے احساس سے بوجھل ہو گئی تھیں۔ نیلا آسمان ٹھنڈک بکھیر رہا تھا۔ اور صبح ہلکی سی بوندا باندی نے فضا کی ساری کثافتیں سمیٹ لی تھیں۔ ہر چیز دھلی دھلائی اور صاف صاف لگ رہی تھی فضا میں ایکا ایکی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ اور پھر چند لمحوں بعد طیارہ رن وے پر دوڑ رہا تھا۔

رابعہ بیگم زیر لب کچھ آیات پڑھ رہی تھیں۔ بھائی بھتیجی کے خیریت سے پہنچنے کی دعائیں بھی کر رہی تھیں۔ شانو اپنے مزاج اور عمر کے اعتبار سے کوشش کے باوجود جذباتی ہوئی جا رہی تھی۔ سارہ کو دیکھنے کا اشتیاق نقطہ عروج کو چھو رہا تھا۔

ضیا بظاہر لاپرواہ سا نظر آرہا تھا۔ لیکن اس نے ادھر اُدھر گھومتے آج بے تحاشا سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔ سارہ کا آنا اسے بُرا لگ رہا تھا۔ یا اچھا۔ وہ پوری دیانت داری سے کچھ بھی نہ کہہ سکتا تھا۔

ناصر کو دور ہی سے دیکھ کر رابعہ بیگم نے ہاتھ ہلایا۔ جواباً ناصر نے بھی اسے دیکھ کر ہاتھ اُونچا کیا۔

شانو اور ضیا کی نگاہیں ان کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتی سارہ پر مرکوز ہو گئیں اُونچے قد خوبصورت جسم اور سرخ و سپید رنگت والی سارہ پہلی نظر ہی میں شانو کے دل میں اتر گئی اور

ضیا کو بھی اسے دیکھ کر کسی نکھری صبح کسی سہانی شام اور کسی ان چھوئی کلی کا احساس ہوا وہ لڑکی سے کہیں زیادہ کوئی انتہائی پاکیزہ بے داغ اور اجلی اجلی شے لگ رہی تھی۔

ضیا نے اپنے آپ سے الجھتے ہوئے نگاہیں اس پر سے ہٹالیں۔ پہلی نظر ہی میں شکست قبول کر لینے کو وہ قطعاً تیار نہ تھا۔ اس نے تو اس لڑکی سے انتقام لینے کے کئی منصوبے بنائے تھے۔ سرد مہری سب سے بڑا ہتھیار تھا جو وہ اس کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا۔ سارہ اور ناصر کے قریب آنے تک وہ اپنے آپ ہی سے لڑ رہا تھا۔

برسوں بعد ملن جتنا پر تپاک پرخلوص اور ہیجان خیز ہو سکتا تھا۔ ہوا۔ ناصر نے ضیا کو سینے سے لگالیا۔ اور ساری رنجشوں، تلخیوں اور بیگانگیوں کے باوجود ضیا کو یوں لگا۔ جیسے شفقتوں کے در کھل گئے ہوں۔ محبت کی گرمی اور پیار کی آنچ سے برسوں کی جمی برفانی تہہ پگھلنے لگی۔ ابا کے مرنے کے بعد آج پہلی بار ضیا کو کسی نے یوں چھاتی کے حصار میں محفوظ کر لیا تھا۔ پناہ دے دی تھی۔ خون کے رشتوں کی مضبوطی اور اپنے پن کا احساس آج ضیا کو پہلی بار اس شدت سے ہوا۔ کہ آنکھوں کے گوشوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی۔

"اپنوں سے ہم کٹ کیوں جاتے ہیں۔ چھٹ کیوں جاتے ہیں۔ یہ اپنائیت یہ بے لوث پیار یہ غیر رسمی چاہت یہ بے پایاں محبت جو دکھاوے کی نہیں۔ یہ سب کچھ ہمیشگی کا ضامن کیوں نہیں ہوتا۔

ضیا اس رات ایک بجے تک ناصر ماموں کے پاس بیٹھا رہا۔ سارہ اور شانو میں تو گھر پہنچتے ہی دوستی ہو گئی تھی۔ امی نے اس کے لئے الگ کمرہ سجایا تھا۔ لیکن وہ شانو کے بستر میں گھسی ہوئی تھی۔

کچھ دیر پہلے ضیا شانو کے کمرے سے ماموں کے لئے تکیہ لینے گیا۔ تو دونوں کو ایک دوسرے سے لپٹ کر سوتے دیکھ کر زیر لب مسکرا دیا۔ شانو کی ساری شوخی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ اور سارہ معصومیت حسن اور پاکیزگی کا مرقع۔ ضیا اس کے بے خبر سونے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی لمحے اسے بے باکی سے دیکھتا رہا تھا۔

اور

پھر بے طرح اداس بھی ہو گیا تھا. کاش بچپن کے بندھن کا اس بے وفا لڑکی نے احساس کیا ہوتا. ان دیکھے شاہد کے خیال ہی سے ضیا کو سینے میں جلن محسوس ہونے لگی، ناصر اور سارہ کی آمد ضیا کے لئے الجھنوں کا جال بن گئی تھی. ایک بجے تک ماموں کے پاس بیٹھے رہنے اور زمانے بھر کی باتیں کرنے کے بعد جب وہ اپنے بستر میں لیٹا. تو اس کی آنکھیں سوچوں کا لہراتا بل کھاتا طوفان لئے تھیں.

وہ اتنا جذباتی بھی ہو سکتا ہے ؛ اس بات سے اسے الجھن ہو رہی تھی، اپنے آپ پر غصہ بھی آ رہا تھا.

سوچیں سوچوں سے ملتی لمبی لمبی زنجیریں بنتی گئیں اور پھر اپنی زنجیروں کے ایک حلقے میں اسے ایک مانوس چہرہ نظر آنے لگا.

یہ چہرہ
شہلا کے سوا اور کسی کا نہ تھا.

گھبرا کر اس نے سر کو جھٹکے دیئے. کروٹ بدلی. اور تکیہ میں منہ چھپا کر اس چہرے سے منہ چھپانے کی کوشش کی.

اسے تسلیم کرنا پڑا. کہ وہ واقعی جذباتی ہے. ناپختہ ذہن اور جانے کیا کیا !

دو دن ہوتے ہی کیا ہیں.

پلک جھپکتے ہی گذر گئے. باپ بیٹا نے سب عزیزوں رشتہ داروں سے ملنا تھا کسی ہاں گھنٹہ کسی کے دو اور کسی کے ہاں صرف کھڑے کھڑے ہی گئے. ضیا رحمان چچا کی گاڑی لے آیا تھا. جانے مہمانوں کی سہولت کا خیال پیش نظر تھا. یا ان کی محبت میں وقت گذارنے کا. ماموں کی محبت اور خلوص سے تو وہ واقعی بڑا متاثر اور مرعوب ہوا تھا

رات کھانے کے بعد دوسری رات بھی وہ ساڑھے بارہ بجے تک ان کے پاس بیٹھا رہا تھا. رابعہ بیگم بھی تھیں. نئی پرانی ہزاروں باتیں ہوئی تھیں. ضیا سے انہوں نے کھل کر باتیں کی تھیں. اس کے مستقبل کی حال کی اور ماضی کی بھی.

" نوکری ضرور ہی کرنا ہے " انہوں نے قہوہ پیتے ہوئے ماں بیٹے سے پوچھا تھا.

" تو اور کیا کرے گا " رابعہ بیگم بولی تھیں. ضیا تو جیسے ان کا سوال ہی نہ سمجھ پایا تھا.

"کیوں میاں " انہوں نے براہ راست ضیا سے پوچھا.

" جی " وہ پھر بھی کچھ نہیں سمجھا.

" نئے سرے سے پھر پڑھنا شروع کرو گے. اور پھر امتحان کا جنجال."

"اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے "

" ہے تو "

"کیا"

"میرے پاس چلے آؤ۔"

"جی۔"

ضیا حیرانگی سے ان کا منہ تکنے لگا اور رابعہ بیگم کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمک اٹھا

"بھئی" نوکری ضروری تھوڑا ہی ہے۔ پیسہ ہی کمانا ہے۔ بزنس کرو۔"

"میں اور بزنس۔"

"کوئی ہرج ہے کیا؟"

"جی۔"

ضیا بیٹے تم میرے پاس آجاؤ۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ اتنا بڑا کاروبار سنبھالنا مشکل ہے
تم میرے پارٹنر بن سکتے ہو۔"

ضیا چپ ہوگیا۔ رابعہ بیگم کچھ نہ بولیں۔"

"سوچ لو کیوں رابعہ۔"

ناصر نے کام کی نوعیت سرسری طور پر ضیا کو سمجھائی "تم پڑھے لکھے اور سمجھدار آدمی ہو
اور پھر اپنا خون ہو۔ جتنی دردمندی اور ایمانداری سے تم کام کروگے کوئی دوسرا نہیں
کرسکتا۔"

یہ بات تو ہے" رابعہ بیگم بولیں اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگیں" بزنس کا اسے کچھ
تجربہ ہے نہ علم۔ ایسا نہ ہو۔ فائدے کی بجائے اُلٹا نقصان ہی اٹھاؤ۔"

ایسی کوئی بات نہیں رابعہ بیگم۔ ان پڑھ لوگ بڑے بڑے بزنس چلا رہے ہیں۔ ضیا تو
ماشاء اللہ پڑھا لکھا اور خاصہ ذہین ہے۔"

ضیا تذبذب کے عالم میں تھا۔

مجبور نہیں کرتا بیٹے۔ تمہیں دیکھ کر خیال آگیا تھا۔ ویسے مجھے ایک اسسٹنٹ کی ضرورت

تو رہی ہے۔ تم سوچ لینا۔ اچھی طرح غور کرنا۔ دل مانا تو آجانا۔ نہیں تو خیر کوئی اور بندوبست ہو ہی
جائے گا۔"

اور رابعہ بیگم کے منہ سے ایک منٹ کے توقف کے بغیر جانے کس جذبے کے تحت
نکل گیا "آپ سارہ کی شادی کریں گے تو شاہد بازو بن ہی جائے گا۔"

ناصر نے خفت سے سر جھکایا اور پھر پھیکی سی مسکراہٹ سے رابعہ بیگم کو دیکھتے ہوئے
بولا" وہ بات ختم ہوچکی۔"

"کیا۔؟" رابعہ بیگم فرطِ جذبات سے گھٹ جانے والی آواز میں جیسے چیخیں۔

ضیا نے بھی نگاہیں ناصر کے چہرے پر۔ پچھتاوہ نہیں تھا۔ ہاں لگتا تھا۔ ضیا اور
رابعہ بیگم سے شرمندہ ضرور ہے۔

رابعہ بیگم تجسس سے ناصر کا منہ تکنے لگی۔ لیکن زبان سے کچھ نہ بولیں۔ ناصر نے خود ہی
رک رک کر آہستہ آہستہ شاہد کے کردار کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

رابعہ بیگم کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمک اٹھا۔ ناصر کے اندازِ بیان سے امیدوں
کے نئے سرے پھوٹ رہے تھے۔

ضیا کچھ نہیں بولا۔

"اللہ کا شکر ہے بروقت پتہ چل گیا۔ ورنہ ہم تو ڈوب ہی جاتے۔ زوبی ہی کی ہمت
کا نتیجہ ہے یہ سب۔ ورنہ سارا تو بچی تھی۔ ناپختہ ذہن اور جذباتی۔ یہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے۔
بہرحال۔ خدا نے بچا ہی لیا۔"

"واقعی" رابعہ بیگم کانوں پر ہاتھ رکھتے بولیں "اللہ نے بچا لیا۔"

پھر کتنی ہی دیر باتیں ہوتی رہیں۔

ضیا بہت کم بولا۔ رابعہ بیگم اور ناصر ہی ایک دوسرے کو اپنی سناتے رہے، سنتے رہے۔
ضیا کی سوچیں اور الجھ گئی تھیں۔ ماموں کی ذات سے جو عقیدت اور پیار اس کے دل

یں موجزن تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے متزلزل ہو گیا۔ ماموں کا آنا اور سارا کو ساتھ لانا
پھندہ بنانے کے مترادف لگ رہا تھا۔ ماموں اپنی غرض کا بندہ تھا۔ یہاں غرض پو
کرنے آیا تھا۔

لیکن

ضیا نے عہد کر لیا۔ کہ ماں یا ماموں کسی کے بھی دباؤ میں آ کر وہ سارہ سے ٹو
ناطے کی تجدید نہیں کرے گا۔ سارہ اسے بری نہیں لگی تھی۔ بلکہ وہ معترف تھا کہ لڑکی
ہے۔ اسے دیکھ کر پچھلی ساری رنجشیں بھلا دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی شاہد کے سا
رومان پرور دوستی کا قصہ جان لینے کے باوجود بھی اس پر کوئی فقرہ کسنے، اس کے کردار کا
داغ اجاگر کرنے کی کوشش ہی مضحکہ خیز لگتی ہے۔

پھر بھی۔

ضیا کی زخم خوردہ انا کی تلملاہٹ اسے ایسے ہیجانی فیصلے کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔
ماموں کی طرح وہ سارہ کی طرف سے بھی متوقع رہا۔ کہ یہ لڑکی جس مشن پر آئی ہے۔
اس سلسلے میں التفات و نوازش کا کوئی نہ کوئی وار ضرور کرے گی۔ اس وار کا جواب
دینے کے لیے وہ ہمہ وقت تیار تھا۔

پوری بے دردی سے۔

پوری وحشیانہ سفاکی سے۔

لیکن

اس بات کا موقع ہی نہ آیا۔ سارہ اسے دیکھ کر شرم و حیا سے سرخ ہوئی نہ کسی ساختہ ادا کا
مظاہرہ کیا۔ بالکل نارمل نارمل رہی۔ شانو سے بے تکلفی سے پیش آئی۔ خوش ہو کر ملی۔ یہی وطیرہ
اس کا رابعہ بیگم اور ضیا کے ساتھ رہا۔

ضیا کے ہاتھ کوشش کے باوجود کوئی نقطہ بھی تو ایسا نہ لگا۔ جسے بڑھا پھیلا کر کوئی

واضح شکل دی جا سکتی۔

جس سہ پہر ان لوگوں کی روانگی تھی۔ وہ خاص طور پر سارہ کے پاس بیٹھا رہا۔ سارہ شانو
کمرے میں تھی۔ اس کی کتابیں میز پر پڑی تھیں۔ جنہیں وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ شانو
کالج کے مزے مزے کے قصے اسے سنا رہی تھی۔ اور وہ معصوم سی مسکراہٹوں کے دیپ
جا رہی تھی۔ یہ دیپ لپک لپک کر ضیا کا دامن دل پکڑ رہے تھے۔

سارا نے ہلکے رنگ کا موسم کی مناسبت سے بڑا خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ کوئی
زیب تن تھا۔ نہ کسی میک اپ سے چہرہ آلودہ تھا۔ پھر بھی وہ بڑی تلاطم خیز موج تھی۔

"آپ صرف دو دن کے لیے آئی ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا دو ہفتے قیام کرتیں۔ میں آپ کو اپنی
ی دوستوں سے ملاتی۔" شانو نے بڑے پیار سے اسے دیکھا۔

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی ضیا زہرخند سے بولا۔ "یہ عنایت کیا کم ہے کہ دو دن
لیے بھی آ گئیں۔ برسوں بعد عزیزوں کی یاد بھی آئی تو غنیمت ہے۔"

جانے طنز کو سارا نے محسوس ہی نہیں کیا یا فراخدلی سے برداشت کر گئی۔ مسکراتے
ے بولی۔ "یہی گلہ آپ سے بھی تو کیا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ کبھی نہ آئے۔ تو آپ سب
ہمیں کون سا یاد کیا۔ اور کراچی کے چکروں پہ چکر لگاتے رہے۔"

"ہم شاید اس قابل ہی نہ تھے۔" ضیا نے بالکل آہستگی سے کہا۔ جسے شاید شانو بھی نہ
سکی۔

سارہ کے گالوں پر ایک لمحہ کو سرخی آئی۔ اور پھر وہ معمول کے مطابق مسکراتے ہوئے
نو سے بولی۔ "اب تو کراچی آؤ گی نا۔"

"نہیں۔" شانو کی جگہ ضیا نے جواب دیا۔

"کیوں۔" شانو اور سارہ نے بیک وقت کہا۔

"بس۔" ضیا بولا۔

سارہ مسکرانے لگی اور شانو آنکھیں گھماتے ہوئے مسکرائی۔ "اب تو ضرور جائیں گے ہم کراچی۔"

"اگلے ماہ ہی آنا ہوگا۔" سارہ مسکرائی۔

"کیوں۔" شانو مسکرائی۔

"زوبی آپا کی پانچویں سالگرہ شادی خانہ آبادی کی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اپنے ابو کی نہیں کہتیں۔" شانو نے اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ مارا۔

"جو بھی سمجھ لو۔ ویسے زوبی آپا بہت بڑا فنکشن کرتی ہیں۔" سارا بولی۔

"زوبی آپا تمہیں اچھی لگتی ہیں۔" شانو نے اچانک سارہ سے پوچھا۔

"جو اچھا ہو وہ سب کو اچھا لگتا ہے، شانو بی۔" سارہ نے شانو کی ٹھوڑی چھو کر کہا۔ نہ جانے کیوں لگا، کہ اس کا یہ تخاطب شانو سے نہیں خود ضیا سے تھا۔

"ضروری نہیں۔" ضیا نے مسکرا کر کہا۔ "بعض اوقات اچھا ہونے کے باوجود بھی انسان سب کو اچھا نہیں لگتا۔ کوئی نہ کوئی اسے قابل تمسخر اور نفرت سمجھتا رہتا ہے۔"

"یہ خاصا الجھا ہوا مسئلہ ہے۔ جس پر گھنٹوں بحث کی جا سکتی ہے۔" سارا کتاب اٹھاتے ہوئے ضیا سے مخاطب تھی۔ "ہم ابھی جا رہے ہیں، جناب بحث کا وقت نہیں ہے کبھی کراچی آیئے گا۔ تو گھنٹوں چھوڑ دنوں بحث ہوگی۔"

"میں کراچی نہیں آؤں گا۔" ضیا نے تلخی سے کہا۔

اور سارہ ہنس کر بولی۔ "اللہ کرے آپ کو جاب ہی کراچی میں ملے۔ کیوں شانو پھر تو آ کر [illegible] گے نا۔"

"بھئی میں اپنی ذمہ دار ہوں۔ امی جب بھی آئیں۔ ان کے ساتھ ضرور آؤں گی۔"

"مجھے دلی خوشی ہوگی۔ تو تو مجھے بہت ہی اچھی لگی ہے۔"

پیار سے سارہ نے شانو کے گال کو انگلیوں سے چھوا۔

"اور میرے بھیا؟" ایکدم شانو نے پوچھا۔ ضیا قدرے بوکھلایا۔

"ایک دم سڑیل سے ہیں۔" سارہ نے ہنس کر کہا۔ "لڑاکا سے لگتے ہیں۔ کیوں ضیا صاحب غلط ریڈنگ تو نہیں میری۔"

"بالکل غلط۔" شانو بولی۔ "میرے بھیا تو اتنے اچھے ہیں۔ اتنے اچھے، کہ دنیا میں اور کوئی ان سا ہے ہی نہیں۔"

"ہر بہن کو اپنا بھائی ایسا ہی لگتا ہوگا۔ شانو بی۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہمارا بھائی کوئی ہے ہی نہیں۔"

ضیا جھنجھلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد بھی جھنجھلاہٹ اس کے اعصاب پر سوار رہی۔ اس نے راتوں جاگ کر سارہ کے جذبات کا تجزیہ کیا۔ اس کی ایک ایک حرکت کا آپریشن کیا۔ ایک ایک بات کو کھنگالا۔ ایک ایک ادا کو پرکھا۔

لیکن

تعلق کی وہ ڈوری جو وہ لاشعوری طور پر ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کا سرا اسے کہیں سے نہ مل سکا۔ سارا نے تو کسی بات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کسی پچھلی بات پر پچھتائی نہ تھی۔ نفرت یا شرمندگی۔ اپنے رویے سے کسی بات کا اظہار نہیں کیا تھا۔

وہ تو بس نارمل نارمل آئی تھی۔

اور

ویسے ہی چلی گئی۔

سب سے مل کر بے طرح خوش ہوئی تھی۔ اپنائیت کے بھرپور احساس سے مغلوب تھی۔ خون کے رشتوں کی مہک سونگھ کر سرشار تھی۔

اس خوشی سرشاری اور کیف کا اظہار اس نے شانو، رابعہ اور ضیا سے کھل کر کیا۔

ضیا شاید اپنے آپ کو ماں اور شانو سے الگ رکھ کر کسی التفات کا بھی متوقع تھا لیکن
اس کا کوئی موقع سارا نے نہیں دیا۔

اور

جب وہ چلی گئی۔ تو ضیا اس کی شخصیت کا جادو کئی دن اپنی ذات پر مسلط محسوس
کرتا رہا۔ وہ اس کے متعلق صبح و شام سوچتا رہتا۔

کیا سارا واقعی اتنی معصوم ہے۔ کہ جنس اس کے لیے کوئی خاص مفہوم ہی نہیں رکھتی۔
یا وہ اتنی گہری ہے کہ شاہد سے چھٹ جانے کے باوجود اس کا اثر ابھی اس کے دل و دماغ
پر اتنا ہو۔ کہ وہ کسی اور کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھی ہو۔

یہ بھی

وہ بھی

وہ بھی

یہ بھی

ضیا کے دل و دماغ میں کئی دن دلائل اور انکی تردید کا چکر چلتا رہا۔

جیسے دنیا کی ساری روشنیاں
حسین چیزوں کی شگفتہ مسکراہٹیں
مہ وشوں کی اداؤں کے جلوے
پھولوں کی کشیدہ مہک
رنگ و نور کا سیلاب
خوشیوں کے چمکتے چہرے

اور

امیدوں کے جگمگاتے روپ
ایک نقطے میں سمٹ آئے ہوں۔

نقطہ!

جو جگہ نہیں گھیرتا، حجم نہیں رکھتا۔ وزن نہیں ہوتا۔

جو

بے نشان سا ہوتا ہے، انتہائی معمولی ۔ بالکل بے اثر
لیکن
جس کی افادیت سے انکار نہیں

جس کی اہمیت جھٹلائی نہیں جا سکتی۔

جس کے وجود سے ہی خطوط پھوٹتے ہیں۔ جو مرکز ہیں۔ جس سے دائیں بائیں اوپر نیچے سمتیں کھینچی جا سکتی ہیں۔

جو کچھ ہیں

کہیں

سب کچھ ہے۔

خطوط کا خالق ہے۔ لکیروں کا منبع ہے۔ سمتوں کا مرکز ہے۔

حیات کا محور ہے۔

یہ نقطہ ضیا نے دیکھا، اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اس سے جا ٹکرایا۔

وہ آج ہی پنڈی آیا تھا۔ اپنے کسی کام کے لیے نہیں۔ اپنے عزیز اور مخلص دوست سعید کے حکم کی تکمیل کے سلسلے میں۔

تین دن پہلے اسے سعید کا خط ملا تھا۔ اس کا خط کبھی کبھار ہی آتا تھا لیکن ہوتا ہمیشہ ہی خاص الخاص۔ اس کی تحریر دیکھتے ہی ضیا نے شانی سے کہا تھا۔

"خط سعید کا ہے اور دیکھ لینا بڑا ہی اہم ہوگا۔"

"ضروری ہے کیا؟"

"بالکل۔ وہ خط جب بھی لکھتا ہے، ضرورت کے تحت لکھتا ہے۔"

اور شانی ہنس پڑی تھی، شرارت سے بولی۔

"بھیا ہو سکتا ہے۔ ان کا کہیں سیر و تفریح کا پروگرام ہو۔ اور حسب معمول آپ کو بھی بلا بھیجا ہے۔"

"ممکن ہے۔"

ضیا نے مسکراتے ہوئے لفافہ چاک کیا تھا۔

لیکن

خط پڑھتے پڑھتے خاصا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اس نے خط ختم کیا۔

"کیا لکھا ہے بھیا؟" شانو منتظر کھڑی تھی۔

"آصف کی شادی ہے۔" مریل سی آواز اس کے منہ سے نکلی تھی۔

"آصف کی؟" شانو گڑبڑا گئی۔

"ہاں ہاں آصف کی۔ سعید کی چھوٹی بہن کی۔" ضیا نے تلخی سے کہا۔ اور پھر خط اٹھا کر اندر چلا گیا۔ اس نے شانو کی "کب؟" کا جواب بھی نہ دیا۔

سعید کا پنڈی میں کچھ کام تھا، عدیم الفرصتی کی بنا پر خود نہ آ سکتا تھا۔ اس لیے کام کی نوعیت اور لین دین کی پوری تفصیل ضیا کو لکھ کر بھیج دی تھی۔ خط ملتے ہی پنڈی جا کر کام نپٹانے کی استدعا حکم نما تھی۔

شادی میں صرف نو دن تھے۔ کام نپٹا کر اسے فوراً کراچی پہنچنے کا بھی لکھا تھا۔ بہن کی شادی میں ضیا بھائی کی شمولیت بہت ضروری تھی۔ شانو اور اس کی امی کو بھی بلایا تھا۔ لیکن جس انداز میں ضیا کو دعوت دی تھی۔ وہ ایک بھائی کا محبت بھرا حکم بھی تھا۔ جس سے سرتابی گستاخی کے مترادف سمجھی جا سکتی تھی۔

شادی میں شمولیت ضروری تھی یا غیر ضروری۔

یہ تو بعد کی باتیں تھیں۔

اس وقت تو ضیا کے ذہن میں صرف یہی جملہ کلبلا رہا تھا۔ کہ بہن کی شادی میں شرکت کتنی ضروری قرار دی گئی تھی۔

ضیا کے ذہن میں مری کے چند خوبصورت اور دلآویز شب و روز گھوم گئے۔ آصف کی دلفریب مسکراہٹیں، حیا بار ادائیں اور پُر معنی باتیں۔

وہ بستر پر آڑا لیٹا ٹانگیں لٹکائے ذہن کے پردے پر جیسے متحرک فلم دیکھ رہا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ اسی طرح لیٹا رہا۔

"ضیا۔" امی کی آواز صحن سے آئی۔

وہ اس آواز پر اپنی دنیا میں لوٹ آیا۔ خط میز پر رکھتے ہوئے اٹھا۔ انگلیاں بالوں میں ڈال کر انہیں سلجھاتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا۔ "یہ لڑکیاں بھی عجیب و غریب شے ہوتی ہیں۔"

"ضیا" امی نے دوبارہ پکارا۔

تو

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا صحن میں آگیا۔

امی کو بازار سے کچھ چیزیں منگوانا تھیں۔

"ساری چیزیں اکٹھی منگوائیں۔ بھائی جان نے کراچی جانا ہے۔" شانو اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑے کھڑے بولی۔

"کراچی" امی نے سر گھما کر اسے اور پھر ضیا کو دیکھا۔

"سعید کا خط آیا ہے امی۔ اس کی بہن کی شادی ہے۔ ہم سب کو بلایا ہے۔ مجھے دو دن پہلے ہی پہنچنے کا لکھا ہے۔ اس سے پہلے پنڈی کچھ کام کے سلسلہ میں جانے کا بھی لکھا ہے۔"

اس نے پوری تفصیل امی کو بتا دی۔

ضیا کو کراچی بھجوانے کا کئی بار انہوں نے سوچا تھا۔ لیکن ضیا نے کچھ ایسی ضد وہاں نہ جانے کی پکڑی تھی کہ امی دباؤ ڈالنا چاہتی بھی تو نہ ڈال سکتی تھیں۔

لیکن

اب

آصفہ کی شادی کے سلسلہ میں تو ضیا جائے گا ضرور۔ سعید سے اس کی دوستی ڈھکی چھپی تو نہ تھی۔ وہ انکار کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکتا تھا۔ اور اگر کچھ حیل و حجت کرنے کی

کوشش بھی کرتا۔ تو امی ایسی صورت اس پر زبردستی بھی کر سکتی تھیں۔

امی خوش نظر آنے لگیں۔

"کب ہے شادی۔"

"پانچ کو۔"

"تھوڑے ہی دن رہ گئے۔"

"جی ہاں۔ نو دن ہیں۔"

"دو چار دن پہلے تو جانا ہی ہوگا تمہیں۔ کام کاج میں دوست کی مدد نہ کرو گے۔"

"دیکھوں گا۔ پہلے پنڈی سے تو ہو آؤں۔ آپ یا شانو بھی جائیں گی شادی میں شرکت کے لئے——؟"

"ہمارا جانا کچھ ایسا ضروری تو نہیں۔ لیکن تمہیں تو جانا پڑے گا۔"

"جی——"

ضیا نے کچھ اس طرح سر جھکا کر کہا، جیسے شکست مان لی ہو۔

پانچ کو شادی تھی، پنڈی کا کام نپٹا کر دو کو کراچی پہنچنے کا فیصلہ کر کے ضیا نے سعید کو اطلاع دے دی۔

امی اپنی جگہ خوش تھیں۔ ضیا کے کراچی جانے سے سارا کا معاملہ پھر سے اٹھنے کی انہیں توی امید تھی۔

سارہ کی قربت کی لگن ضیا کے دل کے کسی چھپے گوشے میں موجود ضرور تھی۔ وہ تو اس کی اپنی ہٹ تھی۔ جو اس لگن کو سختی سے دبائے چلا جا رہا تھا۔ اپنی انا کی حرمت کا معاملہ جو تھا۔

لیکن

اب کراچی جانا ضروری ہو گیا تھا۔ دل۔ دل ہی دل میں شاداں تھا۔

یوں وہ سعید کے کام کے لیے پنڈی آیا تھا۔ اس کے ارشاد کی تعمیل میں انٹرکون میں قیام پذیر تھا۔

تین گھنٹے کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ ہوٹل آیا تھا۔ کھانا کھا کر آرام کرنے کی غرض سے لیٹا تھا کہ نیند نے آ لیا۔ کئی گھنٹے بے خبر سویا۔ جب اٹھا تو شام پوری پوری اتر آئی تھی۔ روشنیوں سے ہوٹل جگمگا رہا تھا۔ گہما گہمی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ہال میں کوئی ڈنر پارٹی تھی۔ سجے بنے لوگ شرکت کے لیے آنا شروع ہو گئے تھے۔

اسے اب کام کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی اٹھا۔ جلدی جلدی تیار ہوا۔ دو ایک دوست پنڈی میں تھے۔ انہیں ملنے کا پروگرام بنا کر کمرے سے باہر نکلا۔

اس کی نظر سامنے والے دروازے پر پڑی۔ اک نقطہ، اک چمکیلی کرن، ایک دودھیا روشنی دیکھی وہ دروازہ کھول کر اندر جا رہی تھی۔

یہی وہ نقطہ تھا۔ جس کی جانب ضیا مقناطیسی انداز میں کھنچا۔

"شہلا" وہ فرطِ انبساط سے گھٹی آواز میں چیخا اور دوسرے لمحے وہ اس کے کمرے کے اندر تھا۔

سفید بے داغ فرنچ شیفون کی میکسی سے بھری ساڑھی میں وہ کوئی آفاقی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی سڈول گردن کو ہلکا سا خم دے کر پلٹ کر دیکھا۔ اس کا گداز اور خوبصورت جسم ایک لمحہ کو تھرتھرا گیا۔

"شہلا" ضیا نے دونوں بازو بے اختیار ہو کر پھیلا دیئے۔ وہ انتہائی جذباتی ہو رہا تھا۔ آواز گھٹ رہی تھی۔ دل کانپ رہا تھا۔ سارا وجود کبھی یخ اور کبھی آتش کدہ بن رہا تھا۔ ان ہونی ہو جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

شہلا اسے اچانک اور ایکا ایکی مل جائے گی۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اب تو وہ اسے ڈھونڈ کر تھک ہار چکا تھا۔ تلاش پر سکتے کی کیفیت چھا چکی تھی۔ اور اس حسین و جمیل

خاتون کا خیال مایوسانہ دھند کی کیفیت میں آ چکا تھا۔

"شہلا" خاتون کے کسی جوابی التفات کو نہ پا کر اس کی آواز جو گھٹن کا شکار تھی۔ پھٹ سی گئی۔ اس حیران و پریشان خاتون کے ڈھلانی کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ بیتابی سے اسے جھنجھوڑا۔ اپنے حلق میں اسے قطرہ قطرہ آنسو ٹپکتے محسوس ہوئے۔ ان کی نمکین تلخی کو محسوس کرتے ہوئے وہ بے تابو ہوتے ہوئے بولا "شہلا۔ آپ کہاں گم ہو گئی تھیں"

"معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں" خاتون نے انجان بننے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھیں سچائی کی غماز تھیں۔

"جھوٹ مت بولیے" ضیا کو جانے کیا ہو رہا تھا۔

"آپ کون ہیں؟" خاتون نے اپنے دلی جذبات کا آئینہ دھندلانے کی کوشش کی۔

"آپ کا سایہ" ضیا نے اس کی گردن میں بازو حمائل کر دیئے۔

"شاید ہم کہیں ملے ہیں" خاتون پرسکون انداز میں بولی "مجھے یاد کرنے دو"

خاتون نے اپنی لمبی لمبی انگلیاں ماتھے پر پھیریں۔ اور الجھے سانس بحال کرتے ہوئے مسکرائی۔

"میں نہیں مانتا" "آپ مجھے بھول چکی ہیں" ضیا ضدی بچے کی طرح بولا۔

"میں بھول جانے کی بیماری میں مبتلا ہوں" وہ مسکرائی۔

"یہی سہی۔ آپ بھول جانا یاد رکھتی ہیں اور میں یاد رکھنا نہیں بھولتا۔ کہیں تو اپنا تعارف پھر سے کرا دوں، شاید بھولی بسری یادداشت لوٹ آئی" ضیا نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیار سے اس پر جھکتے ہوئے۔

خاتون تذبذب کے عالم میں تھی۔

"میری آنکھوں میں جھانکیے ذرا ـــ آپ کا یوں بننا مجھے کتنا آزار دے رہا ہے۔ اتنا نہ بنیے کہ بناوٹ بھی خندہ زن ہونے لگے" ضیا نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں اس کا

خوبصورت چہرہ مضبوطی سے پکڑے پکڑے کہا۔

" ضیا۔" خاتون کی آواز گھٹن کا شکار ہوگئی۔ لمحہ بھر پہلے اس کے حسین چہرے پہ جو زردیلی دھوپ جیسی مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ غائب ہوگئی۔ کالی کالی بدلیوں نے ایکا ایکی بلہ بول کر جیسے آفتاب کی ساری روشنی چھین لی۔

"ضیا۔" خاتون نے اپنا چہرہ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے آنسوؤں سے تر آواز میں کہا۔

دوسرے لمحے وہ ضیا کی چوڑی چھاتی میں چہرہ گھسائے سسکیاں بھر رہی تھی "ضیا۔ تم پھر کہاں سے آگئے۔ کیوں آگئے۔ کیوں آگئے۔ ضیا۔ تم پھر کہاں آگئے۔"

ضیا کچھ نہیں بولا۔ اس نے اپنے قوی بازوؤں کے حصار میں خاتون کو لیتے ہوئے اپنے ہونٹ اسکے بالوں پر رکھدیئے۔

وقت کی اس حسین اور غیر متوقع نوازش پہ ضیا کی جذباتی حالت عجیب و غریب سی تھی۔ سمجھ نہ پا رہا تھا کہ خوشی رقت بن رہی ہے۔ یا تبسم۔ دل گداز، گداز تھا۔ کیف و سرور بھی تھا۔ درد کی لذت بھی تھی۔ جدائی کے سارے دکھ ملن کی ساری خوشیاں گھل مل کر لذت و درد کا دھارا بن گئی تھیں۔

مما کے ہاتھ میں تین چار کاغذ تھے۔ یہ مہمانوں کی طویل و عریض فہرست تھی۔ آصف کی شادی کے کارڈ ان مہمانوں کو بھجوانا ابھی باقی تھے۔ وہ اس وقت بیرونی برآمدے میں سفید خوبصورت کرسی پر بیٹھی تھیں۔ میز پر کارڈ رکھے تھے۔ ایک طرف آج کا تازہ اخبار تھا۔ اور کافی کی خوبصورت پیالی بھی دائیں ہاتھ پڑی تھی۔

بہت سے کارڈوں پر وہ نام و پتے لکھ چکی تھیں۔ لیکن ابھی بہت سے باقی تھے۔ وہ فہرست ایک طرف رکھ کر اخبار دیکھنے لگیں۔

"ہیلو آنٹی۔" برآمدے میں آتے ہوئے سارا نے بڑے پیار سے کہا۔

"سارا بیٹی۔" مما نے اخبار ایک طرف ڈال کر بازو اس کی طرف پھیلا دیا۔

سارا قریب آئی تعظیم سے جھکی۔ مما نے بازو کے گھیرے میں اسے لیتے ہوئے اس کی جھکی ہوئی پیشانی پر شفقت سے بوسہ دیا۔

"کیا حال ہے آنٹی۔" پنک ہلکے پھلکے لباس میں سارا بیحد پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے کندھوں تک کٹے بالکل سیدھے لیکن سیاہ بال اس کے چہرے رنگ اور مناسبت سے انتہائی خوبصورت لگ رہی تھی۔

"تم کہو کیسی ہو۔"

"بالکل ٹھیک۔"

"پنجاب کا دورہ کیسا رہا؟"

"بہت اچھا۔"

"بہت سے عزیزوں سے ملی ہوگی۔"

"تقریباً سبھی سے۔ ڈیڈی کے سبھی عزیز لاہور میں ہیں۔ امی کے بھائی اور بھاوجیں بھی وہاں تھیں آنٹی۔ بڑا ہی مزا آیا۔ مجھے تو افسوس ہے۔ صرف دو دن ہی کے لیے گئی تھی۔"

"خون کے رشتے بڑے عزیز ہوتے ہیں سارہ بیٹی۔"

"جی آنٹی۔"

"بیٹھو آنٹی — آجاؤ ادھر۔"

"نہیں آنٹی — میں آصفہ سے ملوں گی۔"

"وہ تو اپنے کمرے میں ہے۔"

"مجھے پتہ ہے۔ آپ کو سلام کرنے پہلے ادھر آگئی تھی۔"

"جیتی رہو۔"

مما نے بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"آنٹی کوئی کام ہو تو بتا دیجیے گا۔ میں ان دنوں بالکل فارغ ہوں۔"

مما شفقت سے مسکرائیں۔ پھر کارڈوں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ "ایک کام ہے تو۔"

"بتائیے نا — میں کردوں گی۔"

"یہ کارڈ ہیں۔ نام پتے لکھنے ہیں۔"

"میں لکھ دوں —؟"

"لکھ دو تو میرا بہت سا وقت بچ جائیگا۔ ویسے بھی لکھتے لکھتے میرے تو اب ہاتھ دکھنے لگے ہیں۔"

"لائیے — مجھے دیدیں۔"

مما نے مسکرا کر سارا کو دیکھا۔ "تم تو آصفہ سے گپ شپ لگانے آئی ہوگی۔"

"کوئی بات نہیں آنٹی۔ اس کے پاس ہی بیٹھ کر لکھ دیتی ہوں۔ یہ بھی کوئی بڑا کام ہے۔"

اس نے کارڈ لینے کو ہاتھ بڑھایا۔

مما نے فہرست اٹھائی جہاں تک لکھ چکی تھیں۔ پن اٹھا کر وہاں نشان لگا دیا۔ پھر صفحے الٹے پلٹے۔

"یہاں سے شروع کرنا ہے۔" انہوں نے سارا سے کہا۔ اور پھر سارا کو نام و پتے جس طرف لکھنے تھے۔ بتاتے ہوئے کارڈ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"ضروری نہیں آج ہی سارے لکھ ڈالو۔ سارا بیٹی۔ جتنے آسانی سے لکھ سکتی ہو لکھ دینا۔ باقی میں لکھ لوں گی۔ یا فوزیہ آجائے تو اس کے سپرد کر دوں گی۔"

سارا نے کارڈ اور فہرست لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "واہ آنٹی۔ یہ بھی کوئی بڑا کام ہے۔ جو فوزیہ باجی کے لیے رکھا جائے۔ میں گھنٹہ بھر میں سارے کارڈ لکھ لونگی۔"

"جیتی رہو۔" مما نے اسکی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "مجھے مارکیٹ بھی جانا ہے۔ اچھا ہوا جو تم آگئیں۔"

"زوبی آپا بھی پوچھ رہی تھیں۔ کوئی کام ہو تو بتا دیں۔"

"شکریہ بیٹی — بس کام تو نپٹا ہی لیے ہیں۔ یہی باقی تھا۔ سعد بیچارہ تو دن رات ایک کئے ہے۔ پاپا بھی لگے ہوئے ہیں۔ توبہ — بڑا کام ہوتا ہے شادی کا بھی۔"

"حالانکہ دعوت ہوٹل میں ہوگی۔"

"ہاں پھر بھی — اپنے عزیز تو کچھ دن گھر پر ہی ٹھہریں گے۔"

"کچھ مہمان ہمارے ہاں بھیج دیجیے گا۔"

مما مسکرانے لگی۔ مہمانوں کو ٹھہرانے کا بندوبست ہو چکا تھا۔ کچھ مہمان اپنے ہاں ہی رہنے والے تھے۔ کچھ ریزرو قسم کے مہمانوں کے لیے ہوٹل مہران اور انٹرکون میں جگہیں مختص کروائی

جا چکی ہیں۔"

سارہ کارڈ اور فہرست لے کر پلٹی۔ خوبصورت پیکر والی سارا کے سراپا کو دیکھتے ہوئے ان کے دل میں سعید کا خیال آ گیا۔ سعید کے لیے انہیں ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی۔

ایک بار پہلے بھی ان کے دل میں یہ خواہش ابھری تھی۔ انہوں نے سعید کا عندیہ بھی لیا تھا۔ لیکن آصفہ نے بتایا تھا۔ کہ سارا کی بات کہیں اور چل رہی ہے۔ وہ چپ ہو گئی تھیں۔

سارا کی عادات انہیں بہت پسند تھیں۔ سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ ہر وقت شاداب چہرے پر ملائم سی مسکراہٹ کی شفق بکھری رہتی۔ دل میں منٹوں میں گھر کر لینے والا انداز تکلم اور من موہ لینے والی عادات تھیں۔

وہ جب تک گرل لگے جالی دار برآمدے کا موڑ مڑ نہ گئی۔ مما اسے پیار سے دیکھتی رہیں۔

آصفہ اپنے کمرے ہی میں تھی۔ اور درزی سے آئے ہوئے مختلف لباس میز صوفے اور بیڈ پر بکھیرے وہ انکی جانچ پڑتال میں مصروف تھی۔

خاصہ بڑا کمرہ تھا۔ فرنیچر اور دیگر آرائشی چیزیں پرآسائش تھیں۔ ہلکے نیلے اور گہرے نیلے رنگ کا امتزاج تھا۔ جو نکھرے نکھرے دن کی روشنی میں بڑا دیدہ زیب لگ رہا تھا۔

لیکن کمرے کی کوئی چیز ایسی اس وقت اپنی اصلی جگہ پر نہ تھی۔ کہیں تہہ در تہہ قمیضیں رکھی تھیں۔ کہیں فلیپر ہینگروں میں لٹک رہے تھے۔ کہیں ساڑھیاں الجھی پڑی تھیں۔ اور کہیں فٹنگ ناپسند ہونے پر غصے سے پھینکے ہوئے ٹراؤزر، میکسیاں اور بلاؤز پڑے تھے۔

"اللہ یہ سب کیا ہے" سارا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اوہ — سارہ — تم — کب آئیں —" آصفہ فیروزی شیفون کی بادامی ساڑھی بیڈ پر پھینکتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔

"ابھی — ابھی — سوچا آپ کیلئے کوئی کام ہی کروں۔"

"اوہ — شکریہ۔"

"یہی آپ کا ہاتھ بٹانے آئی ہوں۔ زوبی آپا نے بھی پوچھا ہے۔ کوئی کام ہو۔ تو بتا دیں۔"

"کام تو بہت ہیں۔"

"فرمایئے۔"

"یہ کیا اٹھا رکھا ہے۔"

"کام۔"

سارہ ہنس پڑی۔ اور مسکراتے ہوئے دعوت نامے اسے دکھائے۔ "سب سے بڑا کام تو میں کر رہی ہوں۔"

"یعنی۔"

"سب کو دعوت نامے میں لکھنے لگی ہوں۔"

"شادی کے کارڈ ہیں — یعنی میرے۔"

"تو اور کیا میرے —"

"تم کو گول ہی کر گئیں۔"

"اچھا ہی ہوا۔"

"اب کیا ارادے ہیں۔"

"بھئی بیٹھنے کو تو کہو۔ پھر ارادے کا بھی پوچھ لینا۔ کب سے آئی کھڑی ہوں۔"

"کوئی جگہ نظر آتی ہے تو بیٹھ جاؤ۔"

"یہ کیا مینا بازار لگا رکھا ہے آپ نے۔"

"دیکھ لو۔"

"سارے کپڑے ڈھیر کر رکھے ہیں۔"

"فٹنگ دیکھ رہی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"کہاں۔ بہت سے کپڑے پھر سے درزی کو دینے ہیں۔ کم بخت نے ستیاناس مار دیا۔"

دونوں اونچے درجے کے درزیوں کا شکوہ کرنے لگیں۔ نام اونچے پکوان پھیکے والی بات ان لوگوں پر صحیح اترتی تھی۔

سارا نے کارڈ اور فہرست برآمد ہونے کے بعد صوفے پر پڑے کپڑے تہہ کئے۔ بکھرا الجھی سلجھی ساڑھیاں آصفہ سے مل کر تہہ کیں۔ فیبر والے ہینگر یکجا کئے۔ تھوڑی دیر بعد بیٹھنے کے لیے اس نے کافی اچھی جگہ بنا لی تھی۔

"اب آپ کافی بنوا کر لائیے۔" سارا نے قلم پکڑتے ہوئے کہا۔ "میں اپنا کام کر دوں گی۔"

آصفہ مسکرانے لگی۔

کافی کے لیے اس نے ملازم سے کہا۔ اور پھر دونوں کام میں مشغول ہو گئیں۔ باتوں کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

سارہ اور آصفہ کی واقفیت تو کالج کے زمانے سے تھی۔ لیکن جب سے زوبی ماسے ملی تھیں۔ یہ واقفیت دوستی کا روپ اختیار کر گئی تھی۔ شاہد کا قصہ نہ چلتا تو اب تک سارا اس گھر کی دلہن منتخب ہو چکی ہوتی۔

باتوں باتوں میں شاہد اور سوہنا کا ذکر بھی آ گیا۔ سارا کی خوبصورت پیشانی پر ہلکی سی شکنیں ابھریں۔ پھر وہ بڑے سکون سے بولی: "وہ دونوں بہت ذلیل تھے۔"

"واقعی۔۔۔ تم نے بالکل ختم کر دی بات۔"

"کچھ باقی رکھنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔"

اور

پھر

آصفہ کے استفسار پر وہ اپنی ساری رام کہانی اسے سنانے لگی۔

آصفہ نے شوخی سے سارا کو دیکھا اور چھیڑتے ہوئے بولی۔ "تو میدان خالی ہے نا۔"

سارہ کچھ سمجھی نا کچھ نا سمجھی۔

"اعتراض تو نہ ہو گا کوئی۔" آصفہ نے اس کی تھوڑی کو پیار سے چھوا۔

"کس بات کا۔" وہ مسکرائی۔

"اگر ہم لوگ تمہارے لیے دستِ سوال پھیلا دیں تو۔" آصفہ نے شوخی سے کہا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ سر جھکائے ہوئے پھر سے کارڈوں پر پتے لکھنے لگی۔

قدرے توقف کے بعد آصفہ نے پھر چھیڑا۔ تو وہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ "آصفہ۔۔۔ میرا تو مرد ذات سے سچ پوچھو تو اعتماد ہی اٹھ گیا ہے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں نے کتنا زبردست دھچکہ کھایا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن اب۔"

"میں نے مستقبل کا کچھ نہیں سوچا۔ اور نہ ہی سوچنا چاہوں گی۔"

"بری بات۔"

"سچ کہتی ہوں آصفہ۔ پتہ نہیں کیوں؟ اب تو مجھے نہ کوئی اچھا لگتا ہے نہ برا۔ سب مرد ایک سے لگتے ہیں۔"

"ہم زندگی میں بہت سے تجربات کرتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ زندگی تجربات کا دوسرا نام ہے۔ زندگی جمود کا نام نہیں مسلسل بہتے لگاتار چلنے اور کبھی نہ رکنے کے عمل کا نام ہے۔"

آصفہ کچھ اداس سی ہو گئی۔ "ہم جو چاہتے ہیں وہ اکثر نہیں ہوتا۔ اور جو نہیں چاہتے وہ عام طور پر ہو جاتا ہے۔ کوئی بڑا ہی خوش قسمت ہو گا۔ جس نے چاہا ہو گا اور پایا بھی ہو گا۔"

سارہ پن کا سرا ہونٹوں پر رکھ کر اداس ہوتی آصفہ کو قدرے حیرانی سے دیکھنے لگی۔ آصفہ دکھ سے مسکرائی۔

سارہ کی آنکھوں میں اداسیاں گھلنے لگیں۔ آصفہ کو اداس دیکھ کر اس نے جان لیا تھا کہ پرسکون سطح تلے تلاطم موجزن ہے۔

اس نے بڑے پیار اور محبت سے آصف کو کریدا۔ تو آصف مسکرانے لگی۔ نمناک آنکھوں سے سارہ کو دیکھتے ہوئے بولی: "کوئی خاص بات نہیں سارہ۔ ویسے بعض جذبے اظہار بے نام سے ہوتے ہیں۔ ان کی نشاندہی کسی طور نہیں کیجا سکتی۔ لیکن ہوتے بڑے جاندار ہیں۔ ظالم۔ بھرپور اور سچے"

سارہ ہنس سے بھیلتے ہوئے کچھ پوچھنے کو تھی کہ ملازم کافی۔ بسکٹ اور کچھ موسمی پھل ٹرالی میں رکھے آگیا۔

سلسلہ گفت وگو منقطع ہوگیا۔

ادھورا

ناتمام

اور نامکمل سلسلہ گفت وگو۔

پھر بھی دونوں نے ایک دوسرے کو بہت کچھ بتا دیا۔

سارہ کو آصف سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی۔

اور

آصف کو سارہ پر بے طرح پیار آنے لگا۔

دنیا میں سب ایسے ہی چلتا ہے۔ کوئی کسی کے لیے جیتا ہے نہ مرتا ہے۔ سب کچھ لگے بندھے اصولوں کے تابع ہے۔ ہوتا رہتا ہے۔ چلتا رہتا ہے۔

کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی فضا کو خوابناک بنا رہی تھی۔ ہوٹل کا پر تکلف اور آراستہ کمرہ اس روشنی میں بہت پر اسرار لگ رہا تھا۔ بیڈ کے تکیے کے قریب دونوں تکیے اوپر تلے رکھے خاتون ٹیک لگا کے لیٹی تھی۔ اس کا نرشاہوار نرم وگداز جسم شب خوابی کے لباس میں پر کشش نظر آرہا تھا۔ اس کے بال کندھوں سے چھوچھو کر بکھر رہے تھے۔ اور وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے پاؤں کو ہلکی ہلکی جنبش دے رہی تھی۔ اس کے پاؤں بے انتہا خوبصورت تھے۔ سنہری سڈول اور نرم نرم پاؤں کی اضطرابی حرکت بھی جذبات انگیز تھی۔ خاتون سگریٹ کے کش ہولے ہولے لے رہی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں میں جرنیلا پن بھی تھا۔ اور جما دینے والی ٹھنڈک بھی۔ کبھی وہ بے طرح اداس لگنے لگتی۔ اور کبھی خوشبوؤں کے عکس اس کی آنکھوں میں لہرانے لگتے۔

ضیا بیڈ کے آخری سرے کے قریب گدے دار کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھوں میں والہانہ پن تھا۔ اس نے دونوں پاؤں بیڈ کے سرے پر اوپر تلے ٹکا رکھے تھے۔ کئی سگریٹ پھونک چکا تھا۔ اس وقت وہ خارجی دنیا سے یکسر کٹ چکا تھا۔ اپنی ذات کے دائرے میں گھوم رہا تھا۔ اپنی خوش بختی پر نازاں تھا۔ شہلا کو پا کر وہ سب کو جیسے فراموش ہی کر چکا تھا۔ خود فراموشی کی لذت بھی تو کوئی کم نہیں ہوتی۔

اس وقت اسے سارہ یاد تھی اور نہ کوئی اور لڑکی۔ سب شہلا کے فسوں خیز حسن کے ریلے میں حقیر تنکے کی طرح بہہ گئے تھے۔ شہلا نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی تھی۔ اس وقت

وہ صرف اسی روشنی کا احساس کر رہا تھا۔ اسے کوئی چہرہ کوئی شبیہہ کوئی خاکہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔
شبلا ہی روشنی تھی شبلا ہی حرارت۔

ضیا کے انگ انگ سے پیار کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ کیف و سرور کی منزلیں تھیں۔ چاروں اور نشے کی پھوار پڑ رہی تھی۔

وہ مدہوش ہوا جا رہا تھا۔

دنیا حسین ہے۔

اور

زندگی اتنی رنگین

وہ حسن و محبت کے سحر میں ڈوبا جا رہا تھا۔

خاتون نے دھیرے سے جسم کو جنبش دی۔ کروٹ کے بل ہوتے ہوئے سگریٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھی ایش ٹرے میں ڈال دیا۔

"کتنی حیران کن بات ہے۔" وہ ضیا کو دیکھ کر مسکرائی۔

"مجھے تو اب تک یقین نہیں آیا۔" ضیا نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ کر بولا۔ "کہ قسمت اتنی مہربان بھی ہو سکتی ہے۔"

"اتفاق ہی کی بات ہے۔"

"میرے جذبوں کی سچی لگن ہے یہ۔ اتفاق نہیں۔"

"تو کیا واقعی۔ تم سنجیدگی سے مجھے پانے کی آرزو کرتے رہے۔"

"آپ نے مجھے بہت دکھ دیئے شبلا۔ کاش آپ مجھے اچانک چھوڑ کر روپوش نہ ہو جاتیں۔"
"بہت دکھ ہوا تھا۔"

"آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ دکھ درد کے جو جوار میں نے سہے ہیں۔"

خاتون نے بھرپور نظروں سے ضیا کو دیکھا۔ ضیا پوری سچائی سے اپنے جذبات کا اظہار

اداسی شبلا کی آنکھوں میں گھلنے لگی۔

"تو تم۔ مجھ سے پیار کرنے لگے ہو۔"

"میں اقرار کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میری پرخلوص جستجو نے آپ کو پھر سے پا لیا۔ میرے جذبۂ دل نے آپ کو پھر سے ڈھونڈ لیا۔ میرے جذبات مسرت کا انداز آپ کر سکتی ہیں۔"

"اوہ ضیا۔" خاتون نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی۔

ضیا نے پہلو بدلا اور خاتون کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔

"میں آپ کو گم ہو جانے نہیں دوں گا۔"

وہ ہنس پڑی۔ یہ ہنسی بڑی غمناک تھی۔ "کھو جانا میرا اصول ہے۔"

"یہ اصول اب ٹوٹ جائیگا۔ میں کوئی ایسا اصول برداشت نہیں کروں گا۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور کئی لمحے چپ رہنے کے بعد بولی۔ "ہاں۔ واقعی۔"

ضیا اس سحر خیز چہرے کو دیکھتا رہا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں اور بھرپور نظروں سے ضیا کو دیکھتے ہوئے مسکرائی پھر سینے میں اٹھی بیٹھی ہاتھوں کو آپس میں الجھا کر اس نے ایک جذبات انگیز انگڑائی لی اور بولی "تم نے میرے سارے اصول توڑ ڈالے۔"

ضیا کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔

"ہاں ضیا۔ تم نے میرے سارے اصول توڑ ڈالے۔ تم پہلے آدمی ہو۔ جو اجنبیوں کی بھیڑ میں گم ہو کر ایک بار نہیں دوسری بار میری راہ میں آن کھڑے ہوئے ہو۔"

"اب صرف راہ میں کھڑا ہی نہیں ہوں گا۔" ضیا نے سگریٹ کی راکھ جھٹکی سے جھاڑتے ہوئے مسرور لہجے میں کہا۔ "اب راستے کی دیوار بنوں گا۔ آپ کو فرار نہیں ہونے دوں گا۔"

شبلا نے ایک گہری سانس لی۔ ہاتھ بڑھا کر سگریٹ اور لائیٹر اٹھایا۔ سگریٹ سلگا کر لائیٹر واپس پھینکتے ہوئے دکھ سے بولی۔ "میں نہیں جانتی کہ کیا ہو گا۔ میں تو بمشکل تمہیں بھلا پائی تھی۔"

"واقعی بھوا چکی تھیں مجھے۔"

"کوشش کی تھی۔"

"کامیاب ہوئیں؟"

خاتون نے بے دھڑک نفی میں گردن کو خفیف سی جنبش دی۔

ضیا بے تابانہ خوشی سے سرشار ہو کر کرسی سے اٹھا۔ دوسرے لمحے وہ خاتون کے قریب بیڈ کے سرے پر بیٹھا والہانہ پن سے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ رہا تھا۔

"نہیں ضیا۔" خاتون نے بڑی شائستگی سے اس کے بازوؤں کے حلقے سے اپنا وجود آزاد کرا لیا۔

ضیا کے کچھ کہنے سے پہلے وہ بیڈ سے اتر کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ سگریٹ کے کئی کش عالمِ اضطراب میں لیے۔

ضیا اسے کھلی کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

وہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ سنجیدہ، اداس اور دکھی۔ ضیا فرطِ جذبات سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ وہ اس کے قریب آئی، مسکرائی اور کہنے لگی۔ "ضیا۔ ایک بات پوچھوں۔ پوری ایمان داری سے جواب دینا۔"

ضیا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "پوچھیے۔"

وہ قدرے پرے ہٹ گئی۔ پلکیں جھپکا جھپکا کر ضیا کو دیکھتی رہی۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم میری تلاش میں سرگرداں رہے۔ مجھے پانے کی آرزو کرتے رہے۔ میرے خیال کو اپنے ذہن سے الگ نہ کر سکے۔؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"کیا مطلب؟"

"کیا تمہیں میرے وجود کی خواہش تھی۔؟"

ضیا کچھ جواب نہ دے سکا۔ وہ اس کے قریب آئی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ "میرے سوال کا جواب دو ضیا۔"

"میں سوال ہی نہیں سمجھا۔" وہ انتہائی سادگی سے بولا۔

"سوال اتنا مشکل اور غیر مبہم تو نہیں۔ خیر۔" اس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا، ضیا اس کا منہ تکنے لگا۔

آنکھوں کو بڑے حسین انداز میں نیم وا کرتے ہوئے وہ بولی۔ "کیا جنسی کشش تھی جس نے تمہیں مجھ سے غافل نہ ہونے دیا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟" ضیا اٹھ کر اس کے بالمقابل کھڑے ہوتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"جہاں تک تمہاری عمر کا سوال ہے۔ یہی بات صحیح لگتی ہے۔" اس نے قدرے رُخ موڑ کر آہستگی سے کہا۔ "پیاسے کے ہونٹوں سے پانی لگا کر چھین لیا جائے۔ تو اس کی پیاس اور بھڑک اٹھتی ہے۔"

"شہلا۔" ضیا نے اسے کندھے سے پکڑ کر آہستگی سے اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

وہ دکھ سے مسکرائی۔ لیکن ضیا سنجیدہ تھا۔ اس کے دلی اضطراب کا اظہار شدتِ کرب سے چھلکتی نگاہوں سے ہو رہا تھا۔

"کھلونا خوبصورت ہو تو ہر ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے۔ اور خاص کر جب خوبصورتی کے ساتھ وہ ارزاں بھی ہو۔" شہلا نے ذومعنی انداز میں بات کی۔

"آپ زیادتی کر رہی ہیں۔" ضیا گہری کپکپا دینے والی سانس لیتے ہوئے بولا۔

"تو کیا واقعی تم میرے عشق میں مبتلا ہو۔" وہ ہنس پڑی۔

"شہلا۔" ضیا نے اپنے قدموں پر گھوم کر اس کی طرف سے قدرے منہ پھیر لیا۔ "میں خود نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ آپ مجھ سے زیادہ تجربہ رکھتی ہیں۔ اور اسی تجربے کی بنا پر شاید یہ کہنے میں حق بجانب بھی ہیں کہ میری عمر کے تقاضے جنسی کشش تک ہی محدود ہیں۔ لیکن۔"

وہ چند لمحے رکا، پھر ایکا ایکی پلٹ کر دونوں ہاتھ شہلا کے کندھوں پر رکھتے ہوئے بولا۔
"لیکن شہلا۔ آپ کے لیے میرے سینے میں جنسی کشش کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ بہت کچھ۔ مجھے آپ سے پیار ہے۔ آپ کی ذات سے آپ کی شخصیت سے آپ کے وجود سے۔"

"ضیا۔" وہ مغلوب سی آواز میں بولی۔

"آپ کے دکھ سے آپ کی خوشی سے۔ آپ کے زخموں سے آپ کے غموں سے مجھے سب سے پیار ہے۔" ضیا بے ساختہ کہے گیا۔

وہ بڑی متاثر ہوئی۔ اور کشادہ آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے ایک ٹک اسے تکنے لگی۔

"محبت واقعی جنس سے ہٹ کر کوئی الگ ہی شے ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"مجھے تمہاری محبت کا یقین ہے۔"

"شہلا۔" وہ بے اختیار سا ہو گیا۔

"تم میرے لیے صرف ایک مرد ہی نہیں ہو۔" وہ جیسے زیر لب بڑبڑائی۔ "جس سے صرف جسمانی آسودگی حاصل کرنا ہی مقصود ہے۔ تم میرے لیے روشنی ہو، اجالا ہو۔ نور ہو۔"

وہ اس سے قدرے پرے ہٹ گئی۔

ضیا کا سینہ فرط جذبات سے پھٹنے لگا۔

"تم نے مجھے روشنی دکھائی ہے۔ میری تاریک راہوں کو منور کیا ہے۔ ضیا کیا تم یقین کر لو گے کہ تم سے ملنے کے بعد میں کسی اجنبی مرد کے قریب تک نہیں گئی۔"

"شہلا۔" ضیا خوشی سے لبالب پیمانے کی طرح چھلک گیا۔

"اگر یقین کر لو تو یہ میری محبت کا سب سے بڑا ثبوت ہو گا۔" وہ دکھی لہجے میں بولی۔

"مجھے پورا پورا یقین ہے شہلا۔" ضیا ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بند کرتے اور کھولتے ہوئے بیتابی سے بولا۔

شہلا مسکرانے لگی۔ اور آہستہ آہستہ اس کی اپنی گرفت سے نکل آئی۔

"وعدہ کریں شہلا۔"

"کس بات کا۔"

"کبھی نہ بچھڑنے کا۔"

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے ضیا کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ ضیا کا انداز مجنونانہ تھا۔ وہ اسے دیکھنے کے بجائے جھلسے لہجے میں گھور رہا تھا۔

"اچھا۔ ضیا۔" شہلا نے اس کے انداز سے مرعوب ہو کر کہا۔ "ابھی میں نے یہاں تین دن رہنا ہے۔ کل باتیں ہوں گی۔ اب تم جاؤ اپنے کمرے میں۔ پتہ ہے ایک بج چکا ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"ایسی بداعتمادی اچھی نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اب جا کر سو جاؤ۔ تین دنوں میں ہم سوچ کے بہت سے مرحلے طے کر سکتے ہیں۔"

ضیا کسی طور اپنے کمرے میں جانے کو تیار نہ تھا۔ اسے دھڑکا تھا کہ شہلا پھر اسے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اس دھڑکے اور خوف کا اس نے برملا اظہار بھی کیا تھا۔

"تمہاری قسم۔ کہیں نہیں جاؤں گی۔ یقین کرو ضیا۔ اس قسم کا مجھے پاس رہے گا۔"

وہ بددلی سے اپنے کمرے میں آ گیا، خاتون کا ہاتھ زور سے دبا کر اس نے وعدے کو نبھانے کا اس نے احساس دلایا تھا۔

دروازہ بند کرکے وہ بیڈ پر آن گری۔ آج ضیا سے ڈرامائی طور پر ملاقات اس کی زندگی کا بہت بڑا حادثہ تھی۔ وہ اس وقت سخت پریشان تھی۔ کئی سوال اس کے سامنے تھے۔ کئی الجھاؤ تھے، کئی مسائل تھے۔

وہ ان سب کے متعلق یکسوئی سے سوچنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔ ہر نقطے کو پرکھ کر اسے پیدا ہونے والے نتائج کے لیے اپنے ذہن کو ہموار کرنا چاہتی تھی۔

وہ سوچتی رہی۔

کمرے میں ٹہل ٹہل کر، بستر میں بیقراری سے کروٹیں بدل بدل کر۔ سگریٹ پھونک پھونک کر، آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھ دیکھ کر۔ اپنے من میں جھانک جھانک کر۔

ضیا اس کی زندگی کی پہلی اور آخری سچائی تھی۔ اس حقیقت سے اسے اب انکار تھا۔ یہ نوجوان پہلی بار ہی اس کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ دوسری ملاقات میں وہ اسے جنسی آسودگی کے لیے گھیر گھار کر لائی تھی۔ لیکن یہ ملاقات ہمیشگی کی خواہش بن کر اس کے دل و دماغ سے چمٹ گئی تھی۔ یہ خوبصورت نوجوان اس کی روح کے تاروں کو چھیڑ گیا تھا۔ اس کی باتیں دلنشین تھیں۔ اس کی قربت جذبات انگیز تھی۔ اس کی شخصیت سحر انگیز تھی۔

اسے اعتراف تھا کہ وہ اک عیاش عورت ہے۔ یہ عیاشی اس کی ازدواجی زندگی میں زبردست محرومی کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو ایسا کرنے پر مجبور پاتی تھی۔ وہ ساحل کی

متلاشی ڈگمگ ڈولتی کشتی تھی۔ ضیا اسے ملا۔ اس نے جنس کی تسکین چاہی۔ لیکن وہ اسے تسکین کے ساتھ اس کی روح کی تسکین کے سامان بھی کر گیا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اب تک وہ اس کی تلاش میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ وہ ہی منزل تھا۔ جس کے لیے دشوار گزار راہوں کی صعوبتیں وہ جھیلتی بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

ضیا نے اپنی دیوانہ محبت کا اظہار جس مجنونانہ انداز میں کیا تھا وہ مرعوب ہو گئی تھی۔ اس نے پورے خلوص سے اس کی محبت پر یقین کر لیا تھا۔ ضیا نے اس سے عمر بھر نبھا کا وعدہ لیا تھا۔ نہ بچھڑنے کی قسمیں دلائی تھیں۔ ہمیشہ ایک ہو جانے پر والہانہ اصرار کیا تھا۔

اب

اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔

اپنے شوہر سے اسے ہمدردی تھی نہ پیار۔ طلاق لینے کا بھی وہ حق رکھتی تھی۔ وجہ معقول تھی۔ پھر اسے اک غلط جگہ پر رکے رہنے پر کوئی مجبور بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ وہ ضیا کی خواہش پر اپنے آپ کو جھک جانے پر مجبور پا رہی تھی۔

پھر بھی

فیصلہ کر لینے کے باوجود اسے اطمینان نہ تھا۔ ضیا سے عمر میں کئی برس بڑی ہونا اسے کھل رہا تھا۔

رات ٹھٹک ٹھٹک کر گزرتی رہی۔

اور

وہ بیقراری سے اپنے فیصلے کے متعلق سوچتی رہی۔ کچھ دیر کو اسے اونگھ بھی آئی۔ لیکن عالم خواب میں بھی اس کی پریشانی نہ گئی۔ وہ کبھی خوش رنگ حسین اور سنہرے خواب دیکھتی رہی اور کبھی دل ہلا دینے والے انتہائی خوفناک سپنے نظر آتے۔

جاگ جانے پر بھی وہ متزلزل تھی۔ کبھی تو اپنے آپ کو حق بجانب کہتی، میں

کیوں لٹ جاؤں۔؟

برباد ہوتی رہوں۔؟

گناہ کی دلدلوں میں پھنستی رہوں۔؟

خوشی اور سکون کو ترستی رہوں۔؟

منزل چھو لینے کی ہمت ہو۔ پھر بھی منزل پانے کے لیے بھٹکتی رہوں؟

ضیا کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو تھام لینے کے لیے اس کے ذہن میں لاتعداد دلیلیں تھیں، وہ مطمئن ہو جانا چاہتی تھی، طلاق لے کر ضیا سے شادی کر لینے کی تمنا بڑی شدید ہو گئی تھی۔

لیکن

شادی!

وہ اس بے جوڑ شادی کے متعلق سوچ کر خود ہی خائف تھی۔ وہ ضیا سے عمر میں کئی سال بڑی تھی۔ شادی شدہ تھی۔ جبکہ ضیا کی زندگی میں آنے والی وہ پہلی عورت تھی۔

ضیا کی طرف سے وہ مطمئن تھی۔ ڈر تو اسے لوگوں کا تھا۔ جو انگلیاں اٹھائیں گے، طعن کریں گے۔ تمسخر اڑائیں گے۔ ضیا کا ذہن مسموم کر دیں گے۔ اور یوں عمروں کا تفاوت ایک بھیانک خطوط بنا کر ضیا اور اس کے درمیان حائل کر دیں گے۔

ذہنی کشمکش نے اسے نڈھال کر دیا۔ اس کا سر درد سے پھٹنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئیں۔ سگریٹ کے کڑوے کسیلے دھوئیں کی تلخی اس کے حلق میں اترنے لگی، اسکی زبان سوکھ گئی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔

ٹھنڈک کے باوجود اس نے کتنی بار پانی پیا۔ ہونٹوں کو تر کرنے کے لیے پانی میں رومال بھگو بھگو کر استعمال کیا۔ جلتی آنکھوں کی تپش ٹھنڈے اور گیلے رومال سے دور کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

کتنی ہی دیر وہ روتی بھی رہی۔

اپنی کتاب زندگی کے اوراق اس کی نظروں میں پھیل پھیل گئے۔ ایک ایک ورق اس نے غور سے دیکھا۔

اس کی زندگی کا آغاز معصومانہ تھا۔ لیکن حالات نے اسے تعفن کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ ذہنی آسودگی کی کوشش میں وہ گناہ پر گناہ کرتی گئی تھی۔

اس نے کئی اجنبیوں سے جنسی تعلق استوار کیا تھا۔ مذہب کی قید روا رکھی تھی نہ ملک کی۔ انگریز امریکن، جرمن فرنچ، ہندوستانی پاکستانی کئی چہرے اس کی نظروں میں گھوم گئے۔

احساس گناہ اب اس شدت سے ہوا کہ وہ درد کر وہ بے حال ہو گئی۔ یہ احساس کی دولت اسے ضیا سے ملی تھی۔

ضیا جو اجنبی تھا۔ لیکن پہلی ہی ملاقات میں اپنا لگا تھا۔ اور اب تو وہ اسے اپنے آپ پر مسلط محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس سے چھٹ کر اب واقعی سکون کی زندگی نہ گذار سکتی تھی۔

وہ اس کی محبت تھا۔

اس کی ضرورت تھا۔

وہ نہ تو محبت سے منہ موڑ سکتی تھی۔

اور

نہ ضرورت سے انحراف کر سکتی تھی۔

پھر!

پھر!

پھر اس نے آخری فیصلہ کر ہی لیا۔ چند دنوں بعد اسے حیدر آباد جانا تھا۔ اس نے ضیا کو بھی وہاں بلانے کا پروگرام مرتب کر لیا۔ آٹھ دس دن کے قیام میں وہ سوچ کے ہر بندھن سے آزاد ہو سکیں گے۔ ہر رکاوٹ پہ قابو پانے کا سکون اور آرام سے سامان کر سکیں گے۔

وہ مطمئن ہو کر بستر میں لیٹ گئی۔

صبح طلوع ہونے والی تھی۔ باہر اندھیروں کا غبار آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہا تھا۔ مشرقی افق پر نئی صبح طلوع ہونے والی تھی۔ اسی مشرقی افق کی طرح اب شہلا کا ذہن تھا۔ نئی صبح طلوع ہونے کے خوشگوار لمحے قریب تر تھے۔

وہ اٹھی۔ دھیرے سے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ اسے یقین تھا کہ ابھی ابھی ضیا آئے گا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اسکی طرح ضیا بھی رات بھر بے بیقرار و بے چین رہا ہو گا۔ اور جونہی صبح کے آثار نظر آئیں گے۔ وہ اس کے پاس تڑپ کر آ پہنچے گا۔

اس نے سگریٹ سلگایا۔

اور

بستر پر لیٹ کر سینے تک کمبل ڈال کر اطمینان سے سگریٹ کے کش لینے لگی۔ اس کی سوچ ایک نقطے پر آ کر پُرسکون ہو چکی تھی۔

سبز سبز پتوں سے بھری ٹہنیوں پہ گلابی اور لال پھولوں نے آگ لگا رکھی تھی۔ بے شمار ٹہنیاں تھیں۔ جو اک گوشے پر جھک آئی تھیں۔ نیچے لمبی لمبی گھاس تھی۔ سلیٹی رنگ کے چکنے چکنے پتھر تھے۔ اور سوندھی سوندھی خوشبو ملی لال لال مٹی تھی۔

فضا بڑی سہانی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوائیں رقص کناں تھیں۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں کہیں کہیں بادلوں کی سفیدی جھلک رہی تھی۔ اور غروب ہوتے سورج کی کرنوں کا عکس ان بادلوں کے گوشوں کو سنہری گوٹ کیطرح چمکا رہا تھا۔

کائنات پر جوبن چھایا تھا۔ زمین و آسمان نور کی زد میں تھے۔ روشنی پھوار کی طرح پڑ رہی تھی۔ نغموں کا ترنم ہولے ہولے فضا میں گھل رہا تھا۔ اور فضا کی رگوں سے موسیقی پگھل پگھل کر بہہ رہی تھی۔

جانے کس پہاڑی علاقے کا یہ پُر فضا مقام تھا۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ پھول ہی پھول تھے۔

پھولوں بھری کنج میں خاتون ایک بڑے سے پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے زانوں پہ سر رکھے ضیا چت پڑا تھا۔ خاتون نے بڑا ہی خوبصورت جگمگاتا ہوا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے حسین جسم کی تراش لباس کی چست فٹنگ سے پوری طرح تھی۔ اس کی سڈول گردن میں موتیوں کا دیدہ زیب ہار تھا۔ اس کے کانوں میں چمکیلے

موتی لرز رہے تھے۔ اس نے نفاست سے میک اَپ کیا ہوا تھا۔ اس میک اَپ کو اس کی گہری گہری سیاہ آنکھوں کی مسحور کن چمک اور بھرے بھرے جذباتی ہونٹوں کی کشش دلآویز بنا رہی تھی۔

ضیا حسن دزدیانش کے اس مرقع کی قربت سے مسحور تھا۔ وہ اپنی قسمت پہ نازاں تھا۔ خاتون کا ہاتھ اس نے اپنے سینے پہ رکھ کر دونوں ہاتھوں تلے دبا رکھا تھا۔

دونوں گردوپیش سے بے خبر تھے۔ وہ صرف میں کھوئے تھے۔ ضیا کو صرف اور صرف خاتون کی موجودگی کا احساس تھا۔

اور خاتون کو صرف ضیا کے وجود کا ہوش۔ نگاہیں شراب کے چھلکتے پیمانے تھیں۔ شراب بیخودی پی اور پلائی جا رہی تھی۔

”شہلا“ ضیا نے بڑے جذباتی لہجے میں پکارا۔

”ہوں“ وہ اس پر جھکی اور اس کے بالوں کی مہکتی لٹیں ضیا کے چہرے سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگیں۔

”اگر آپ مجھے نہ ملتیں۔ تو آپ کی قسم میں کبھی زندہ نہ رہتا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا دبا لیتا۔“

خاتون ہنس پڑی اور اس کی کھنکتی ہنسی کی گونج فضا میں کئی لمحے ڈولتی رہی۔

”میرے عشق کی انتہا آپ نہیں جانتیں۔“

”جانتی ہوں۔“

”نہیں۔“

”یقین کرو۔ ایسی بات نہ ہوتی تو میں اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا لیتی۔ اس بڈھے شوہر سے چھٹکارا پانا آسان تھوڑا ہی تھا۔ لیکن تمہاری خاطر میں ہر خطرے سے ٹکرا گئی۔“

”میں نے بھی امی کو کیسے رام کیا۔ آپ کیا جانیں۔“

”یہ سب تو ہو گیا۔ اب۔“

”اب کیا۔ بہت جلد ہم اپنی چھوٹی سی جنت آباد کریں گے۔“

”جب تک یہ جنت آباد نہیں ہوتی میرا ٹھکانہ کہاں ہو گا۔“

”آپ میری امی کے پاس رہیں گی۔ مجھے جب ملازمت ملے گی، میں آپ کو نئے گھر لے جاؤں گا۔“

”تمہاری امی مجھے قبول کر لیں گی۔“

”کیوں نہیں۔ میں نے ان کی اجازت حاصل کر لی ہے۔“

”یہ اجازت تم نے ہٹ دھرمی اور ضد سے حاصل کی ہے۔ ذہنی طور پہ وہ کبھی بھی مجھ جیسی عورت کو قبول نہ کریں گی۔“

”آپ اپنی تحقیر کیوں کرتی ہیں۔“

”اس لیے کہ میں جانتی ہوں۔ میرا ماضی صرف داغدار نہیں۔ گھناؤنا بھی ہے۔“

”لیکن اس گھناؤنے پن کا ذمہ دار تمہارا بے حس شوہر ہے۔ تمہارا کیا قصور۔“

”دنیا یہ تو نہیں دیکھتی۔“

”میں تو دیکھتا ہوں۔ جانتا ہوں۔ میں آپ کو کبھی مجرم قرار نہ دوں گا۔ کبھی گناہگار نہیں سمجھوں گا۔“

”ضیا تم عظیم ہو۔“

”اور آپ عظیم تر۔“

”تمہاری اس سوچ کے سہارے میں اک پاکیزہ اور نیک زندگی بسر کروں گی۔ یہ میری جلتی ہوئی آرزو تھی سلگتی ہوئی تمنا تھی۔ تم بہت عظیم ہو۔ تم نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔ مجھے روشن منزل پہ لے آئے۔ مجھے تباہی اور بربادی سے محفوظ کر لیا۔“

”اس لیے کہ۔ آپ میری زندگی ہیں۔ جان ہیں۔ روح ہیں۔“ ضیا نے بازو بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

اس کے سینے پر شہلا کا وجود کسی پتھر کی طرح گرتا محسوس ہوا۔ گھبرا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اس پتھر نما وجود کو ہٹانے کی کوشش کی۔

اور

چاروں طرف سے سرخ سرخ آندھی امڈنے لگی۔ فضائیں چیخیں بکھرنے لگیں۔ گلابی اور لال لال مہکتے دہکتے پھول زوردار ہواؤں سے ٹہنیوں سے جھڑنے لگے۔ شاخیں پتوں سے ننگی ہوگئیں۔ کائنات کا سینہ چاک ہوگیا۔ ہر طرف سے ماتمی صدائیں آنے لگیں۔ فضائیں خون و خاک کی لہر رچنے لگی۔

ضیا نے اپنی گردن پر انگلیوں کا دباؤ محسوس کیا۔ اس نے چیخنا چاہا۔ لیکن آواز حلق ہی میں پھنس گئی۔ ہاں اس کے کانوں میں چیختے چنگھاڑتے الفاظ اترنے لگے۔

جو پہلے شور و شرار کا ایک حصہ محسوس ہوتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ صاف اور غیر مبہم ہونے لگے۔ اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ یہ آواز اسکی امی کی تھی۔

"ذلیل۔ جذباتی کمینے۔ تو نے میرا سر جھکا دیا۔ تیری تربیت میں نے ایسی تو نہ کی تھی۔ اک بیاہتا عورت کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے تجھے عزت کا پاس رہا نہ غیرت کا"

امی بول رہی تھیں۔ فضائیں جیسے بادل ٹکرا ٹکرا گرج رہے تھے۔ طوفان چھٹ رہے تھے بجلیاں کڑک رہی تھیں۔

امی اس کی گردن پکڑے کھینچے گئیں۔ ضیا نے بمشکل ان کی گرفت سے آزاد ہو کر پلٹ کر دیکھا۔

لیکن

شہلا نظر نہ آئی۔ وہ دیوانہ وار واپس پلٹا۔ اس کنج میں آیا۔ جہاں وہ شہلا کے ساتھ عشق و محبت کے نغمے الاپ رہا تھا۔

وہ کنج اجڑ چکی تھی۔ بہاروں کا جوبن لٹ چکا تھا۔ گلوں کے سینے پھٹ گئے تھے

فضاؤں میں بین کی صدائیں تھیں۔ آندھیوں نے سب کچھ تہس نہس کر دیا تھا۔

"شہلا" اس نے زور سے آواز دی۔

اسے سسکیاں سنائی دیں۔ وہ اپنے پاؤں پر گھوم گیا۔ اس نے دیکھا شہلا کا لباس تار تار ہے۔ اس کے بال کھلے ہیں۔ اور ان میں خاک پڑی ہے۔

وہ بے اختیار ہو کر اس سے لپٹ جانے کو بڑھا۔ شہلا جانے کہاں غائب ہوگئی۔ اور مٹی کا قبر نما ڈھیر ابھر آیا۔

"شہلا" اس نے ڈھیر پر گرتے ہوئے ضیا نے دلدوز چیخ ماری۔

اور

پھر

اپنی ہی چیخ سے اسکی آنکھ کھل گئی۔

کئی لمحے وہ حواس باختہ سر تھامے بستر پر بیٹھا رہا۔ اسے سمجھ نہ آرہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔

جب وہ ہوش میں آیا۔ نیند کا غبار چھٹا اور حواس ماحول آشنا ہوئے تو وہ سر تا پا پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس عجیب و غریب خواب نے اسے حواس میں آنے کے بعد بھی حواس باختہ کیے رکھا۔

اس کا دل ہول کھا رہا تھا۔ اور اسے پختہ یقین ہو گیا تھا۔ کہ شہلا پہلے کی طرح آج بھی اسے چھوڑ کر جا چکی ہے۔ اور وہ ویران ہو کر رہ گیا ہے۔

اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اور اندرونی خوف پریشان کر رہا تھا۔

اس نے ہولے سے دروازہ بجایا۔

"آجاؤ" خاتون نے آہستگی سے کہا" دروازہ کھلا ہے"

ضیاء اندر داخل ہوا۔ خاتون کو دیکھا۔ اطمینان کی گہری سانس لیتے ہوئے بولا"شکر ہے"!

"کس بات کا" خاتون بستر میں قدرے اونچا ہوتے ہوئے بولی"

ضیاء نے مڑکر دروازہ لاک کیا۔ اور مسکراتے ہوئے بیڈ کے پاس آیا۔ ایک ٹک وہ خاتون کو تکنے گیا۔

"بیٹھو"۔ خاتون نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اس کے لئے جگہ بنا دی۔

"شکریہ" ضیاء پٹی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

مجھے پتہ تھا تم صبح ہونے کا انتظار نہیں کروگے" وہ ادائے دلربائی سے مسکرائی"اسی لئے میں نے دروازہ کھول دیا تھا۔

"یہ نیک شگون ہے" وہ خوشی سے بولا

"کیوں"

مجھے یقین تھا۔ کہ آپ"

"خفا ہو چکی ہونگی"

"ہاں"

"اب کیا سمجھے؟"

"اپنے لئے نیک فال"

"یقین آگیا مجھ پر"

"ہاں ویسے میں بہت پریشان تھا۔

ضیاء نے چند لفظوں میں رات دیکھا ہوا بھیانک خواب خاتون کو سنایا۔

وہ مسکرانے لگی۔

"یقین کریں۔ دروازہ بجاتے وقت میرا دل دھک دھک کر رہا تھا"

"وہم تھا نا۔ ورنہ ایسی بات تو نہ تھی۔ میں نے تم سے وعدہ کر رکھا تھا۔ یقین نہیں تھا نا میرے وعدہ پر"

"تھوڑا تھوڑا تھا۔ تھوڑا تھوڑا نہیں تھا"

ضیاء نے جس معصومیت سے کہا۔ خاتون کا جی چاہا اسے دل میں چھپالے۔ ضبط کا مظاہرہ کرنے کو وہ صرف خوش دلی سے ہنس دی۔

ضیاء نے خاتون کی طرف بڑے جذباتی انداز میں دیکھا اس کی سرخ اور متورم آنکھیں دیکھ کر بے چین ہوگیا۔

لگتا ہے آپ رات نیند نہیں کر سکیں" اس نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"ہاں" وہ سچائی سے بولی۔

"کیوں"

"سوچتی رہی"

"کیا"

"بہت کچھ"

"وہ کس کے متعلق"

"کچھ اپنے، کچھ تمہارے اور کچھ لوگوں کے بارے میں۔"

"پھر"

"پھر"

"کسی فیصلے پر پہنچیں یا نہیں۔"

خاتون نے ایک بے چین سی کروٹ لی۔ کمبل سینے تک کھینچا اور تکیے درست کرتے ہوئے سران پر ٹکا کر بولی "آنکھیں تو تمہاری بھی غماز ہیں۔ کہ چین سے سو نہیں سکے۔"

"میں بھی سوچتا رہا"

"میرے بارے میں"

"ہاں"

"کیا سوچا"

میری سوچ آپکی سوچ کی طرح منفی نہیں تھی۔ میں جو فیصلہ کر چکا ہوں اس پر سختی سے کاربند ہوں"

"ضیا۔"

"ہوں"

"اپنے فیصلے پر کبھی پچھتاؤ گے تو نہیں"

"وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

"جذباتی مت بنو"

میں سچ کہتا ہوں شہلا"

خاتون نے ایک بھرپور نگاہ ضیا پر ڈالی۔ وہ سچائی خلوص اور ہمدردی کا پیکر نظر آ رہا تھا۔

"شہلا۔ بعض اوقات ہم مدتوں سوچتے رہتے ہیں اور فیصلہ نہیں کر پاتے لیکن بعض دفعہ

ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ فیصلہ آپوں آپ ہو جاتا ہے اور ہم سوچتے ہیں۔ کہ فیصلہ ہو کیونکر گیا۔"

"یقیناً تم اپنی بات کہہ رہے ہو"

"ہاں"

"اگر کسی وقت تم اپنے فیصلے پر پچھتائے تو یاد رکھنا۔ شہلا دین کی رہے گی نہ دنیا کی۔"

میں کچھ نہیں کہنا چاہتا خاتون۔ وقت میرے مخلصانہ جذبات کا گواہ ہوگا۔"

وہ بڑی متاثر ہوئی۔ چند لمحے ضیا کے خوبصورت پیکر کو پیار سے دیکھتی رہی پھر مسکرائی اور آہستگی سے بولی۔

"ایک بات اور بھی ہے ضیا۔"

"وہ کونسی"

"میرا تجربہ ہے۔ کہ مرد جب تک محب ہوتا ہے۔ وہ عورت کی ہر خامی اور ہر کمزوری کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن جب محب سے شوہر بن جاتا ہے۔ تو آنکھیں ضرورت سے زیادہ ہی کھلی رکھنے لگتا ہے۔"

ضیا مسکراتے ہوئے بولا" شاید آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔"

"ضیا" وہ اداس ہو کر بولی" تم تو میرے کردار کی ہر خامی اور میری ہر کمزوری سے پوری طرح واقف ہو۔"

"یہ خامی اور کمزوری آپ کی مجبوری کا دوسرا نام تھی شہلا۔ میں آپ سے کہتا ہوں۔ کہ مجھے آپ کی ہر چیز سے بے پناہ پیار ہے۔ آپ کی مجبوری سے بھی اتنا ہی پیار ہے جتنا آپ کے وجود سے۔"

"اوہ ضیا" بے اختیار ہو کر خاتون نے اپنا نرم و گداز ہاتھ ضیا کی طرف بڑھایا۔ ضیا نے بڑی عقیدت اور بڑی محبت سے اس ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

یہ ضیا کا

اپنی محبت کا

اور

خاتون کی عظمت کا اقرار تھا۔

تین دن مہکتی دہکتی قربتوں کے امین تھے۔ دونوں ایک دوسرے میں کھو گئے۔ کبھی ہوٹل کا کمرہ ہی خلوت کدہ بنا اور کبھی پنڈی کے نواح کے کوئی پرسکون گوشے آباد ہوئے۔ شہر کی رونقوں میں بھی دونوں سنگ سنگ کھوئے رہے۔ کام کرنے کے لئے علیحدہ علیحدہ بھی۔ لیکن پھر جیسے ایک مرکز پر آپوں آپ آکر مل گئے۔ خاتون اب ضیا کو چھوڑ جانے کے متعلق سوچ سکی۔

نہ ہی ضیا کو ملتجیانہ انداز میں بار بار نہ چھوڑ جانے کی التجا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی دونوں نے حیدرآباد ملنے کا پلان بنایا۔ جب تلک ضیا بھی امی سے اجازت حاصل کر سکتا تھا۔ اور شہلا بھی شوہر سے علیحدگی کے لئے کوئی منصوبہ بنا سکتی تھی۔

دونوں تین دن اکٹھے رہ کر جب جدا ہوئے۔ تو بچھڑنے کا احساس نہیں تھا۔ امید اور یقین کے چراغ جل چکے تھے۔

دونوں نے مسرور انداز میں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ چھ تاریخ حیدرآباد کے معروف ہوٹل میں ملنے اور ہفتہ بھر قیام کا جو پلان بنا تھا۔ اس کی یاد دہانی ایک دوسرے کے ہاتھ شدت جذبات سے دبا کر کی گئی۔

ضیا خاتون کو ہوائی اڈے پر چھوڑنے گیا۔ اور اس وقت تک وہاں رہا۔ جس وقت تک اس کا جہاز فضا کی پہنائیوں میں گم نہ ہو گیا۔

اور جب وہ واپس آیا تو سرشار سرشار تھا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے قدرتی چشمے کی طرح پھوٹ رہی تھی۔

ضیا پر نہ ٹوٹنے والا خود فراموشی کا سحر چھایا تھا۔ وہ خارجی دنیا سے کٹ کر صرف اپنے آپ میں جی رہا تھا۔ اسے زمانے کی پرواہ تھی۔ نہ عزیزوں رشتہ داروں کی۔ امی کا خوف تھا نہ شانو کا ڈر۔ وہ صرف اپنے آپ تک محدود تھا۔ صرف ضیا تھا۔ جس کا اپنا آپ تھا۔ اپنا وجود تھا۔ اپنے جذبات تھے۔ اپنی خوشیاں تھیں اپنے دکھ تھے۔ اپنے غم تھے اپنی راحتیں تھیں

سعید کو پنڈی سے فون پر سارے کام کی اطلاع دے کر واپس آیا۔ سعید نے دو کو ضرور بضرور کراچی پہنچنے کی تاکید تھی۔

اور

اب تو کراچی جانا ضیا کے لئے زندگی کا اہم ترین فریضہ بھی ہو گیا تھا۔

امی کو جو لگن تھی وہ جانتا تھا۔

اپنی جو لگن تھی وہ بھی امی کو بتانا چاہتا تھا۔

اسی لئے کراچی جانے سے پہلے موقع کی تلاش میں رہا۔

اور

اس رات جب شانو کالج کا کام کرتے کرتے سو گئی تھی۔ امی ٹی وی پر کوئی ادبی مباحثہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس آ بیٹھا۔

مباحثہ ختم ہوتے ہی امی نے ٹی وی بند کر دیا۔

" شاید کوئی اچھا پروگرام ہو ۔" امی نے کہا۔

" بہت اچھا پروگرام ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے امی کے سامنے کرسی لیکر بیٹھ گیا۔

" کیا ۔ ؟ امی نے پوچھا۔

" صبح میں نے کراچی جانا ہے "

" مجھے پتہ ہے۔ تمہارے لئے بستر بنا دیا ہے۔ کپڑے تم خود رکھو گے۔ سارہ کے لئے کچھ چیزیں ہیں۔ ایک جوڑا آصفہ کے لئے بھی ہے۔"

وہ سب کچھ رکھ لوں گا۔ آپ کی نیک خواہشات کے ساتھ تحائف پہنچا بھی دونگا۔"

" بڑا احسان ہوگا " امی ہنس کر بولیں۔

" دیکھیں امی ۔ لیجانا میرا کام۔ اب کوئی آپ کی نیک خواہشات کو پذیرائی بخشے یا نہ۔ اس کا ذمہ دار میں نہیں، وہ مسکرایا۔

" کیا کیا۔ کیا" امی بھی مسکرا کر ذومعنی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

" سچ کہتا ہوں۔ آصفہ کی تو خیر اب شادی ہو رہی ہے۔ بیچاری لڑکی رکھ ہی لے گی تحفہ آپکی خواہشات کا احترام لازما کرے گی۔ لیکن ۔"

" لیکن کیا ۔"

" دوسری والی بات مشکوک ہی ہے "

" تو کہنا کیا چاہتا ہے "

" کہہ دوں "

" اسے ضرور کہہ دے۔ ڈر کس بات کا ہے تجھے ۔"

" دیکھیں امی۔ ناراض نہ ہوں۔ میں سنجیدہ ہوں۔ آپ بھی ٹھنڈے دل سے میری بات سنیئے۔

" ہوں "

" امی "

" کہو بھی کیا کہنا چاہتے ہو۔"

" امی۔ سارہ کے لئے آپ تحائف ضرور بھیجئے۔ کہ آپ کی بھتیجی ہے۔ لیکن ۔"

" لیکن کیا ! کیا چبا چبا کر باتیں کر رہا ہے تو ۔"

وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے کمرے میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ پھر ٹی وی کے پاس رکتے ہوئے بولا " امی سارہ سے جو اور امیدیں آپ نے پھر سے وابستہ کرلی ہیں نا۔ وہ دل سے نکال دیں ۔"

امی طنزیہ نظروں سے ضیا کو گھورنے لگیں۔

وہ مسکرایا اور امی کے قریب آکر ان کے سامنے دری پہ بیٹھتے ہوئے اُن کے گھٹنے پکڑ کر بولا " امی ۔ سارہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ یہ نہ سمجھیں کہ مجھے اس سے کوئی خدا واسطے کا بیر ہے۔ وہ خوبصورت ہے امیر ہے یہ ہے وہ ہے ۔ سب کچھ ہے۔"

امی ایک ٹک اسے تکنے لگیں۔

" لیکن امی" وہ آلتی پالتی مار کر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا " امی ۔ وہ مجھے بھائی کے روپ میں قبول کر سکتی ہے۔ کسی اور میں نہیں ۔" امی جیسے ٹھٹک گئیں۔ آگے کو جھکتے ہوئے ضیا کا کندھا ہلا کر بولیں " تجھے کس نے کہا "

" سارہ نے " وہ فوراً بولا ۔"

امی کو یقین نہ آیا۔ لیکن اس دو ٹوک جواب کے بعد کچھ کہہ نہ سکیں ضیا موقعہ پا کر خود ہی بولتا چلا گیا۔ سارہ کی بے حسی اور لاتعلقی کو خوب بڑھا چڑھا کر امی کا ذہن ہموار کرنے کی کوشش کی۔

وہ خاصا کامیاب رہا۔

"جبر اور سختی کا کونسا زمانہ ہے امی۔ ایک معمولی سی بات کے لئے دو زندگیاں برباد نہیں کی جاسکتیں۔ ہاں میں اس کا بھائی بننے کے لئے تیار ہوں۔ ایسی پیاری سی ایک اور بہن مل جائے تو اور کیا چاہیے مجھے۔ سارہ کا کوئی بھائی بھی تو نہیں۔ میں اسے بھائی کا پورا پیار دے سکتا ہوں۔ اور پھر۔ امی۔ ماموں جان کا بھی تو خیال کریں۔ ان کی عمر دیکھیں۔ کمزور بھی ہو رہے ہیں۔ ان کو دوڑ دھوپ کرنے کے لئے کسی ساتھی کی اشد ضرورت ہے مجھے تو ان پہ بہت ترس آتا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ان کا سانس الٹنے لگا تھا۔ میں ان کا بازو بن سکتا ہوں۔ سارہ کا بھائی اور ان کا بیٹا بن کر کاروبار میں ان کی مدد کر سکتا ہوں مجھے علم ہے۔ کہ ماموں کو میری اشد ضرورت ہے۔ انھیں مخلص آدمی کی ضرورت ہے جو ایمانداری سے ان کے ساتھ شریک کار ہو سکے۔ میں نے سوچا ہے ان کی پیش کش قبول کر لوں۔"

وہ باتیں کرتا رہا۔ نوکری ابھی ملی بھی نہ تھی۔ مل بھی جائے تو بزنس کا کیا مقابلہ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ پورا پورا اعتماد بھی تھا۔ اپنی ذہانت پہ انھیں خطوط پہ بولتا چلا گیا۔

ضیا نے ماموں کے حالات صحت اور عمر کے بارے میں کچھ اس انداز میں باتیں کیں۔ کہ رابعہ بیگم کا دل پگھل پگھل گیا۔

اور

جب ضیا نے کہا" ان کی مدد میں نے نہ کی۔ تو بعید نہیں کہ انکا لاکھوں کا کاروبار ان سے سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ اور ممانی کے اگلے پچھلوں یا سارہ کے طلبگاروں کی بن آئے۔ دولت کے لئے لوگ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ کن حدوں کو نہیں چھو سکتے۔"

رابعہ بیگم گھبرا کر بولیں" تو ٹھیک ہے۔ چلا جا ماموں کے پاس۔ کام ہی کرنا ہے نا نوکری نہ کی۔ وہاں کام کر لیا۔"

ضیا خوش ہو گیا۔ امی کو وہ دھیرے دھیرے اپنی لائن پہ لا رہا تھا۔

کتنی دیر ماں بیٹا پلان بناتے رہے۔ امی کو ناصر سے واقعی دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی سارہ کے لئے تو ضیا نے ان کا منہ بند کر دیا تھا۔ پھر بھی ضیا کے ماموں کے پاس جانے سے یہ امید بھی بر آسکتی تھی۔

رات کافی اتر آئی تھی۔ فضا میں خاموشی تیر رہی تھی۔ امی نے سونے کے خیال سے اٹھنا چاہا۔ تو ضیا نے امی کا گھٹنہ پھر سے پکڑ لیا۔

"اب کیا ہے"

"اصل بات جو کہنا تھی وہ تو کی ہی نہیں"

"اصل بات"

"ہاں امی"۔ بیٹھ جایئے ذرا اطمینان سے سنئے گا۔"

"ہوں"

"ایک مسئلہ حل کرنا ہے"

"مسئلہ"

"ہاں"

"کیا"

وہ چند لمحے سر جھکائے اپنی انگلیاں مسلتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ اور مستحکم آواز میں بولا" اگر کوئی نیکی کرنا چاہے۔"

وہ رک گیا

مسکرا کر بولیں" نیکی کرنا چاہیے تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے بیٹا۔ نیکی کر ڈالنا ہی چاہیے۔ اگر مگر کی تو گنجائش ہی نہ ہونی چاہیے۔"

"واقعی"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"

"نیکی کر ڈالنا چاہیے۔"

"بالکل"

"لیکن امی۔ بعض اوقات نیکی کر ڈالنے کی ہمت کو دوسرے لوگ پست بنا دیتے ہیں"

"جو ایسا کرتا ہے وہ خود پست ہے۔ نیکی ہر حال میں مستحسن ہے۔ اللہ تعالیٰ کو عزیز ہے اور کار ثواب ہے۔"

"ہوں"

لیکن تو کیوں پوچھ رہا ہے۔ تجھے نیکی کرنے سے میں نے کبھی روکا ہے۔ میری تربیت ایسی گھٹیا تو نہیں۔ میں نے تو یہ جذبہ روزِ اول سے تیری گھٹی میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔"

ضیا سر جھکائے بیٹھا امی کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے چاہا۔ کہ امی کو شہلا کے متعلق بتا دے۔ لیکن جانے کیوں ہمت نہ ہوئی۔ پھر بھی امی کا عندیہ تو لینا ہی تھا۔ شہلا کی پوری داستان فرضی دوست کے نام سے وابستہ کر کے امی کو سنا دی۔

وہ بیچارہ پریشان ہے۔ اس کی امی اس نیک کام کو سرانجام دینے کی اجازت نہیں دیتیں۔ اگر ایسا ہوا۔ تو وہ عورت برباد ہو جائے گی۔ ذلت اور گناہ میں اس طرح ڈوبے گی کہ پھر کبھی نکلنا ممکن ہی نہ ہو گا۔"

امی متاثر نظر آ رہی تھیں۔

آپ کا کیا خیال ہے امی؟" ضیا نے ایک دم امی کا ہاتھ پکڑ لیا" کیا میرے دوست کو نیکی کے کام میں تاخیر کرنا چاہیے۔ امی کے سامنے ہتھیار ڈال کر اس مظلوم عورت کو گھناؤنی راہ اختیار کرنے دینا چاہیے۔ اپنے وعدے سے پیچھے ہٹ کر عورت کو تباہ ہونے دینا چاہیے۔

"یقیناً نہیں۔" امی نے فیصلہ کن انداز میں کہا"۔ بے شک اک ماں کے لئے ایسی عورت

کو قبول کرنا مشکل ہو گا۔ لیکن جیسے حالات تم بتا رہے ہو۔ ماں کو بھی فراخدلی کا ثبوت دینا چاہیے۔ یہ کوئی گناہ کی بات نہیں۔ نہ ہی جرم ہے۔"

"امی کیا آپ میرے دوست کی امی کو قائل کر سکتی ہیں؟" ضیا نے جلدی سے کہا" وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ امی کو ابھی شک بھی گذرے۔ کہ وہ دوست کی نہیں اپنی بات کر رہا ہے

"مجھے ان سے ملانا۔ میں کوشش کروں گی۔"

ضرور ملاؤں گا۔ ضرور ملاؤں گا" وہ خوش ہو کر اٹھ کھڑا ہوا" کراچی سے واپس آ لوں پھر ان لوگوں سے آپ کی ملاقات کراؤں گا۔ آپ ضرور اس کی امی کو قائل کر لیں گی؟"

کہہ نہیں سکتی کہ ضرور ہی قائل کر لوں گی۔ بہر حال کوشش ضرور کروں گی۔

آپ بہت اچھی ہیں امی۔ بہت اچھی بڑی عظیم۔ ایسے خیالات رکھنے والی ماں یقیناً دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ آپ بہت عظیم ہیں امی بہت عظیم۔"

اس نے بڑے والہانہ انداز سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر انھیں پیار کر لیا اس کا دل فرطِ مسرت سے پھٹ جانے کو تھا۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی اسے لگ رہا تھا۔ اس نے شہلا کو پا لیا ہے جیت لیا ہے۔ حاصل کر لیا ہے۔

شہلا

جو

اس کی زندگی تھی۔ روح تھی۔ جان تھی۔

اور

پکارتا ہوا فرض تھی۔

بے شک وہ امی کو بڑے چالبازانہ طریق سے جال میں لایا تھا۔

وہ اس بات سے بھی بے خبر نہ تھا۔ کہ قول و عمل کو جانچنے ماپنے کے دو پیمانے ہیں۔ قول و عمل اپنی ذات سے سرزد ہو تو جھٹ سے جانچ کا پیمانہ بدل لیتے ہیں۔

امی جو بات اس کے ساتھی کے رابطے سے مستحسن قرار دے سکتی تھیں۔ ضیا کے حوالے سے وہی بات ناقابل برداشت بھی ہو سکتی تھی۔

پھر بھی

ضیا نے بڑے ماہرانہ انداز میں امی کو گھیر لیا تھا۔

شہلا سے محبت اور شادی کا انکشاف امی کے لئے تھرا دینے لرزا دینے والا مرحلہ تو ہو سکتا تھا۔ لیکن انہی کے عقاید اور نظریے کا سہارا لے کر ضیا یہ مرحلہ طے کر لینے کا امیدوار بھی ہو گیا تھا۔

اسی لئے وہ خوش تھا۔

بے انتہا خوش

سعید اسٹیشن پر موجود تھا۔ ضیا نے گاڑی رکنے سے پہلے ہی اسے دیکھ لیا تھا۔ ہاتھ ہلا کر اس نے سعید کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ سعید خوشی سے بے اختیار ہو کر چیخا اور گاڑی کے ساتھ ساتھ تقریباً بھاگتے ہوئے اس تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ کراچی پہلی بار آیا تھا۔ اس شہر پر آشوب کے چرچے تو سن رکھے تھے۔ بھیڑ بھاڑ گہما گہمی اسے پسند تو نہ تھی۔ لیکن وہ اب کراچی آ ہی گیا تھا۔

کراچی

جہاں زندگی کی ہلچل افراتفری بنی ہوئی ہے۔ جہاں پاکستان کی آدھی سے زیادہ دولت سمٹ آئی ہے۔ اور جہاں دو وقت کی روٹی کو محتاج لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ جہاں پرشکوہ عمارتیں ہیں۔ اعلٰے درجے کے ہوٹل ہیں۔ جدید طرز کے کلب ہیں۔ جوار خانے ہیں۔ فلک بوس بلڈنگیں ہیں۔ سینما ہیں۔ پارک ہیں۔

اور

جہاں

گندی گندی آبادیاں بھی ہیں۔ جہاں بے ترتیب گلیاں اور کچی سڑکیں ہیں جہاں تنگ و تاریک کوٹھڑیاں ہیں۔ ٹاٹ لگے دروازے ہیں۔ ٹوٹے پھوٹے گھروندے ہیں۔ اور یہاں وہاں بکھری ہوئی جھگیاں ہیں۔

جنہیں کبھی آگ نگل جاتی ہے۔

اور

کبھی بارش نوالہ بنالیتی ہے۔

کراچی تضادوں کا شہر ہے۔ یہاں زندگی آسودگیوں اور راحتوں کے چشمے کی طرح بہتی ہے۔ اور یہیں زندگی کا وہ بھیانک رخ بھی نظر آتا ہے۔ جہاں زندگی تعفن کا ایسا ڈھیر ہے جس کی سڑاند تنفس کو اوپر تلے کر دیتی ہے۔

گاڑی رک بھی پائی تھی۔ کہ سعید کودکو کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا اور ایسا پرجوش استقبالی نعرہ مارا۔ کہ دوسرے مسافر بھی چونک گئے۔

دونوں دوست والہانہ پن سے ایکدوسرے سے لپٹ گئے۔

"بھئی رستہ تو دیں" باہر آنے والے مسافر نے دونوں کو کوریڈور میں لپٹے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

دونوں ہنس کر الگ ہو گئے۔ جانے والوں کو راستہ دیتے ہوئے۔ حال احوال پوچھنے لگے۔

"خالہ جان نہیں آئیں" سعید نے پوچھا۔

"غنیمت جانو۔ کہ میں بھی آگیا"

"نہ آتے تو پھر دیکھتے"

"کیا کرتے"

"اپنا سر پھاڑ لیتا۔"

دونوں کھکھلا کر ہنس دیے۔

پھر باتیں کرتے کرتے سعید نے قلی کو اشارہ کیا۔ سامان تھا ہی کتنا۔ ایک سوٹ کیس دوسرا چرمی بیگ۔

قلی نے سامان اٹھایا۔

دونوں اس کے پیچھے پیچھے کمپارٹمنٹ سے باہر آگئے۔

دونوں بے انتہا خوش تھے۔ خوشی میں باتیں کئے جا رہے تھے۔ گیٹ پہ ٹکٹ اور پلیٹ فارم ٹکٹ دینا بھی دونوں کو یاد نہ رہا۔

"ٹکٹ صاحب" چیکر نے پیچھے سے آواز دی۔ تو ضیا ہنس کر بولا "بے ٹکٹ سفر کرنے کا عادی نہیں ہوں صاحب۔ یہ لیجئے ٹکٹ"

"میں بھی یقیناً شریف آدمی ہوں صاحب۔ یہ لیجئے پلیٹ فارم ٹکٹ"

چیکر مسکرا دیا۔

دونوں باہر آگئے۔ سعید پرلی طرف پارک کی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھا۔

سفید لمبی سی نئے ماڈل کی گاڑی میں سعید نے قلی سے سامان رکھوایا اور پیسے دیتے ہوئے ضیا کے لئے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

ایک لمحہ کو ضیا کو یوں لگا جیسے اب تک سعید کی امارت کا اسے صحیح اندازہ نہ تھا اسے کچھ جھجک سی لگی۔

لیکن

دوسرے لمحے سعید اس سے اتنے خلوص تپاک اور اپنائیت سے باتیں کر رہا تھا کہ یہ احساس مٹ گیا۔

"تمہیں دیکھا تو یوں لگا جیسے عید کا چاند نکل آیا" سعید گاڑی چلاتے ہوئے بولا"

"یہ ڈائیلاگ رہنے دو یار" ضیا نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ مارا

"اللہ قسم ضیا۔ میری خوشی کا تم اندازہ نہیں کر سکتے"

"خوشی مجھے بھی تم سے کچھ کم نہیں ہوئی"

"ملازمت کا کیا بنا"

"فی الحال صفر"

پھر دونوں آج کے دور کی زیادتیوں کی باتیں کرنے لگے۔ گاڑی کراچی کے پر ہجوم بازاروں سے ہوتی ہوئی منزل مقصود کی طرف جا رہی تھی۔ کئی جگہ ٹریفک کی زیادتی کی وجہ سے انہیں رکنا بھی پڑا۔ رکشے، سکوٹر، ٹیکسیاں، موٹریں، بسیں اور کہیں کہیں ٹرام گاڑیاں، پیدل چلتے لوگ۔ سکوٹروں سائیکلوں پر سوار مخلوق۔ اتنا رش تھا کہ الاماں۔

ضیا کو تو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے انسانوں کا دریا بہہ رہا ہے۔ ہر طرف افراتفری اور بھاگم دوڑ ہی کی کیفیت نظر آئی۔ وقت کی طرح لوگ بھی بہہ رہے تھے۔

"بڑا بور سفر ہے" سعید نے کہا۔

"ہاں سفر سے کہیں زیادہ سزا ہے تمہاری خاطر سزا بھی کاٹ لی"

"شکریہ اس محبت کا۔ سزا میری خاطر نہیں آصفہ کی خاطر کاٹی ہے"

"چلو یہی سہی۔"

"احسان تھوڑا ہی کیا ہے۔ بہن کے لئے اتنا تو کرنا ہی تھا۔"

"احسان تو جب ہو گا جب تمہاری شادی میں شریک ہونے آؤں گا۔"

"اپنی قسمت اس معاملہ میں چوپٹ ہی نظر آتی ہے"

"اوہو" ایسے مایوس ہو رہے ہو"

"مایوسی والی بات تو ہے ہی۔ جہاں ہمیں پسند ہے وہاں دال گلتی نظر نہیں آتی۔"

"تمہارے جذبہ دل میں لگن نہ ہو گی۔ ورنہ ناکامی کی تو بات نہیں ہوتی"

ضیا نے اتنی سنجیدگی اور بھرپور احساس کے ساتھ کہا۔ کہ سعید گردن موڑ کر اس کا منہ تکنے لگا۔

تجربہ کر چکے ہو۔" سعید نے چند لمحوں بعد مسکرا کر کہا۔

"بالکل ایسا تجربہ۔ جس سے کوئی صاحب عقل یقین ہی نہ کر سکے۔"

"واقعی"

"میرے جذب دل نے انہونی کو ہونی کر دیا ہے۔"

"مذاق کر رہے ہو"

"خدا قسم بالکل نہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ لگن ہو۔ خلوص ہو۔ اور پختہ عزم ہو تو پتھر بھی پگھل جاتا ہے سعید میاں۔"

سعید امی سے کرید کرید کر پوچھنے لگا۔

"فی الحال" ہر بات صیغہ راز میں ہے دوست چند دنوں بعد منظر عام پر آجائے گی تو خود ہی دیکھ لینا۔"

دوست کو بھی نہیں بتاؤ گے"

ضرور بتا دیتا۔ اگر کسی کے وعدے کا شریفانہ پاس نہ ہوتا"

اللہ اللہ

دونوں مسکرا دیے۔ سعید نے محسوس کیا۔ کہ ضیا کی مسکراہٹ جلتے دیپ کی طرح لو دے رہی ہے۔ یہ خوشی اس کے چہرے اور آنکھوں کی چمک سے عیاں تھی۔

گاڑی ایک وسیع عریض کوٹھی کے شاندار پھاٹک میں داخل ہوئی۔ خوبصورت چمن کا گھیرا کاٹ کر گاڑی پورچ میں جا ٹھہری۔

خاکی وردی والا ملازم بھاگ کر آیا۔ اور مؤدبانہ سلام کرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول دیا

ضیا، گاڑی سے باہر نکلا تو ملازم نے اتنی تعظیم سے جھک کر آداب کیا کہ اسے یوں لگا جیسے وہ کورنش بجا لایا ہو۔

ملازم کو سامان نکالنے کا کہہ کر سعید ضیا کو ساتھ لے کر برآمدے کی طرف بڑھا۔ ماربل کا فرش چمک رہا تھا۔ اس چمک میں ضیا کو سعید کی مالی حیثیت جھلمل کرتی نظر آ رہی تھی۔ اسے اب تک واقعی سعید کی مالی حیثیت اور امارت کا صحیح اندازہ نہ تھا۔

محل نما کوٹھی کا ڈرائینگ روم بھی اتنا ہی شاندار تھا۔ نایاب چیزیں تھیں۔ دولت کو باذوق لوگوں نے بڑے ذوق سے استعمال کیا ہوا تھا۔

ضیاء کو اپنے ڈرائینگ روم کا خیال آ گیا۔

دادا ابا کے وقت کا قالین۔ پرانے۔ بھاری بھرکم صوفے۔ سوتی پردے اور روئی کے کشنوں والی ایزی چیئرز۔

"یہ لوگ ہمارے گھر آ کر کیا سوچتے ہوں گے۔" ضیاء نے سوچا۔ لیکن جلد ہی یہ سوچ غائب ہو گئی۔ مما اور ڈیڈی آ گئے۔ اور جس اپنائیت چاہت اور محبت سے ملے، طبقاتی فرق کا وجود ہی مٹ گیا۔

سب نے چائے وہیں پی

"بہن جی اور شانو کو نہ لا کر تم نے بہت برا کیا ہے بیٹے" مما نے گلہ کیا۔

"انہیں ضرور آنا چاہیے تھا۔ پپا بولے۔

"میں جو آ گیا ہوں" ضیا مسکرایا۔

"تم اپنی جگہ" سعید نے جواب دیا" ویسے خالہ جان سے سخت گلہ ہے۔"

"تمہاری شادی پہ آئیں گی" ضیا نے شوخی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہوا کہ وہ کبھی آ ہی نہ سکیں گی۔ سعید نے ہنس کر کہا۔

"کیوں ؟ - مایوس کیوں ہو۔" ضیا نے چپکے سے کہا۔

بس۔ سعید بولا۔

"آنٹی" ضیا نے مما سے کہا سعید کی شادی کب کر رہی ہیں۔"

میں تو آج ہی کرنے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ اسے کوئی لڑکی پسند آئے" مما ہنسیں۔

"واہ جی۔ بہت اونچی پسند ہے تمہاری۔ کوئی لڑکی اب تک جچی ہی نہیں" سعید کے ٹھوکر دیتے ہوئے ضیا نے کہا۔

بتایا تو تھا تمہیں۔ سعید نے آہستگی سے کہا۔ اور پھر دونوں دوست سرگوشی نما آواز میں باتیں کرنے لگے۔ دونوں کو باتوں میں مگن دیکھ کر پپا اٹھ کر چلے گئے۔ مما دوسرے صوفے پر جا بیٹھیں۔ ان کے ہاتھ میں کوئی میگزین تھا۔ دیکھنے لگیں۔

سعید نے اپنے برابر والا کمرہ ضیا کے لئے کھلوا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ضیا کو اس کمرے میں لے آیا۔

خاصا کشادہ کمرہ تھا۔ ہلکے سبز رنگ کے ریشمی پردے گہرے سبز رنگ کے قالین کی مناسبت سے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ دیواروں کا رنگ بیڈ کی ساخت اور چیزوں کی ترتیب بہت خوبصورت تھی۔ سہولت اور آسائش کی ہر چیز کمرے میں موجود تھی۔

نوکر ضیا کا سامان یہاں رکھ گیا تھا۔

"لو بھئی" سعید نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے ضیا سے کہا" کچھ دیر آرام کر لو تم۔"

"آرام ہی آرام ہے یار۔ تم نے کہیں جانا ہے کیا؟"

"فی الحال نہیں"

"تو پھر بیٹھو۔ یہیں۔ گپ شپ لگاتے ہیں۔"

"منہ ہاتھ دھو لو۔ نہانا ہے تو نہا لو۔ تکان اتر جائے گی"

"وہ تو تم لوگوں سے مل کر ہی اتر گئی۔ ہاں میں نہاؤں گا ضرور۔"

"تو پھر گھس جاؤ" سعید نے انگوٹھے سے غسلخانے کی طرف اشارہ کیا" میں یہیں بیٹھتا ہوں۔"

"بہتر"

"دوپہر کھانے کے بعد باہر چلیں گے"

"ضرور۔"

سعید نے سوٹ کیس ضیا کی طرف کر دیا" اور ڈریسنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا" الماری میں رکھ لو اپنی چیزیں"

ضیا نے سوٹ کیس اور بیگ اٹھایا۔ اور چیزیں کپڑے نکال کر الماری میں رکھنے لگا۔ اپنے لئے فان رنگ کی شلوار قمیض نکالی اور غسلخانے میں چلا گیا۔

نہا دھو کر وہ تازہ دم ہو گیا۔ اس کا چہرہ جو سفر کی تکان سے کچھ تھکا تھکا سا نظر آ رہا

تھا۔ اب تروتازہ تھا۔ سعید نے ایک انوکھا روپ اور حسین سانکھار اس کے چہرے پہ دیکھا
کیا بات ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیوں" ضیا اس کے قریب بیٹھتے ہوئے مسکرایا۔

"وہ بہت خوبصورت ہو گئے ہو"

"پہلے کیا کم تھا"

"نہیں یار۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ کچھ زیادہ ہی شگفتہ نظر آ رہے ہو۔"

"خوشیوں کا پر تو چہرے پہ پڑ رہا ہے نا"

"بات کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔"

بڑی تیز نگاہیں ہیں تمہاری"

"کس بات کی خوشی ہے۔"

"محبوب کو جیت جانے کی"

"مذاق کرتے ہو"

"واللہ سچ کہتا ہوں سعید۔ تم میری خوشیوں کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میرے چہرے یا آنکھوں میں تمہیں چمک نظر آئی ہے۔ تو ٹھیک ہی نظر آئی ہے۔ میں بہت خوش ہوں سعید۔ شاید دنیا کا پہلا اور آخری خوش نصیب آدمی ہوں" ضیا نے بڑے جذباتی انداز میں سعید کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔

"مبارک ہو دوست۔ یہ بات ہے تو خوشی کی بات ہے۔ سعید نے کہا" خدا تمہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے"

"شکریہ۔ یہی دعا میرے دل میں تمہارے لئے بھی ہے"

"اپنا نصیب کھوٹا ہے دوست"

"خدا نہ کرے"

"خدا نے کہہ ہی دیا"

سعید مایوس نظر آ رہا تھا۔ ضیا کو کوفت ہونے لگی۔ وہ سعید سے ہمدردی جتاتے ہوئے اس لڑکی کے متعلق پوچھنے لگا جو اس کی دسترس سے دور تھی۔ سعید جیسا لڑکا اور محرومی سے اس طرح دوچار ہو۔ بات ضیا کے دل کو نہ لگتی تھی۔

"جو محترمہ تمہیں پسند تھیں۔ وہ ہیں کیسی"

اپنی اپنی نظر کی بات ہوتی ہے ضیا۔ مجھے تو لاکھوں میں ایک لگتی ہے۔"

اس سے معاملہ کس حد تک چلا تھا۔

"اڑنے بھی پائے نہ تھے۔ کہ گرفتار ہم ہوئے" سعید نے مسکرا کر ترنم سے کہا"

"کیا مطلب؟ ضیا سنجیدگی سے بولا۔

"یار تمہیں مری میں بتایا تو تھا۔ یاد ہے ایک شام ہمیں کراچی کے کچھ لوگ سر راہ مل گئے تھے۔"

وہ ضیا سوچنے لگا"

بھئی، سونیا ایک بڑی سیکسی سی لڑکی تھی۔ جس کے ساتھ اس کے دو تین کزن تھے"

سونیا کے نام سے ضیا کو وہ سب لوگ یاد آ گئے۔

"ہاں۔ ہاں۔ وہ دبلا۔ پتلا لمبا سا لڑکا۔ کیا نام تھا اس کا۔"

"شاہد"

"شاہد"۔ ہاں"

"اور اچانک بالکل اچانک ضیا پہ کوئی لمحہ اپنا آپ منکشف کرتے ہوئے سارہ کی شبیہ شاہد کے نام کے ساتھ لے آیا"

"اس لڑکی کی سنا ہے اب شاہد سے ان بن ہو گئی ہے" سعید بولا۔ ضیا دم بخود سا اس کا منہ تکنے لگا"

"وہ۔ وہ ہے کون۔ کہاں رہتی ہے۔ کیا تم مجھے اس سے ملا سکتے ہو" ضیا نے اتنی بے صبری سے پوچھا۔ کہ سعید معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔

"کیا خیال ہے؟" وہ قدرے طنز سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"بے وقوف ہو تم۔ میرے سوال کا جواب دو تم۔ ہو سکتا ہے تمہارے بھلے کے لئے کچھ کر سکوں۔

"سعید ہنس کر بولا" تم سے ملتے ہوئے ڈرتا ہوں تمہیں دیکھ کر مجھے کیا پسند کرے گی وہ جو تھوڑا بہت چانس نظر آیا ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔ بھئی تم آج خطرناک حد تک خوبصورت لگ رہے ہو۔

"بکو نہیں میری بات کا جواب دو" وہ غصے سے بولا۔

وہ لڑکی اس گھر میں ہی ہے۔ چاہو تو ابھی مل سکتے ہو" سعید نے مسکرا کر کہا۔

ضیا کا دھیان سارہ کی طرف گیا تھا۔ سعید کی بات سے اسے مایوسی ہوئی۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی اور ہی لڑکی ہو۔ مری والا شاہد ضروری تو نہیں سارہ ہی کا امیدوار ہو۔

کیا تمہاری کوئی عزیزہ ہے" ضیا نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

نہیں آصفہ کی دوست ہے" سعید نے کہا" ابھی ابھی آصفہ کے ساتھ وہ بھی بازار سے آئی ہے"

"حد ہو گئی"، "وہ کس بات کی"

"تمہاری بزدلی کی"

"کیوں"

"لڑکی رینج میں ہے اور نشانہ خطا کرتے ہو"

"تم جیسا ماہر نشانہ باز نہیں ہوں"

"بزدل ہونا"

"شاید"

"شاہد سے اس کی ان بن ہو چکی ہے۔ وہ تمہارے ہاں آتی جاتی ہے۔ اور تم ہونقوں کی طرح بس منہ ہی دیکھتے رہتے ہو۔"

"کیا کروں"

"مدعا بیان"

"انکار کا ڈر ہے"

"انکار کو اقرار میں بدلنے پر اسے مجبور کر دو"

"کیسے"

جذبہ دل کی کشش سے۔ سچی لگن سے۔ محبت کی گرمی اور عشق کی حرارت سے"

"باتیں تو ٹھیک ہی کرتے ہو"

"تمہاری طرح اتنا بڑا سر بھیجے سے خالی نہیں۔ عقلمند آدمی ہوں"

"واقعی"

دونوں مسکرانے لگے۔

ضیا نے اس لڑکی سے ملانے کا شوق ظاہر کیا تو سعید بولا" ابھی چلو۔ آمنہ کے کمرے ہی میں ہو گی۔ آمنہ سے بھی تو تم ابھی نہیں ملے۔"

"چلو"

ضیا اٹھا۔ ساتھ سعید بھی۔ لیکن کمرے سے نکلنے سے پہلے ہی ملازم آ گیا۔

"صاحب فون آیا ہے۔ اسلام آباد سے"

"اچھا، اچھا"

"ٹھہرو ضیا میں ابھی آتا ہوں" اس نے ضیا سے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتے باہر نکل گیا۔ ملازم بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

ضیا واپس مڑا۔ کھڑکی کی طرف آیا۔ پردہ ایک طرف ہٹاتے ہوئے باہر چمن کی طرف دیکھنے لگا۔ کوٹھی کی طرح کوٹھی کا لان بھی خوبصورتی اور نفاست کا آئینہ دار تھا۔

ضیا کوریڈور میں تھا۔

اور

وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔

"ضیا۔ آپ۔۔؟" اس کے لبوں سے حیرت و مسرت سے چیخ سی نکل گئی۔

"سارہ۔۔! ضیا بھی حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبے سے بولا۔

"آپ۔ آپ یہاں کہاں" سارہ نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

"اور آپ یہاں کہاں" ضیا نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

چند قدم ضیا بڑھا۔ چند سارہ نے اٹھائے۔ دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہوگئے۔ سارہ اب تک حیرانی ملی خوشی سے مغلوب مغلوب سی تھی۔ ضیا مسکرا رہا تھا دونوں حال احوال پوچھ رہے تھے۔

"اللہ یقین نہیں آرہا کہ یہ آپ ہیں" سارہ دونوں ہاتھ خوشی سے ملتے ہوئے بولی۔

"چھو کر دیکھ لو ہونے نہ ہونے کا یقین آجائے گا" ضیا نے شوخ مسکراہٹ سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یقین آگیا ہے وہ ہنسی"

"بغیر چھو کر دیکھے"

"تم نے تمہاری باتوں نے۔ تمہارے ناصحانہ انداز نے مجھ پر بہت اثر چھوڑا تھا۔ یہ سب چیزیں میری روح کی گونج بن گئی تھیں۔ میں نے اپنے آپ میں زبردست تبدیلی محسوس کی۔ میری تشنگی مٹ گئی۔ میری گرسنگی کو سیری ہوگئی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے میں مدتوں سے خالی خولی تھی۔ جو اچانک بھر گئی ہوں۔ ضیا۔۔۔ میں نے قناعت کا سبق سیکھا۔ میں نے اپنے آپ کو ذلتوں سے اٹھا کر انسانیت کی معراج تک لیجانے کی شعوری کوشش کر دی تھی۔

"شہلا۔۔۔ میری خوشیوں کا آپ اندازہ نہیں کر سکتیں۔"

"میں نہیں جانتی۔ کہ تم نے مجھ سے بچھڑ کر کیا کیا۔ میرے خیال سے چھپتے رہے یا کسی اور چہرے نے تمہیں متوجہ کر لیا۔ لیکن میں اپنی بات پوری سچائی سے کہہ رہی ہوں۔"

ضیا کے چہرے پر ایک ثانیے کو تاریکی سی لہرائی۔ خاتون سے بیوفائی کے خیال سے وہ لرز سا گیا۔ سارہ کے لیے اس کے جذبات کچھ گدگدائے تو تھے۔ لیکن دوسرے لمحے اس نے سارہ کا خیال ذہن سے نکال دیا۔ جو کچھ بھی تھا۔ خاتون اس کے دل و دماغ سے ہمیشہ چمٹی رہی تھی۔ وہ اسے بھلا کبھی نہ پایا تھا۔

شہلا رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی رہی۔ ضیا مرعوب و مغلوب ہوتا رہا۔ اس کے انگ انگ سے پیار کے سرچشمے ابلتے رہے۔ خاتون اس کے ذہن میں عظمتوں کو چھوتی رہی۔

"تم میرے من میں بس گئے۔ تو میں نے تن کی دنیا بھسم کر ڈالی۔ میرے اندر کی وحشی عورت اور جنس زدہ بھوکی عورت دم توڑ گئی۔ میں نے۔۔۔ میں نے اسے کچل ڈالا۔"

"شہلا۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں صرف اسی قدر کہہ سکا۔

"لیکن۔۔" شہلا روہانسی ہو کر بولی۔

"کیا۔" وہ بے تاب تھا۔

"اب تم پھر کہیں سے میرے لیے آزمائش بن کر آگئے ہو۔ ضیا خدا کے لیے یہاں سے

چلے جاؤ۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں تمہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ہم عمودی خط کی ابتدا اور انتہا ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم۔ لیکن الگ تھلگ۔ جو کبھی نہیں ملے۔ کبھی نہیں مل سکتے۔" خاتون نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔

وہ رو دہانسی ہو رہی تھی۔ ضیا آگے بڑھا۔ اپنے ہاتھ خاتون کے کندھوں پر رکھتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا "ہم عمودی خط کے سرے نہیں ہیں شہلا۔ ہم دونوں مل کر گول دائرہ بن گئے ہیں۔ دائرہ۔ جس کی ابتدا ہوتی ہے نہ انتہا۔ جو ایک ہی خط سے بنتا ہے۔ کہیں سے شروع ہوتا ہے نہ کہیں ختم۔"

شہلا دھیرے سے مسکرائی۔

ضیا نے اسے اپنے اور قریب کر لیا "میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ نہ ہی آپ مجھے چھوڑ کر کہیں جائیں گی۔ آپ نے ایسی کوئی کوشش کی۔ تو۔ میں۔ میں مر جاؤں گا۔"

شہلا نے پیار سے ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا "جھوٹ نہ بولو۔"

"آزمانا چاہتی ہیں کیا" ضیا نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا ضیا" وہ اس کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے مسکرائی "ہم پہلے بھی بچھڑے تھے۔ تم بھی جیتے رہے۔ میں بھی نہ مر سکی۔ دونوں ہی زندہ رہے۔"

"لیکن شہلا۔ اس بات کا اعتراف تو آپ کو بھی کرنا ہی پڑے گا۔ کہ زندہ وجودوں کے اندر ہی اندر کوئی چیز مر مر گئی تھی۔ کیوں؟" اس نے بازوؤں کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے کہا۔

"شاید۔ شاید تم درست کہتے ہو۔"

"وعدہ کریں۔ اب مجھے چھوڑ کر نہ جائیں گی۔"

"سوچوں گی۔"

"شہلا۔"

ضیا نے شہلا کو سختی سے جھنجھوڑ ڈالا۔

"جی"

"ہو سکتا ہے۔ ضیا کی جگہ کوئی چھلاوہ آپ کے سامنے کھڑا ہو۔"

"لگتا کچھ ایسے ہی ہے۔ لاہور والے ضیا اور آپ میں بڑا فرق ہے۔"

"کیا فرق ہے"

"وہ سڑیل سا تھا اور یہ بڑا باغ و بہار طبیعت کا لگتا ہے۔"

سارہ نے شوخی سے کہا۔

ضیا بھی شوخی سے بولا "وہ ضیا پسند تھا یا یہ۔"

"ایک بھی نہیں۔" وہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔

"کیوں؟ شاہد کا اثر باقی ہے کیا" ضیا نے بھی اسے چھیڑا۔

"اس کا باقی ہو یا نہ ہو" وہ مسرور انداز میں بولی "ویسے جناب کا اثر بھی نہیں ہے سمجھے آپ"

"سعید کے متعلق کیا خیال ہے" اچانک ضیا کے منہ سے نکلا۔

"جی" وہ حیرت زدہ سی ہو کر رہ گئی۔

ضیا خفیف سا ہو گیا۔ بات بدلنے کی غرض سے بولا "ماموں جان کا کیا حال ہے"

"ٹھیک ہیں"

"اور ہماری ممانی"

"زوبی آپا بھی ٹھیک ہیں"

"اور آپ"

"میں بھی ٹھیک ہوں"

ضیا اور وہ دونوں ہنس پڑے۔

وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ سارہ شانو اور پھپھو کا احوال پوچھ رہی تھی۔ کہ آصفہ کسی کام سے باہر آئی۔

"ہلو" ضیا نے آصفہ سے کہا۔

"آپ آ گئے" آصفہ نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔

"نہ آتا" وہ مسکرایا۔

"نہ بھی آتے تو کیا فرق پڑتا" آصفہ بولی۔ ضیا نے ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی۔

"اب چلا جاؤں؟" ضیا نے دھیرے سے کہا۔ آصفہ کچھ نہیں بولی۔ اس کا رنگ کچھ پھیکا پڑ گیا۔

سارہ دونوں کی باتیں سن کر مسکرائی۔

"تعارف ہوا آپ کا؟" آصفہ نے سارہ اور ضیا سے پوچھا۔

"سارہ کے کچھ کہنے سے پہلے ضیا بولا" جی نہیں۔"

آپ میری دوست ہیں سارہ ناصر" آصفہ بولی۔"

"بندہ ناچیز سعید کا جگری دوست ہے۔ ضیا القمر" ضیا نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سارہ کی طرف قدرے جھکتے ہوئے کہا" اور سعید آپ جانتی ہی ہوں گی۔ ان محترمہ کا بھائی ہے۔"

"سارہ کھکھلا کر ہنس پڑی"

آصفہ کو بے باک ہنسی پر تعجب سا ہوا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" سارہ کی آنکھوں میں ہنسنے سے نمی آ گئی۔

"شکریہ" ضیا نے سر خم کرتے ہوئے کہا" مجھے بھی آپ سے مل کر بے حد بے حساب خوشی ہوئی ہے۔"

"ہونا بھی چاہیے" سارہ شوخی سے بولی۔

"کیوں" ضیا نے بظاہر سنجیدہ بنتے ہوئے کہا۔

"اس لئے کہ۔ اس لئے کہ۔" سارہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔

"بہت خوش ہوئی ہیں آپ مجھ سے مل کر" ضیا چہکا" ہنسی ہی نہیں رک رہی۔"

"ہنسنے کی بات تو ہے ہی" سارہ نے کہا" کیوں جی نہیں ہے۔ ہنسنے کی بات۔"

"پاگل لگ رہی ہیں آپ" ضیا نے منہ چڑایا۔

"مجھے بھی کچھ کچھ ایسا ہی لگتا ہے" وہ پھر کھکھلا کر ہنس پڑی۔

آصفہ کبھی ضیا اور کبھی سارہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس قیاس آرائی میں دیر نہ لگی کہ دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اور یہ جاننا محض جاننا ہی نہیں بے تکلفی کی حدوں کو چھوتی ہوئی جان پہچان ہے۔

"لگتا ہے آپ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں۔" آصفہ نے کہا۔

"جی بالکل نہیں" سارہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ضیا بولا۔" پہلے سے تو میں صرف آپکو جانتا ہوں۔"

"شکریہ" آصفہ بے دلی سے مسکرائی۔

چپکے چپکے شادی رچالی" ضیا آصفہ سے مخاطب تھا۔

"کیوں جی۔ آپ کی اجازت لینا چاہیے تھی؟" آصفہ کے بے رنگ چہرے کو دیکھتے ہوئے۔ سارہ نے شوخی سے ضیا سے کہا۔

"یہ حق تو شاید نہیں تھا مجھے۔" ضیا نے کہا۔

بات کچھ سنجیدہ ہو چلی تھی۔ اس لئے آصفہ نے بات بدلنے کی غرض سے پوچھا" آپ اکیلے ہی آئے ہیں۔"

فی الحال اکیلا ہی ہوں۔" ضیا نے ذومعنی مسکراہٹ سے کہا۔

میرا مطلب شانو اور خالہ جان سے تھا" آصفہ سے جل کر کہا۔

"اچھا۔ اچھا۔" ضیا جیسے واقعی اس کا مطلب پہلے سمجھا ہی نہیں تھا۔

"ان کو بلایا آپ نے؟"

"آپ کو نہیں بلایا تھا۔" آصفہ نے تلخ مسکراہٹ سے کہا" انہیں ضرور بلایا تھا۔"

"عجیب بات ہے۔" ضیا مسکرایا" ہر بات الٹ ہی ہوتی جا رہی ہے۔"

"بڑے موڈ میں ہیں۔" آصفہ نے مسکرا کر طنزیہ لہجے میں کہا" اتنی خوشی کی بات ہے۔"

"آپ کی شادی کی۔" ضیا فوراً بولا۔

"شادی میری اور خوشی آپ کو ہوئی" آصفہ نے تیز نگاہوں سے اسے دیکھا"

"کیوں میں کوئی آپ کا دشمن ہوں۔ جو مجھے خوشی نہ ہوتی۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

سارہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"آپ تو ہنس لیں پہلے جی بھر کے۔" ضیا نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

"آج آپ، باتیں جو ایسی کر رہے ہیں۔" سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آصفہ نے چونک کر سارہ کی طرف دیکھا۔ اور پھر ضیا کی طرف غصیلے انداز میں دیکھتے ہوئے بولی۔" آپ جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔"

"توبہ توبہ۔ میں اور جھوٹ" ضیا نے مسکرا کر کانوں کو چھوا۔

"ابھی ابھی آپ نے کہا۔ کہ آپ سارہ کو پہلے سے نہیں جانتے۔" آصفہ نے خندہ لہجے میں کہا۔

"اب بھی یہی کہتا ہوں۔ یہ سراسر الزام ہے بہتان ہے۔ جو آپ یہ کہیں کہ میں انہیں پہلے سے جانتا ہوں" ضیا نے معصوم بنتے ہوئے کہا۔

سارہ پھر ہنس پڑی۔ آصفہ کچھ کہنے کو تھی۔ کہ وہ بول اٹھی" آصفہ! آپ میرے پھوپھو زاد بھائی ہیں۔"

"سچ؟" آصفہ کو اچنبھا ہوا۔ وہ آنکھیں پھاڑے کبھی ضیا اور کبھی سارہ کو دیکھنے لگی۔

ضیا نے مسکرا کر جھکتے ہوئے دونوں کو ہاتھ ماتھے تک لیجا لیجا کر آداب کیا۔

پچھلے دنوں ہم لاہور انہی کے ہاں تو گئے تھے۔" سارہ نے کہا" وہاں تو بڑے لئے

دیئے رہتے تھے۔ بہت بد مزاج سے لگتے تھے۔ سیدھے منہ بات ہی نہ کرتے تھے۔"

"وہاں امی سے ڈرتا تھا" ضیا نے مسخرے پن سے کہا"

"اچھا۔ یہ بات ہے۔" سارہ مسکرائی۔

"اب آزاد ہیں نا" ضیا نے ہنس کر کہا"

"وہ کچھ اور کہنے کو تھا۔ کہ سعید ادھر آگیا۔ تینوں کو کھڑے دیکھ کر بولا" تعارف ہو گیا ہو گا"

"نہیں۔" ضیا جلدی سے بولا۔

سارہ اور آصفہ مسکرانے لگیں۔

سعید ان کی مسکراہٹ سے کچھ نہیں سمجھا۔

"آپ سارہ کے پھوپھو زاد ہیں۔" آصفہ نے ضیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سعید سے کہا۔

"نہیں۔ واقعی؟" سعید پر حیرت کا دورہ سا پڑا۔ وہ ہونقوں کی طرح کبھی سارہ اور کبھی ضیا کا منہ تکنے لگا۔

"اب یہیں کھڑے رہنا ہے کیا۔ چلیئے ڈرائینگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" آصفہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"چلو بھئی" ضیا نے سعید کے پہلو میں ٹھوکا دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"میں تو پپا کو فون کروں گی" سارہ چہک کر بولی" اللہ۔ وہ کتنے خوش ہونگے آپ کا سن کر خدا قسم جب سے لاہور سے لوٹے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے ذکر خیر ہی جناب کا ہوتا ہے زوبی آپا کو بھی آپ سے ملنے کا اشتیاق پپا کی انہی باتوں سے ہوا ہے۔"

زوبی آپا سے پہلے ملی نہیں ہیں" آصفہ نے پوچھا"

سارہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا کر کہا" زوبی آپا کیا میں نے بھی انہیں نہیں دیکھا تھا کبھی۔ یہ لوگ کبھی کراچی آئے تھے نہ ہم گئے تھے۔ زوبی آپا کو انہوں نے یا ان کو زوبی آپا

نے کہاں دیکھنا تھا۔"

عجیب بات ہے۔ اتنی قریبی رشتہ داری اور ..." آصفہ نے کہا۔

"یہ رشتہ داری ان محترمہ کی وجہ سے تلخیوں کی نذر ہو چکی تھی۔" ضیا نے ہنس کر سارہ کی طرف اشارہ کیا۔

سارہ کے گالوں پر سرخی لہرا گئی۔ "خواہ مخواہ۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"سعید میرا بہت ہی عزیز دوست ہے سارہ صاحبہ۔ اس سے میری کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ کیا سمجھیں۔"

سارہ جانے کیا سوچ کر دھیرے سے مسکرا دی۔ پھر قدم اٹھایا اور بولی "میں فون کر کے آتی ہوں۔ آپ سب چلیے ڈرائینگ روم میں۔"

سارہ اٹھلاتی ہوئی فون کرنے چلی گئی۔ سعید ضیا اور آصفہ ڈرائینگ روم میں آ گئے۔

آصفہ کا رنگ پھیکا پھیکا سا تھا۔ انتہائی باتونی تھی۔ لیکن اب چپ چپ تھی۔ سعید کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ سارہ اور ضیا کی بے تکلفی ذہن پر دستک دے رہی تھی۔ سارہ کی طرف سے وہ مایوس پہلے ہی تھا۔ اب تو اپنی کامیابی کے مبہم سے آثار بھی دکھائی نہ دے رہے تھے۔

ضیا خوش تھا چہک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اعتماد اور کامیابی کی چمک تھی۔ سہانا مستقبل عکس تھا۔ خوشیوں کے سوتے ہمارے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ تلقل بہتے چشمے جب ہماری ذات۔ ہماری روح اور ہماری شخصیت کو سیراب کرتے ہیں۔ تو چاروں طرف ہمیں خوشیاں ہی خوشیاں بکھری نظر آتی ہیں۔

ضیا کا من بھی سیراب تھا۔

اسی لئے وہ خوش تھا۔

خوش۔ بے انتہا خوش۔

سعید اور آصفہ کے اندرونی جذبات سے بے پرواہ وہ اپنی خوشیوں میں ڈوبا مسلسل باتیں کئے جا رہا تھا۔

سارہ فون کر کے آئی۔

"کیا کہا ماموں جان نے" اس نے سارہ سے پوچھا۔

"ہائے ضیا وہ اتنے خوش ہوئے ہیں۔ کہ بتا نہیں سکتی۔" سارہ خوشی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی۔ "پہلے تو یقین ہی نہ کر پائے تھے۔ ابھی آ رہے ہیں۔"

"ناصر انکل" سعید نے یونہی کہہ دیا۔

"ہاں۔" سارہ بولی۔ "مجھے لینے آنا تھا۔ پر اب ان کا سن کر چار بجنے کا بھی انتظار نہیں کر سکتے۔ ابھی آ رہے ہیں۔"

"مارے گئے" ضیا نے فی البدیہہ کہا۔

سب ہنسنے لگے۔

کھچڑی بالوں والے دبلے پتلے ناصر کی صحت ان دنوں کچھ اور گر گئی تھی۔ عمر سے کئی برس آگے نکل گیا تھا۔ پیشانی پر تفکرات کی چھاپ بھی گہری تھی۔ اور آنکھوں میں کچھ سوچ بھی جم گئی تھی۔

وہ جب ضیا سے خلوص محبت اور تپاک سے بغلگیر ہوا۔ تو ضیا نے اس کے ابھرے بدن کی ہڈیاں اپنے جواں جسم میں چبھتی محسوس کیں۔ ماموں کے پاس آجانے اور کام میں ہاتھ بٹانے کی جو بات اس نے امی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کہی تھی۔ اب اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ وہ یہ کام ضرور کرے گا۔

یوں بھی شہلا سے شادی کرنے کے بعد وہ چاہتا تھا۔ کہ لاہور سے دور دور ہی رہے۔ انہوں نے۔ رشتہ داروں اور عزیزوں کی نظروں سے دور رہ کر وہ شہلا کو زندگی کی بھرپور خوشیاں دے سکتا تھا۔ ایسی صورت میں ماموں کے ساتھ کاروبار میں شرکت یا بطور منیجر ملازمت اسے گراں نہ تھی۔

ملن کے لمحوں میں یہ سب کچھ اس نے تیزی سے سوچ لیا۔ ماموں کو بازو کے گھیرے میں لئے وہ اسے بڑی محبت سے ڈرائینگ روم میں لے آیا۔ صوفے پہ مودبانہ طریق سے بٹھایا اور پھر خود بھی ان کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

ماموں رابعہ بیگم شانو اور دیگر عزیزوں کا حال احوال بڑے تپاک سے پوچھ رہے تھے

"شانی کو بھی ساتھ لے آتے" سارہ نے باپ کا ساتھ دیا۔

"بلایا ہوتا تو لے بھی آتا۔" ضیا نے ہنس کر سارہ سے کہا۔

"بلایا تو ہم نے بھی تھا" آصفہ اور سعید بہ یک زبان بولے۔

"ٹھہرو یار۔ میں تو ان سے نپٹ رہا ہوں" ضیا نے مسکراتے ہوئے سعید سے کہا

" سارہ ہنس پڑی۔ ناصر بھی مسکرا دیا۔

" ہنسی مذاق کی باتیں کچھ دیر ہوتی رہیں۔

آپ خیریت سے تو تھے ماموں" ضیا نے ان کے سراپا پہ گہری نگاہ ڈالی۔

" بس۔ خیریت ہی ہے۔ کام ان دنوں بہت زیادہ کرنا پڑ رہا ہے" وہ بولا۔

ناصر کام کی نوعیت بتانے لگا۔ ضیا کو تو کچھ اتہ پتہ نہ تھا۔ ہاں سعید ان کی ہاں میں ملانے لگا۔ دونوں بزنس کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ آصفہ اٹھ کر چائے کا کہنے چلی گئی۔ اور

ضیا سارہ سے باتیں کرنے لگا۔

پر تکلف سی چائے ضیا کی شوخ شوخ باتوں اور دلآویز مسکراہٹوں کے درمیان پی گئی۔ سعید کے مما اور پپا بھی آگئے تھے۔ محفل کا خوب رنگ جما۔

گھنٹہ بھر یوں ہی گزر گیا۔ پھر ناصر نے گھڑی دیکھی۔ اور اٹھتے ہوئے بولا "اب چلنا چاہیے"

سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

چلو ضیا۔ ناصر نے کہا۔

"نہیں انکل" سعید جلدی سے بولا۔ "ضیا ہمارا مہمان ہے۔ یہاں ہی رہے گا"

مما پپا ہنس پڑے۔ ضیا بھی مسکرایا۔ ناصر بولا" بھئی ٹھیک ہے آپ کا مہمان ہے" لیکن ہمارا بھی تو بیٹا ہے۔ ماموں کے گھر نہ جائے گا۔

پانچ کے بعد۔ سعید بولا۔

"یہ سراسر زیادتی ہے۔ زوبی آپا سے بھی تو انہوں نے ملنا ہے" سارہ بولی۔

آصفہ، سعید، مما اور پپا ضیا کے اپنے ہاں رکنے پہ اصرار کرنے لگے۔ سارہ اور

ناصر اسے ساتھ لیجانے کا۔ ہنسی مذاق میں نوک جھونک ہونے لگی۔"

"تم بھی تو کچھ بولو بھئی" بالآخر ناصر نے ضیاء سے کہا۔

"میں تو کراچی والوں کا مہمان ہوں۔ جو زور سے کھینچے گا۔ ادھر ہی کھنچ جاؤں گا" وہ ہنستے ہوئے بولا۔"

خیر کھنچو گے تو تم ان ہی طرف" سعید نے بظاہر ہنس کر کہا۔ لیکن آواز اور لہجے کے طنز سے ضیا چونک گیا۔ اس نے غور سے سعید کو دیکھا۔ اور یوں آپوں آپ اس پر کئی راز منکشف ہو گئے۔

چلو بیٹے" ناصر نے کہا" رات یہیں آجانا۔ ممانی سے مل آؤ۔ میں ہی تمہیں چھوڑ جاؤں گا۔ مجھے ویسے بھی آج آٹھ بجے کی فلائٹ سے پنڈی جانا ہے۔ ڈراپ کر دوں گا تمہیں۔ بس سعید ہو گئے خوش" سعید نے اثبات میں سر ہلایا۔

ضیا سعید ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب سب باہر نکل گئے۔ سارہ اپنی چیزیں آصف کے کمرے سے لینے چلی گئی۔ تو ضیا نے سعید کا ہاتھ پکڑ کر کمرے ہی میں روک لیا۔

"کیوں" سعید ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

"اسی لڑکی کا ذکر خیر تم کرتے تھے" ضیا نے مسکرا کر کہا۔

"معاف کرنا ضیا مجھے علم نہ تھا۔ کہ وہ تمہاری کزن ہے" سعید سر جھکا کر بولا۔"

"صرف کزن ہی نہیں"

"اور ـ"

سعید حیران حیران آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ضیا مسکراتے ہوئے کوئی مسرور سی دھن گنگنانے لگا۔

"مجھے معاف کرنا ضیا" سعید اپنے آپ پہ قابو پاتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

"کس بات کے لئے" ضیا نے گوشۂ چشم سے اسے دیکھا۔

"سارہ کے بارے میں میں جانے کیا کچھ کہتا رہا ہوں"

"غالباً تم نے کبھی بری بات نہیں کہی۔"

سعید چپ ہو گیا۔

"مجھے خوشی ہوئی ہے سعید"

"کس بات کی"

"اب کیا بتاؤں"

"یہ کیا بات ہوئی"

"ضیا چند لمحے چپ رہا۔ پھر ہلکی ہلکی مسکراہٹ لبوں پہ بکھیرتے ہوئے بولا" سارہ مجھے بہت عزیز ہے"

"ضرور ہو گی"

"اور تم بھی مجھے اتنے ہی عزیز ہو"

سعید کچھ نہیں سمجھا۔ جھکا ہوا سر اٹھا کر پاٹ نظروں سے ضیا کی طرف دیکھنے لگا۔

سارہ شاید چیزیں لے کر آگئی تھی۔ ہارن دو ایک بار بجایا گیا۔ سعید نے باہر دیکھتے ہوئے کہا" انکل بلا رہے ہیں"

"جناب ذرا اپنا موڈ ٹھیک کر لیں۔ پھر چلتے ہیں باہر" ضیا نے شوخی سے سعید کو دیکھا

"ٹھیک ہی ٹھیک ہے" سعید پھیکی ہنسی لبوں پہ لاتے ہوئے بولا۔

"اوں ہوں۔ ہنس کر دکھاؤ پہلے" ضیا نے کہا

"میں بندر نہیں ہوں جناب کہ جیسے نچاؤ گے ناچنے لگوں" سعید پھیکے پھیکے لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"سعید" ضیا ایکدم سنجیدہ ہو گیا۔

"ہوں"

"تم سارہ کے بارے میں سنجیدہ ہو۔"

"کیا مطلب ؟"

"تم سارہ کے معاملے میں سنجیدہ ہو۔"

سعید چپ ہو گیا۔

"بتاؤ نا۔"

"سعید نے ضیا کی طرف الجھی الجھی نگاہوں سے دیکھا اور بولا "اب اس استفسار کی کیا ضرورت ہے ؟"

"ہے ؟"

"نہیں"

"بتاؤ نا"

"اگر جواب اثبات میں دونگا بھی تو فائدہ کیا ہے۔"

"یعنی تم سنجیدہ ہو"

"ہاں"

"بس ٹھیک ہے"

"کیا۔"

"میں ماموں جان سے بات کروں۔"

"میرے لئے"

"تو اور اپنے لئے"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو"

سعید الجھن میں تھا۔ ضیا نے اسے الجھاؤ سے نکالنے کے لئے سارہ سے بچپن کی منگنی۔ ممانی کا تنفر۔ اختر سے رشتہ اور پھر سارہ کے انکار کی ساری باتیں اسے مختصراً سنا دیں۔

"ان سب باتوں کے باوجود جب سارہ کو میں نے پہلی دفعہ پچھلے دنوں جب یہ

لاہور آئی تھی دیکھا۔ تو میں نے اسے ناپسند نہیں کیا۔ اور سچ سچ کہدوں سعید۔ اگر اگر شہلا مجھے نہ ملی ہوتی۔ تو سارہ میرا انتخاب ہوتی۔"

"شہلا کون" سعید نے خوش ہو کر جلدی سے کہا۔

"سعید۔ شہلا میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت ہے۔ میں عنقریب اس سے شادی کر رہا ہوں۔ فی الحال تمہیں صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔ ہاں تو میں ماموں جان سے تمہارے متعلق بات کروں ؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ"

"ٹھیک ہے"

"یہ میری خوش نصیبی ہوگی"

"اللہ مبارک کرے"

"آمین"

"دونوں ہنس پڑے"

"باہر سے ہارن بجا اور پھر مسلسل بجنے لگا۔"

"چلو بھئی۔ کب سے انکل کھڑے ہیں۔"

"چلو"

دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر آگئے۔ ناصر اور سارہ گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ آصفہ قریب کھڑی باتیں کر رہی تھی۔

خدا حافظ کے الفاظ کا تبادلہ ہوا۔ ضیا گاڑی کی طرف بڑھا۔ ناصر نے سارہ کو اپنے قریب کرتے ہوئے پرلی طرف کا دروازہ ضیا کے لئے کھول دیا۔

ضیا بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے وہ کھڑکی پہ جھک گیا۔

گاڑی آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

ناصر اور سارہ دونوں بہت خوش تھے۔ ناصر تو یوں لگ رہا تھا، جیسے اپنے وجود میں ضیا کو پاکر نئی تقویت پا رہا ہے۔ ضیا نے باتوں باتوں میں اپنا عندیہ بھی تو ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اس کے کاروبار کا بار اٹھانے کے لئے تیار ہے۔ اس کا ذہن تیزی سے بزنس کے نئے نئے پلان بنانے لگا۔

سارہ کو ضیا اچھا لگتا تھا۔ اچھا لگنا تو صرف جنسی اعتبار ہی سے تو نہیں ہوتا۔ اُسے یہ خوبصورت ہنس مکھ نوجوان اچھا لگا تھا۔ بس اچھا لگا تھا۔ لاہور جا کر اس کی شخصیت کا جو غلط ملط تاثر لیا تھا۔ ضیا کا روپ ہی اب بدلا ہوا تھا۔ بات بات پر بے تکلفی اور خوشدلی سے ہنسنے ہنسانے والا ضیا اس نے لاہور میں تو نہیں دیکھا تھا۔

ہنسی تو ضیا کے وجود کے اندر سے پھوٹ رہی تھی اور خوشیوں کا پرتو اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ اس ہنسی اور خوشی کا منبع ناصر اور سارہ کی نظروں سے بے شک مستور تھا لیکن انہیں اس کی کھوج تھی نہ تلاش۔ جب ظاہر ہی مطمئن کر دے خوشیوں کا ضامن بن جائے تو باطن میں جھانکنے کی ضرورت ہی کون محسوس کرتا ہے۔

ناصر گاڑی چلا رہا تھا۔ ضیا باتیں کر رہا تھا۔ کبھی ناصر سے کبھی دونوں سے اور کبھی سرگوشی کے انداز میں سارہ سے۔ سارہ اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑتی۔ تو ناصر کے لبوں پر آپوں آپ مسکراہٹ آجاتی۔

گاڑی راستہ طے کر رہی تھی۔

اور

مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔

رابعہ اور شانو کو بھی ساتھ ہی لے آتے۔" ناصر نے باتوں کے دوران کہا۔

آپ بلاتے تو لے بھی آتا۔ میں تو خود بھی بن بلائے کا مہمان بن کر آپکے ساتھ جا رہا ہوں" ضیا شوخی سے بولا۔

"شریر کہیں کے" ناصر نے پیار سے کہا۔

"پاپا یہ نواب صاحب۔ بڑی آن والے ہیں" سارہ ہنسی

"کیوں نہیں۔" ضیا مسکرایا "ممانی جان سے ملنے انھیں دیکھنے کی خواہش تھی۔ ورنہ میں نے آپ کے ساتھ آنا تھوڑا ہی تھا۔"

اچھا بھئی مان لیتے ہیں ممانی کی خاطر ہی سہی" ناصر بولا۔

"پپا" سارہ بولی۔

"ہوں"

"زوبی آپا ڈاکٹر کے پاس گئیں تھیں"

"پتہ نہیں۔ میں تو گھر پھر گیا ہی نہیں"

"کیوں" ضیا درمیان میں بولا "بیمار ہیں ممانی"

کئی دنوں سے طبیعت خراب ہے" سارہ نے کہا "میں تو آج کہہ کر آئی تھی ضرور ڈاکٹر کے پاس جائیں"

اتنی ہمدردی تھی۔ تو ساتھ لے کر جاتیں۔" ضیا نے شوخی سے سارہ کے کان میں سرگوشی کی "لگتا ہے آپ کو ان کا کوئی خیال نہیں"

"جانے دیں جناب" سارہ اس بات کاٹ کر مسکرائی "ہمارے ہاں یہ بات نہیں

آپ چل کر دیکھیں گے تو پتہ چلے گا۔ ہمارے زوبی آپا سے تعلقات کتنے دوستانہ ہیں۔"

کہا تو سارہ نے آہستگی سے تھا۔ لیکن ناصر بھی سن رہا تھا۔ سنجیدگی سے بولا" ہاں ضیا بیٹے اپنے ہاں ایسی کوئی بات نہیں"

ضیا زچ سا ہو گیا۔ خفت سے مسکراتے ہوئے بولا" ماموں جان میں تو یونہی سارہ کو چھیڑ رہا تھا۔"

" زوبی آپا بہت اچھی ہیں۔" سارہ نے کہا

چل کر دیکھ لیتے ہیں۔" ضیا پھر آہستہ سے شوخی بھری آواز میں بولا" کیا اچھائی ہے ان میں۔"

" ایک دو نہیں۔ بیشمار ہیں۔"

" پھر تو ان اچھائیوں کو پرکھنے کے لئے کافی دن چاہییں۔"

" تو اور کیا۔ ہم ابھی تمہیں جانے تھوڑا ہی دیں گے۔" سارہ کی جگہ ناصر بولا۔

تو ضیا باہر دیکھتے ہوئے بے آواز سی آواز میں بولا" توبہ۔ ماموں جان کے کان کتنے پتلے ہیں۔ پرائیویٹ بات کرنے ہی نہیں دیتے۔"

"توبہ" سارہ منہ پہ دونوں ہاتھ رکھ کر ہنستے ہنستے آگے کو جھک گئی۔

" کیا کہا" کیا کہا؟" ناصر مسکراتے ہوئے گردن موڑ کر دونوں کو دیکھنے لگا۔

" پپا۔" سارہ ہنس رہی تھی۔

میں کہہ رہا تھا ماموں جان۔ ممانی صاحبہ کو سلامی کتنی دینا ہوگی۔ ضیا نے ہنستے ہوئے بات بتائی۔

ناصر مسکرانے لگا۔

" اوہ۔ اوہو۔" ضیا کو ایکدم کچھ یاد آگیا۔"

" کیا ہوا۔" سارہ نے پوچھا۔"

" امی نے آپ لوگوں کے لئے کچھ چیزیں بھیجی تھیں۔ وہ سعید کے ہاں ہی رہ گئیں۔"

" کوئی بات نہیں کل آجائیں گی۔"

" ممانی جان کو ابھی دیتا تو اچھی بات تھی۔" وہ بولا اور پھر سارہ کی طرف شوخی سے دیکھتے ہوئے بولا" سلامی کی بچت ہو جاتی۔"

چلیئے معاف کیا۔ بغیر سلامی ہی کے دکھا دیں گے اپنی زوبی آپا۔" سارہ بولی۔

" پیسے چاہییں تو مجھ سے لے لو۔" ناصر بھی ان کے ہنسی مذاق میں شریک ہوتے ہوئے بولا

" اب ایسے ہی گئے گذرے ہم بھی نہیں ماموں جان۔ امی نے کچھ دن کا خرچہ دے ہی دیا تھا۔" ضیا نے کچھ دن پہ زور دے کر کہا۔ سارہ اور ناصر ہنسنے لگے۔

گاڑی گنجان آباد بازاروں سے ہوتی ہوئی اب شاہراہ پہ آگئی تھی۔

" ابھی کتنی دور جانا ہے" ضیا نے پوچھا۔

" پانچ منٹ اور لگیں گے" ناصر نے گھڑی دیکھی۔

" توبہ ہے۔ راستہ ختم ہونے میں آہی نہیں رہا۔" وہ بولا۔

" بہت بے تابی ہے گھر پہنچنے کی" سارہ نے شوخی سے کہا۔" نئی ممانی کو دیکھنے کی" وہ ہولے سے مسکرائی۔

" بے تابی ضرور ہے" ضیا اسی انداز میں بولا" لیکن زیادہ ممانی کو دیکھنے کی نہیں۔"

" تو اور۔" سارہ ہنسی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔

" سگریٹ پینے کی" ضیا نے کہا۔

" حد ہو گئی۔" سارہ نے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ اور پھر بولی" پپا سے اجازت لے دوں"

" نہ۔ نہ۔ نہ" ضیا نے بڑے مضحکہ خیز طریق سے کہا۔ سارہ مسکرانے لگی۔

باتوں باتوں میں راستہ کٹا۔ اور گاڑی ایک جدید طرز کی خوبصورت کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو گئی۔

لو بھئی آگیا ہمارا گھر" ناصر نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

ضیا باہر نکلا۔ سارہ بھی اتری۔ ناصر ابھی باہر نکلنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ ملازم نے کوئی ضروری پیغام دیا۔ کاروبار کی کوئی اہم بات تھی۔ ناصر کو اسی لمحے واپس دفتر جانا پڑا۔

میں جلدی آجاؤں گا" اس نے سارہ اور ضیا سے کہا۔

پپا۔ ایسا ہی ہے جانا" سارہ بولی۔

بہت۔ کہتے ہوئے ناصر نے گاڑی پیچھے کی۔

سارہ نے سر خوبصورتی سے اِدھر اُدھر ہلایا" چلیئے صاحب" وہ ضیا سے بولی۔

ضیا نے ایک طائرانہ نگاہ بیرونی ماحول پر ڈالی۔ خوبصورت چمنوں اور ماربل کے فرشوں میں گھری ماموں کی کوٹھی بڑی دیدہ زیب تھی۔

" بڑے ٹھاٹھ ہیں آپ لوگوں کے" ضیا نے ہنس کر کہا۔"

"نوازش نوازش" سارہ شوخی سے بولی۔

پھر ضیا کو لے کر ڈرائینگ روم میں آگئی۔

کوٹھی ہی کی طرح ڈرائینگ روم میں آرائش وزیبائش کے لحاظ سے جدید ترین تھا نایاب ونادر چیزیں تھیں۔ جو حسن ذوق کا پتہ دیتی تھیں۔ رنگوں کا انتخاب لاجواب تھا۔ کمرے اور چیزوں کی مناسبت بھی خوب تھی۔

" بیٹھیے" سارہ نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ضیا بیٹھتے ہوئے کمرے کو قابل ستائش نظروں سے دیکھنے لگا۔ سعید کے ڈرائینگ روم سے وہ مرعوب ہوا تھا۔ لیکن یہاں جو نفاست اور ذوق لطیف تھا۔ وہاں محسوس نہ ہوا تھا

بہت عمدہ ٹیسٹ ہے آپ لوگوں کا" ضیا نے گردوپیش دیکھتے ہوئے سارہ سے کہا

" شکریہ" سارہ مسکرائی۔" جن کا یہ ٹیسٹ ہے۔ وہ خود اس سے بھی عمدہ ہیں۔"

" یعنی"

" زوبی آپا"

" ہماری ممانی جان"

" بالکل"

" تو بلایئے نا انہیں"

" پھر ضیا مسکراتے ہوئے بولا" شوق بے تاب ہوا جاتا ہے۔"

" سارہ مسکراتے ہوئے پردہ ہٹا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ضیا نے جیب سے سگریٹ لائٹر نکالا اور ہمہ انتظار بنا سگریٹ پینے لگا۔

قدموں کی آواز پر وہ ایک دم سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شوق و تجسس سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

" سارہ اندر آگئی"

آپ اٹھ کیوں گئے۔ بیٹھیے" سارہ برابر کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی"

"ممانی؟"

" ابھی آتی ہیں"

" بتا دیا" ضیا نے اپنی انگلی سینے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

" جی ہاں۔ بتا دیا۔ بس آتی ہی ہیں۔ دراصل ان کی طبیعت کچھ خراب ہے بستر میں لیٹی تھیں۔

" اوہو۔ ایسی بات تھی۔ تو ہم ہی ادھر چلے جاتے۔ انھیں خواہ مخواہ بے آرام کیا" نہیں کچھ ایسی زیادہ بھی خراب نہیں۔ آپ سے ملنے کا انھیں بھی اشتیاق ہے۔ بس آتی ہیں۔"

ضیا نے ایش ٹرے سے سگریٹ اٹھاتے ہوئے سارہ سے پوچھا" اجازت ہے"

ضرور ہے، ضرور۔"

وہ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کن انکھیوں سے سارہ کو دیکھنے لگا۔ واقعی اگر شہلا اسے نہ ملتی تو یہ لڑکی اس کے لئے کھلا چیلنج تھی۔ لیکن اب وہ اسے اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں سعید کا خیال تھا۔ خوش بھی تھا۔ کہ سعید کے کام آکر اس کے بیشمار احسانوں کا کچھ نہ کچھ مداوا کر سکے گا۔

"سارہ" برابر کے کمرے سے آواز آئی۔

"آجائیں زوبی آپا" سارہ خوش دلی سے مسکرائی۔

ضیا پاس ادب کے خیال سے سگریٹ فوراً پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سارہ کو دیکھ دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔ جیب پر ہاتھ رکھ کر نفی کا اشارہ کیا۔ تو سارہ ہنس پڑی۔

پردہ ہٹا

اور

زوبی آپا ؟

زوبی ؟؟

زوبی ؟؟؟

ضیا کو یوں لگا جیسے آناً فاناً زمین و آسمان مخالف سمتوں میں گھوم گئے ہوں۔ اسکی آنکھیں پھٹ گئیں۔ منہ کھل گیا اور سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

خدایا وقت اتنا بیرحم تو کبھی نہ ہو سکتا تھا۔

"شہلا" ضیا کے حلق میں چیخ پھٹ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں دانت گاڑ دیے۔ اس کا سارا وجود کانپنے لگا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

زوبی آپا۔ زوبی آپا" سارہ نے ضیا کی حالت دیکھی یا نہیں۔ وہ لہراتی ہوئی زوبی آپا

کی طرف لپکی۔

نازک اندام سی لڑکی بیہوش ہوتی زوبی آپا کا بار نہ سنبھال سکی۔ زوبی کو بمشکل صوفے تک لاتے لاتے ان کے ساتھ ہی قالین پر گر گئی۔

"زوبی آپا۔ زوبی آپا" سارہ بوکھلا بوکھلا کر زوبی آپا کا چہرہ تھام کر پکار رہی تھی۔

ہائے اللہ انھیں کیا ہو گیا" وہ روہانسی ہو کر پھر زوبی آپا پر جھک گئی۔

سارہ کو کوئی سوجھ بوجھ نہ رہا تھا۔ وہ اس قدر گھبرا گئی۔ کہ ضیا کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا۔

زوبی آپا بیہوش تھیں۔ چہرہ بالکل سپید تھا اور ہونٹ لپ اسٹک کے باوجود نیلے پڑتے دکھائی دے رہے تھے۔

ہائے اللہ میں کیا کروں۔" سارہ نے چیخ کر روہانسی آواز میں ملازموں کو پکارا۔

خانساماں بیرا ۔ جمعدارنی کی بڑی بیٹی مالی کی بیوی اور کئی دوسرے سارہ کی چیخ نما آوازوں پہ لپک کر آئے۔

"بیگم صاحبہ"

"بیگم صاحبہ"

"کیا ہو گیا"

"کیا ہوا"

سب کی باتیں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔ سارہ زوبی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے بیقراری سے انھیں پکار پکار کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈاکٹر کو بلائیں چھوٹی بی بی" کسی خیر خواہ نے کہا۔

سارہ لپک کر فون کرنے لگی۔

سارہ کے جانے کے بعد ملازمہ اور مالی کی بیوی نے زوبی کو ان کی خوابگاہ میں لیجانے

کا مشورہ دیا۔

سب نے مل کر زوبی کو اٹھایا اور کمرے سے لے گئے۔

ضیا پھٹی پھٹی نظروں سے صرف تکتا رہا۔ اس کا سانس رک رک گیا تھا۔ سارا وجود پتھرا گیا تھا۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ کچھ سوچ سکتا نہ سمجھ پا رہا تھا۔

یہ سب خواب تھا یا حقیقت۔ اس کا ماؤف ذہن اس بات کا تعین بھی نہ کر سکتا تھا

سارہ گھبرائی گھبرائی اندر آئی۔ پپا سے رابطہ ہو سکا تھا۔ نہ ڈاکٹر ہی کے ہاں سے کوئی فون اٹھا رہا تھا۔ جمعدارنی نے اسے بتایا۔ کہ بیگم صاحبہ کو خوابگاہ میں لے جایا جا چکا ہے

"ضیا۔ معاف کرنا۔ آپ کو خواہ مخواہ اتنی پریشانی دیکھنا پڑی۔ ہائے اللہ میں کیا کروں۔ ڈاکٹر بھی نہیں ملا۔ اور پپا بھی جانے کہاں چلے گئے۔" وہ ضیا کی طرف سے کسی جواب کی توقع کئے بغیر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

اس کے پیچھے پیچھے ہاتھ ملتے جمعدارنی بھی نکل گئی۔

زوبی آپا ہوش میں آ گئیں۔ تو سارہ کی جان میں جان آئی۔ جلدی سے گرم گرم دودھ کی پیالی ان کے ہونٹوں سے لگا دی۔ پندرہ بیس منٹ میں اس نے دودھ چائے پانی گلوکوز اور اللہ جانے کیا کیا زوبی آپا کے کمرے میں اکٹھا کر لیا تھا۔

زوبی آپا کا جیسے کسی نے سارا خون ہی نچوڑ لیا تھا۔ کفنائی ہوئی لاش لگ رہی تھیں سانس بھی جیسے بمشکل لے پاتی تھیں۔ ہاتھ پاؤں برف کے تودے تھے۔ پیشانی جلنے لگی تھی۔

"کیا ہوا تھا زوبی آپا"

"چکر آ گیا تھا"

"دل کو کچھ ہوا تھا؟"

"پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا"

"اب تو ٹھیک ہیں نا"

"ڈاکٹر ملا ہی نہیں۔ پپا بھی جانے کہاں گئے ہیں۔"

سارہ رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر زوبی آپا سے کہہ رہی تھی۔ زوبی آپا چپ پڑی تھیں صرف آنکھیں کھلی تھیں۔

آنکھیں!

جن میں سارے جہاں کی محرومیاں تھیں۔ دکھ تھے۔ مایوسیاں تھیں۔ خشک اور کرب سے پھٹی آنکھوں میں نمی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"آپ کی طبیعت ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی۔ میں خود جاتی ہوں۔ کوئی نہ کوئی ڈاکٹر مل ہی جائے گا۔"

زوبی نے کراہتی ہوئی سانس لی۔ رُخ موڑا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں "مجھے صرف آرام۔ کی ضرورت ہے۔"

"پھر بھی زوبی آپا۔ کوئی ٹانک ہی لیں۔ آپ تو برسوں کی بیمار لگنے لگی ہیں۔ میں چند منٹوں میں آجاؤنگی۔"

زوبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ مالی کی بیوی کو خوابگاہ کے باہر بٹھا کر وہ ڈرائینگ روم میں آئی۔

ضیا بھربھری مٹی کے ڈھیر کی طرح صوفے پر پڑا تھا۔ اس کی گردن صوفے کی پشت پر تھی۔ آنکھیں بند تھیں ایک ہاتھ صوفے کے بازو پہ تھا۔ دوسرا گدی پر رکھا تھا

"ضیا" سارہ نے پکارا۔

ضیا نے آنکھیں کھولدیں۔ پھیلی پھیلی درد سے پھٹتی آنکھیں کھولدیں۔

"شکر ہے زوبی آپا کو ہوش آگیا۔ اللہ کتنی پریشانی دیکھی۔ آپ بھی پریشان ہوئے"

ضیا کچھ نہیں بولا۔ اپنے خشک اور بے رنگ ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کرلینا چاہیں۔

"آپ تو کچھ زیادہ ہی پریشان ہوگئے ضیا۔" سارہ مسکرائی "چھ فٹ کے آدمی ہیں اور اتنا چھوٹا دل۔"

وہ پھر بھی کچھ نہیں بولا۔ آگے کو جھکتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا "میں ڈاکٹر کے لئے جارہی ہوں۔ اچھا ہوگا۔ آپ کچھ دیر زوبی آپا کے پاس چل کر بیٹھیں۔ میں دس منٹ میں آئی۔"

سارہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

ضیا کا دم حلق میں اٹک گیا۔

"ماجو" سارہ نے دروازے سے نکلتے ہوئے برآمدے میں جانے والے نوکر کو آواز دی "جی بی بی"

"صاحب کو زوبی آپا کے کمرے میں لے جاؤ۔ میں ڈاکٹر کو لینے جارہی ہوں۔ دس پندرہ منٹ میں آجاؤنگی"

وہ ماجو کا جواب سنے بغیر تیزی سے برآمدہ عبور کرکے سیڑھیاں اتر گئی۔ وہ گیراج کی طرف جارہی تھی۔

ماجو اندر آیا۔

"آیئے صاحب" اس نے مودبانہ ضیا سے کہا۔

ضیا نے ماجو کو بے جان اور خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

"چھوٹی بی بی کا حکم ہے۔ آپ کو بیگم صاحبہ کے کمرے تک پہنچا دوں" ماجو تعظیماً جھکتے ہوئے بولا۔

ضیا تو اٹھنے تک کی ہمت نہ پا رہا تھا۔ قیامت کا سامنا کرنے کی سکت کہاں تھی اس میں۔ وہ کئی لمحے ویسے ہی بیٹھا ماجو کو تکتے گیا۔

"ماجو نے پھر چھوٹی بی بی کا حکم دہرایا"

"کہیں بستر مل سکتا ہے۔ میری طبیعت بہت خراب ہے" ضیا کے لبوں سے مرے مرے لہجے میں حرف اسی قدر نکلا"

"ضرور صاحب۔ تشریف لایئے" ماجو بولا اور پھر پچھلے دروازے کی طرف بڑھا۔

ضیا نے ہاتھ بڑھایا۔ ماجو نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ لڑکھڑاتا ہوا وہ ماجو کے ساتھ ساتھ چلا۔

زوبی کی خوابگاہ کا دروازہ نیم وا تھا۔ شاید جلدی میں سارہ ہی آدھ کھلا چھوڑ گئی تھی

ضیا کی نظر زوبی پہ پڑی۔ دوسرے لمحے سختی سے اس نے سر کو جھٹکا دے کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ماجو نے دروازہ کھولا۔ ضیا لہراتا لڑکھڑاتا بیڈ تک پہنچا۔ اور پھر جوتے اتارنے کا
ہوش بھی نہ رہا۔ ماجو نے ہی اس کے بوٹ اتارے اور کمبل سے سارا جسم اچھی طرح ڈھانپ
دیا۔

رات ضیا کو تیز بخار تھا۔ سارہ بیچاری سخت پریشان تھی۔ ناصر بھی پریشانی ہی
کے عالم میں پنڈی گیا تھا۔ کام کی نوعیت ایسی تھی۔ کہ رکنا مشکل تھا۔

ضیا آگ میں جل رہا تھا۔ بخار کی تپش سے کہیں زیادہ من کی تپش تھی۔ وہ نرم بستر
پر بھی جیسے کانٹوں کی سیج پہ تھا۔ انگاروں پہ لوٹ رہا تھا۔ تقدیر اس سے زیادہ سخت
وار اور نہ کر سکتی تھی۔

زمانہ اس سے گہرا زخم شاید اور نہ لگا سکتا تھا۔ وقت اس سے مہلک مذاق اور نہ
کر سکتا تھا۔

وہ تڑپ رہا تھا۔

تیر کلیجے میں ترازو ہو گیا تھا۔

اس کا دم گھٹ رہا تھا

تنگ۔ تیرہ و تار قفس میں قید پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔

اس کا دل خون خون ہو کر بوند بوند آنکھوں سے ٹپک رہا تھا۔

اور اس کا ضمیر پہلو میں نشتر اتار رہا تھا۔ چبھو رہا تھا۔ کھنگول رہا تھا

"شہلا"

ممانی

زوبی

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یہ چہرہ ہزاروں روپ دھار دھار کر پگھلتی آگ بن رہا
تھا۔ شہلا سے ملاقاتیں اور ان ملاقاتوں کا رنگ۔ ماموں سے محبت اور عقیدت۔

اف خدایا۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس کا دماغ پھٹ جانے کو ہے۔

وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ چین آتا تھا نہ قرار۔ اس کا رواں رواں شہلا
کو پکار رہا تھا۔ اس سے ملنا بھی موت اس سے بچھڑنا بھی موت تھا۔

رات کا ایک بج چکا تھا۔ گھر میں سناٹے چھائے تھے۔ نوکر چاکر جا چکے تھے۔ نیند
سکھ چین کا سندیسہ لے کر آنکھوں میں اتر چکی تھی۔

ضیا بستر میں اٹھ بیٹھا۔ کئی لمحے چکراتے ہوئے سر کو تھامے بیٹھا رہا۔ پھر بوٹ پہنے
چند لمحے کمرے کے وسط میں کھڑا رہا۔

پھر دروازہ کھولا۔

اور

کمرے سے باہر نکل آیا

زوبی کی خوابگاہ کی ہلکی سبز روشنی ذرا سے کھلے دروازے سے کوریڈور میں پڑ رہی تھی
اس نے ایک ثانیے کو کچھ سوچا۔

دوسرے لمحے وہ زوبی کی خوابگاہ کے اندر آہستگی سے داخل ہو رہا تھا۔ بے جان قدموں
سے پتھریلے اور جلتے ہوئے وجود کو لئے وہ دروازے کے قریب ہی رک گیا۔

زوبی سجے سجائے کمرے کے مخملیں بیڈ پہ پڑی تھی۔ یوں جیسے کسی فرعونی مقبرے
میں کوئی حنوط شدہ لاش بڑے اہتمام سے رکھی ہو۔

ضیا اس حنوط شدہ لاش کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے تکنے لگا۔

زوبی سو رہی تھی۔ آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ بند آنکھوں کے باوجود اسے ضیا کی آمد
کا احساس ہو گیا۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"شہلا" ضیا کے کانپتے ہونٹوں سے لرزتی آواز نکلی۔ یہ آواز آنسوؤں سے اندھی تھی
زوبی نے آنکھیں کھول کر ضیا کو دیکھا۔ درد و کرب کا تبادلہ جانگسل تھا۔ زوبی نے
کروٹ بدل کر رخ ضیا کی طرف سے پھیر لیا۔

ضیا کا دل پھٹ جانے کو تھا۔ اس نے ہونٹ کا سرا سختی سے دانتوں تلے دبا

لیا اور اس کی سرخ انگارہ آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔ حلق میں غوطے ٹوٹنے لگے۔

"ضیا۔" زوبی نے کمر موڑے موڑے روتی آواز میں کہا، "جس طرح بے صدا میری زندگی میں آئے تھے۔ اسی طرح۔ ہمیشہ کے لئے۔ چلے جاؤ۔ اس وعدے کے ساتھ۔ جاؤ۔ کہ حالات نے پھر۔ کبھی ہمیں آمنے سامنے لاکھڑا بھی کیا۔ تو تم۔ مجھے پہچاننے سے انکار۔ کر دو گے۔"

"شہلا" ضیا کی آواز پھٹ گئی۔

جاؤ۔ چلے جاؤ۔ سمجھنا۔ ہم نشان راہ تھے۔ جو مٹ گئے۔ زوبی کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

ضیا نے سختی سے اپنا گریبان پکڑ کر ہونٹ دانتوں تلے دبا کر آنکھیں بند کرلیں سینے سے ہوک اٹھی۔

اور

دو موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے لڑھک گئے۔

اس نے آخری نگاہیں زوبی پہ ڈالیں اور پھر اس زندہ مدفن کی طرف سے منہ موڑتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

باہر

رات تیرہ و تاریک تھی۔

ضیا کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔

ہر قدم اسے اپنی محبت کے مدفن سے دور سے جا رہا تھا۔

دور

دور

بہت دور۔

رضیہ بٹ

فرح وزیر آباد